رجسٹرڈ نمبر ل ۳۶۶



قیمت فی کاپی ۸ ر

ملنے کا پتہ منیجر

تصانیف نیاز فتحپوری

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو قبول حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن زبان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بوسیدہ اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز حصہ اول

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں، اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہونے ہیں۔ معہ تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز حصہ دوم

یہ حصہ پہلے حصہ سے زیادہ ضخیم ہے اور اس میں اکثر مکاتیب انتقادی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو حضرات شعر و شاعری سے دلچسپی ہے انھیں ان مکاتیب میں بہت سے عجیب و غریب نکات شعری نظر آئیں گے۔ رنگین تحریر اور اسلوب ادا کی دلکشی کا ذکر فضول ہے کیونکہ حضرت نیاز کی اس خصوصیت سے ہر شخص آگاہ ہے۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخییل اسکی نزاکت بیان، اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں نحاشی کی تمام مظاہر اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخ نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ نحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں۔ نیا اڈیشن قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

مجموعہ استفسار و جواب سہ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۱۹۲۶ء سے لیکر ۱۹۳۹ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر سی انسائیکلوپیڈیا کی ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ علاوہ محصول

کتنی بار کہا جائے

کہ خط و کتابت میں نمبر خریداری درج کیا کیجئے۔ آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کی اس فروگزاشت سے دفتر کو کتنی تکلیف اُٹھانا پڑتی ہے — آپ کا نمبر خریداری ہر مہینے پتہ کی چٹ پر بائیں طرف درج ہوتا ہے۔ اسے کسی جگہ نوٹ کر لیجئے، کیا یہ کوئی بڑا مشکل کام ہے۔

منیجر

چندہ سالانہ پانچ روپیہ
ششماہی تین روپیہ

نگراں : نیاز فتحپوری

ادارہ : مجید نیازی
شوکت جہاں

جلد ۴۶	فہرست مضامین جولائی ۱۹۴۴ء	شمار ۱

ملاحظات

آیندہ جنوری سنہ ۴۵ء کا "نگار"

پچھلی اشاعت میں ظاہر کیا گیا تھا کہ جنوری سنہ ۴۵ء کے نگار کے لئے ایک نہایت اہم موضوع میرے پیش نظر ہے، آپ بھی اسے سن لیجئے:

ہمارے علماء کو عام شکایت ہے کہ اس زمانہ میں الحاد بڑھتا جا رہا ہے اور مذہب کی طرف سے غفلت و بے پروائی روز بروز زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اس وقت تک نہ انھوں نے اس کے اصل اسباب پر غور کیا اور نہ ان اسباب کے دور کرنے کی کوشش کی

موجودہ دہریت کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسوقت تک جو اعتراضات اسلام پر کئے گئے ہیں، ان میں سے اکثر کا جواب نہیں دیا گیا اور چونکہ یہ اعتراضات زیادہ تر ارباب کلیسہ کی طرف سے کئے گئے ہیں، اس لئے مغربی زبانوں کے جاننے والے انکا مطالعہ کرتے رہتے ہیں اور ان سے متاثر ہوکر اسلام کی صداقت کو مشتبہ سمجھنے لگتے ہیں

عرصہ سے میں یہ تمنا اپنے دل میں لئے ہوئے ہوں کہ ملک کے تمام اکابر علماء تک ان اعتراضات کو پہونچا کر اُن سے استدعا کروں کہ وہ ان کے جوابات کی طرف توجہ فرمائیں اور اب اسی خواہش کو عملی صورت دینے کے لئے میں یہ چاہتا ہوں کہ ان اعتراضات کو آیندہ جنوری کے نگار میں پیش کر دوں اور ان کے جو جوابات موصول ہوں انھیں یکجا شایع کر کے بصورت نتیجہ اپنی رائے عرض کر دوں

اگر، علماء کرام نے اس طرف توجہ فرمائی جس کا مجھے یقین ہے تو بڑی حد تک دہریت و الحاد کا سد باب ہو جائے گا اور غالباً یہ سب سے بڑی خدمت اسلام کی ہوگی

میں خطوط بھیجکر اس باب میں علماء اسلام سے استمزاج کرتا ہوں، اگر ان میں سے دو چار بھی جواب دینے کے لئے آمادہ ہو گئے، تو میں اس تجویز کو عملی صورت میں لے آؤں گا۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا، جس کا مجھے بہت افسوس ہوگا، تو میں پھر کچھ اور تجاویز پیش کر کے قارئین نگار سے دریافت کروں گا کہ آیندہ جنوری کے لئے وہ کس تجویز کو پسند فرماتے ہیں۔

لڑائی کا حال روم کا اتحادیوں کے ہاتھ آجانا تو کوئی بڑا کارنامہ نہ تھا، کیونکہ اس کو دشمن نے ایک غیر محفوظ کھلے ہوئے شہر کی حیثیت دیکر، وہاں مقابلہ ہی نہیں کیا، لیکن ساحل فرانس پر نارمنڈی کے علاقہ میں فوجیں اُتار دینا، اس میں شک نہیں اُن کا اتنا زبردست اقدام ہے جس کی کوئی مثال اس وقت تک ان کی طرف سے پیش نہیں ہوئی تھی۔

بلجیم سے لیکر فرانس کے مغربی سواحل تک یوروپ کا وہ حصہ ہے جو بالکل انگلستان کے سامنے واقع ہے اور اسقدر قریب کہ اگر آج رودبار انگلستان خشک ہوجائے تو ایک انسان پیادہ پا بھی یہاں سے وہاں تک بہ آسانی پہونچ سکتا ہے، اس لئے جرمنی کو یقین تھا کہ آیندہ حملہ اسی طرف سے کیا جائے گا، اور اسی لئے اس نے یہاں مدافعت کی بڑی زبردست طیاریاں کی تھیں۔ لیکن آخرکار یہ حملہ ہوکر رہا اور اسی طرف جہاں اسے ہونا چاہئے تھا، کیونکہ اگر اتحادی افواج ایک بار فرانس کی سرزمین سے جرمنی کا قدم اُکھاڑنے میں کامیاب ہوگئیں، تو پھر اسے برلن تک کہیں سر چھپانے کی جگہ نہ ملے گی

یہ حملہ ۶ جون کو ہوا ہے اور آج ۳۰ جون تک اتحادیوں کو وہاں کوئی ایسی کامیابی حاصل نہیں ہوئی، جسے جرمنی کی شکست کا پیش خیمہ سمجھا جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اتحادی افواج کا ساحل فرانس پہ اُترنا اور اس کے ایک حصہ پر قابض ہوکر جاررہنا ہی بجائے خود کم نتیجہ خیز نہیں

اس حملہ کے حالات مختلف اخباروں کے ذریعہ سے قارئین نگار کو معلوم ہو چکے ہوں گے اور ان کے مطالعہ کے بعد یہ اندازہ ہوا ہوگا کہ اتحادی فوجیں کتنا نقصان اُٹھانے اور کن کن دشواریوں کا مقابلہ کرنے کے بعد یہاں اُتری ہیں اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اتحادیوں کا یہ اقدام جنگ کی فیصلہ کن منزل کا آغاز ہے اور بقول مسٹر چرچل اگر اس موسم گرما میں جرمنی کو شکست نہ دیجا سکی تو آیندہ موسم بہار تک یقیناً صورت حال بالکل بدل جائے گی، کیونکہ اس حملہ کے ساتھ ہی، روس کی سُرخ افواج نے بھی رومانیا، فنلینڈ اور ریاستہائے بالٹک کی طرف بڑھنا شروع کردیا ہے اور اس طرح ہٹلر کی فوجوں پر شرق و غرب دونوں طرف سے اتنا سخت دباؤ پڑ رہا ہے کہ وہ عرصہ تک اس کو برداشت نہیں کرسکتا

حیدرآباد کی اُردو کانگرس

ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد اُردو کانگرس کے انعقاد کے لئے بڑی اہم طیاریوں میں مصروف ہے۔ اور خیال کیا جاتا ہے کہ ۲۱، ۲۲ اور ۲۳ جولائی کو حیدرآباد کا یہ علمی و ادبی اجتماع بہت کامیاب ثابت ہوگا ــــ اس کی شرکت کے لئے ہندوستان کے تمام ادبا، شعراء، ارباب صحافت اور ناشرین کو دعوت دی گئی ہے اور معلوم ہوا ہے کہ ان میں سے اکثر کانگرس کی شرکت کے لئے آمادہ ہیں ــــ میں بھی شرکت کا ارادہ رکھتا ہوں اور اگر حالات نامساعد نہ ہوئے تو یہاں سے ۱۸ جولائی کو روانہ ہوکر ۲۰ جولائی کو حیدرآباد پہونچوں گا اور ۲۸ کو واپس آؤں گا۔ ممکن ہے (ضروری نہیں) کہ میری اس غیر حاضری کی وجہ سے اگست کا نگار ہفتہ عشرہ کی تاخیر سے شایع ہو۔

جدید ترکی صحیح روشنی میں

ابھی نہیں، لیکن ایک وقت ایسا ضرور آئے گا، جب ملوکیت پرستی اور امارت پسندانہ جمہوریت کا سب سے بڑا تاریخی جرم یہ قرار پائے گا کہ انقلاب روس اور انقلاب ترکی کے حالات و نتائج کو انھوں نے کبھی صحیح روشنی میں پیش نہیں کیا۔

ان دونوں حکومتوں کے خلاف جذبات نفرت اُبھارنے میں اخلاق، مذہب، سیاست، معاشرت اور معیشت سبھی کو آلۂ کار بنایا گیا، یہاں تک کہ دنیا سمجھنے لگی کہ جدید روس اور جدید ترکی دونوں قدیم وحشت و بربریت کے سوا کچھ نہیں اور دنیا کو یقیناً یہی برابر سمجھایا جاتا اگر خوش قسمتی سے یہ لڑائی نہ چھڑ جاتی اور فاسستی حکومتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے جمہوری حکومتوں کو بعض سیاسی مصالح سے دست بردار نہ ہونا پڑتا۔

روس اور روس کی اشتراکیت، اس وقت ہمارا موضوع بحث نہیں، اس لئے ہم اس کے متعلق کوئی تفصیل پیش کرنا نہیں چاہتے، لیکن جدید ترکی کے بابت جن غلط بیانیوں سے کام لیا گیا ہے، ان پر روشنی ڈالنے کے لئے ہم ایک ایسی ہستی کا بیان پیش کرنا چاہتے ہیں، جس سے زیادہ معتبر شہادت وہاں کے حالات کے متعلق کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ یہ ہستی وہاں کی ایک خاتون "فاطمہ رقیہ چلپی" کی ہے جنھوں نے موجودہ ترکی پر ایک کتاب "Glimpses into modern Turkey" لکھ کر بہت سی تاریکیوں کو دور کر دیا ہے۔ یہ خاتون اس کتاب کے دیباچہ میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

جب میں پہلے پہل ساحل ہندوستان پر آئی، تو مجھ سے ترکی کی بابت مختلف قسم کے سوالات کئے گئے، مثلاً "کیا ترکی میں سنیما گھر ہیں" "کیا ترک روٹی کھاتے ہیں" اور "کیا ترکی عورتیں نماز پڑھتی اور تلاوت قرآن کرتی ہیں" "کیا ترکی نے اسلام کو اپنے ملک سے نکال دیا ہے" "کیا ترک سب بے دین ہیں" "کیا مصطفےٰ کمال نے غصے میں اپنے بعض ماتحتوں کے منھ پر کلام پاک پھینک مارا" اور "کیا واقعی مصطفےٰ کمال نے اعلان کیا کہ اسلام ایک بدکردار عرب کی شریعت ہے" وغیرہ وغیرہ۔

ان میں سے کچھ باتیں آرام استرانگ کی کتاب "گرے وولف" سے لی گئی ہیں جو مصطفےٰ کمال کی سوانح عمری ہے لیکن اس کتاب کی لغویت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب جنوری ۱۹۳۳ء میں یہ کتاب انگریزی و فرانسیسی زبانوں میں شایع ہوئی تو اس کا داخلہ خود مصطفےٰ کمال نے ترکی میں بند کر دیا۔"

محترم خاتون نے اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ دراصل یہ تمام خیالات دنیا میں پھیلائے گئے ہیں، ان کا مقصود صرف یہ تھا کہ ترکی کو اسلامی برادری سے خارج کر دیا جائے اور اسے جامعۃ المسلمین کی ہمدردیوں سے محروم کر دیا جائے ورنہ حقیقت بالکل اس کے خلاف ہے۔

قدیم ترکی

دیباچہ کے بعد فاضل خاتون نے موضوع کو مختلف ابواب میں تقسیم کرکے علٰحدہ علٰحدہ گفتگو کی ہے، چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے قدیم ترکی کے حالات پر روشنی ڈالی ہے تاکہ جدید ترکی کا پس منظر سامنے آجائے، ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے:

سلاطین یا خلفاء ترکی کے زمانہ میں حالت یہ تھی کہ تمام ملک غربت و افلاس کا شکار تھا، کاشتکار جو تھوڑا بہت غلہ پیدا کرتے تھے وہ ان کی زندگی کے لئے بھی مشکل سے کافی ہو سکتا تھا۔ ریلیں یا دیگر وسائل آمد و رفت مفقود تھے، خلفاء صرف اپنی عیسائی رعایا کو تجارت کی ہر شاخ میں تحفظ و آرام پہونچانے میں مشغول رہتے تھے اور وہاں کوئی چیز ایسی نہ تھی جسے مسلمان ترک اپنا کہہ کر پکار سکتے۔

ملّائیت ایک خطرناک اور نہایت زبوں کھیل کھیل رہی تھی۔ مذہب میں اندھی تقلید ہر طرف قیامت بپا کئے ہوئے تھی اور ملاؤں نے اسلام کو کھلونا بنا لیا تھا۔ ان کی جاہلانہ مذہبیت اور اس کی سخت گرفت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہاں جانوروں کی قربانی صرف ملاؤں کی پڑھی ہوئی چھُری ہی سے ہو سکتی تھی اور اس دعا کے پڑھنے کی قیمت حسب حیثیت مختلف ہوتی تھی لیکن یہ دو ترکی پونڈ سے کسی حالت میں کم نہ ہوتی تھی اور وہ بھی صرف ایک سال کے لئے تاکہ آئندہ سال پھر کم از کم دو پونڈ انھیں مل سکیں۔ گنڈے تعویذوں کا بھی بڑا زور تھا اور پیر پرستی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ خدا کا خیال بھی لوگوں کے دلوں بس نہ آتا تھا۔ عورت کی حالت یہ تھی کہ وہ محض مال منقولہ سمجھی جاتی تھی اور صرف مرد کے جنسی جذبات پورا کرنے کی چیز ـــ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قحبگی عام ہوگئی تھی۔ بردہ فروشی بھی جاری تھی اور غلاموں سے نہایت بیرحمانہ سلوک کیا جاتا تھا۔

عیش پرست سلاطین نے کبھی اسبات کی کوشش نہیں کی کہ ترک مسلمانوں کی آسانی کے لئے وسایل آمد و رفت پیدا کریں۔ ان لوگوں پر ٹیکس لگائے جاتے تھے مگر صرف اس لئے کہ امراء عیش کریں۔

زمینیں اندھا دھند غیر ملکیوں کے ہاتھ فروخت کی جاتی تھیں جو دولت جمع کرنے کے لئے کثیر تعداد میں استنبول آتے رہتے تھے، الغرض کہ ترکی واقعی "یورپ کا مرد بیمار" تھا اور اس بیماری کا دور کرنے والا کوئی نہ تھا، یہاں تک کہ آخر کار قدرت کے احساس میں جنبش پیدا ہوئی اور سالونیکا میں وہ انسان پیدا ہوا جس نے جدید ترکی کی بنا ڈالی۔

مذہبی اصلاحات

دوسرے باب میں مصطفٰے کمال کی مذہبی اصلاحات کا ذکر کرتے ہوئے فاضل خاتون لکھتی ہیں کہ: جوں ہی جمہوریت کے قدم جم گئے انھوں نے قرآن پاک کا ترکی زبان میں نہایت صحت کے ساتھ ترجمہ کرانے کا کام اپنے ذمے لیا۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے اسلامی دنیا کے مختلف حصوں سے علماء دین کو بلایا جنھوں نے تین سال کی محنت کے بعد اس ترجمہ کو شایع کیا۔ لیکن یہ ترجمہ اس طرح سے چھاپا گیا ہے کہ بائیں طرف اصلی عربی متن ہے اور داہنی طرف ترکی ترجمہ اور تفاسیر۔ اسی کے ساتھ اسکولوں میں عربی کی تعلیم لازمی کر دی گئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے طول و عرض میں ہر باشندہ کلام اللہ پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہو گیا۔

چونکہ اس طریق تعلیم سے ملاؤں کے کاروبار کو بہت نقصان پہونچا، اس لئے انھوں نے بہت واویلا مچایا اور اس کو بدعت قرار دیکر جمہوریت ترکی کو کافروں کی حکومت ظاہر کرنا شروع کیا۔ ان ملاؤں کا اثر دور کرنے کے لئے جمہوریہ نے مساجد کے اماموں اور موذنوں کے لئے بھی مدارس قایم کئے، چنانچہ اب ان کا تقرر بھی حکومت ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ کلام مجید

کو عام کرنے کے لئے ترجمۂ قرآن کی قیمت صرف دو پیسے رکھی گئی، اور ملاؤں کے ترجمے ضبط کر لئے گئے۔

ملاؤں نے یہ افواہ بھی اڑائی کہ ترکی کی مسجدیں یا تو ڈھا دی گئیں یا سینماؤں، قمارخانوں اور ناچ گھروں میں تبدیل کر دی گئیں، لیکن کیا ترکی، جس کے مدرسوں میں بچوں کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ صفحۂ ارض پر سوائے معبودِ مطلق کے اور کوئی نہیں جس کا خوف کیا جا سکے، یہ کام کر سکتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مسجد ایا صوفیا کو ضرور عجائب خانہ بنایا گیا۔ لیکن اس کا خاص سبب تھا۔ یہ مسجد جس میں قدیم پچی کاری کا نہایت نفیس کام ہے۔ ترکی میں سب سے پرانی عمارت ہے جو پہلے عیسائی گرجا تھا جب چودھویں صدی میں ترکوں نے اسے فتح کیا تو انھوں نے دیواروں پر پلاسٹر کرا کے اسے مسجد میں تبدیل کر دیا۔ بعد کو ڈائرکٹر عجائب خانہ جات نے ترکی کی ہدایات کے زیر اہتمام کئی لاکھ ترکی پونڈ صرف کر کے اس مسجد کی مرمت کی اور تمام مسلمانوں کی متحدہ رائے سے اس کو عجائب خانہ میں تبدیل کیا گیا تاکہ پچی کاری کی وہ نقاشیاں جو تمام دنیا کے لئے باعث حیرت ہیں مٹنے نہ پائیں۔

اگر آپ ترکی کی مسجدوں میں داخل ہوں گے تو آپ کو چند نمایاں تبدیلیاں نظر آئیں گی۔ مثلاً آپ کو صفوں کے درمیان ایک فٹ اونچی لکڑی کی آڑ ملے گی۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جب لوگ سجدے میں جائیں تو ان کا سر سامنے والے نمازی کے پاؤں سے نہ لگے۔ آج ترکی مساجد میں جوتے کھونے کا کسی کو اندیشہ نہیں۔ دروازہ پر ان کی ہر چیز کی حفاظت کا قابلِ اطمینان انتظام ہے۔ نماز پڑھنے کے لئے اونی ٹوپیوں کا بھی انتظام رہتا ہے اور عورتیں بھی روزانہ مسجد میں جاتی ہیں جن کے لئے علٰحدہ جگہ مقرر ہے بلکہ مسجد کا دروازہ بھی ان کے لئے دوسرا ہوتا ہے۔ ترکی میں مسجدوں کی مجموعی تعداد چودہ ہزار چار سو اڑسٹھ ہے۔

مزاروں کے دروازے بیشک جمہوریت نے بند کر دئے ہیں تاکہ قبر پرستی ختم کر دی جائے اور قوم جسے صرف خدا پر بھروسہ کرنا سکھایا گیا تھا کسی اور قوت کو خدا نہ سمجھنے لگے۔

خلافت کے متعلق یہ عام افواہ ہے کہ اتاترک نے خلیفہ اور خلافت دونوں کو ترکی سے نکال دیا، یہ ایک حد تک صحیح ہے لیکن ایسا کیوں کیا گیا۔ اس کا حال کم لوگوں کو معلوم ہے۔ سلطان وحید الدین کو بیشک ترکی سے نکالا گیا، لیکن ان کے بعد خلافت کا منصب عبد المجید کو اس شرط پر دیا گیا کہ وہ معاملات سلطنت سے کوئی سروکار نہ رکھیں، مگر عبد المجید اور ان کے ساتھیوں نے جمہوریت کے خلاف سازش شروع کر دی اور مجبوراً عبد المجید کو بھی نکالنا پڑا، لیکن خلافت کے قیام کا خیال بدستور باقی رکھا گیا، چنانچہ عبد المجید کے اخراج کے متعلق جو حکم دیا گیا اس کے الفاظ یہ تھے کہ "خلیفہ کو جلا وطن کیا جائے اور خلافت انتخاب سے ہو لیکن افسوس ہے کہ آج تک کوئی انتخاب نہیں ہوا اور نہ مسلمانوں نے اس کی کوشش کی"۔

خلفاء کے دورِ حکومت میں جو محافظ دین سمجھے جاتے تھے، عیسائی مشنریوں کو ایسی ایسی مراعات میسر تھیں جن سے اسلام کے بہترین مفاد کو نقصان پہونچتا تھا۔ اور اس لئے جب ان مشنریوں کو ان مراعات سے محروم کر دیا گیا تو انھوں نے جمہوریت ترکی کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ اس سے قبل ترکوں کے بچے اکثر مشنری کے اسکولوں میں تعلیم پاتے تھے، لیکن ۱۹۳۱ء میں حکومت نے تمام ترکی بچوں کی تعلیم ترکی مدرسوں میں لازم قرار دی اور نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے اسکول جو مشنوں سے متعلق تھے بند ہو گئے۔ غیر اسلامی ادب کے شایع کرنے پر بھی پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ پادریوں اور راہبوں کو عام طور سے راستوں پر اپنے مذہبی لباس پہن کر نکلنے کی ممانعت کر دی گئی اور مسیح و مریم کی تصویریں آویزاں کرنے کی بھی ممانعت کر دی گئی۔

جماعتی اصلاحات

مشرق و مغرب دونوں نے اس بات پر تعجب کیا ہے کہ اتاترک کس طرح جاہل ترکوں کو ایسا میں ایسا فوری انقلاب پیدا کر سکا، لیکن اس کا راز صرف یہ ہے کہ اسلام نے ترکوں کو اولوالامر کی اطاعت کرنا سکھایا تھا اور چونکہ انھوں نے یہ جان لیا تھا کہ غازی نے انھیں میدان جنگ میں سرخرو رکھا لہذا ان کی اصلاحات کو خلوص دل سے قبول کرنے میں کوئی پس و پیش نہ کرنا چاہئے، لیڈر کی پیروی کرنا ترکی اسلامی اسپرٹ تھی۔

اب میں ان اصلاحات کا ذکر کرتی ہوں جو ترکی میں طوفان کی طرح رونما ہوئے اور جنھوں نے دنیا میں ایک سنسنی سی پھیلادی۔ شریعت کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ دین ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور دوسرا مذہب جو وقت، موقعہ اور حالات کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے۔

ترکوں کی جماعتی زندگی میں پہلی تبدیلی عورتوں کے حالات میں ہوئی ہیں پہلے بتا چکی ہوں کہ ترکی میں عورت محض ایک مال منقولہ کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن آج اس کو وہی حقوق حاصل ہیں جو مرد کو۔ اب اسے ذہنی حیثیت سے مرد کے برابر سمجھا جاتا ہے اور ہر میدان عمل اس کے لئے کھلا ہوا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ ترکی آج زنانہ ججوں، زنانہ ڈاکٹروں، دندان سازوں، ہوا بازوں، وکیلوں اور بیرسٹروں پر فخر کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اس وقت عورتوں کی ایک مستقل فوج بھی انقرہ میں پائی جاتی ہے۔ مگر اس سے کسی کو یہ تصور نہ کر لینا چاہئے کہ عورتوں نے ان خدمات کی وجہ سے اپنے گھروں اور شوہروں کو نظر انداز کر دیا ہے، ہرگز نہیں۔ وہ پوری گھروالی ہے اور پہلے سے بہتر امور خانہ داری انجام دیتی ہے۔

شادی کے باب میں ترکی کی عورت اس قدر محفوظ ہے کہ دنیا کی تمام عورتوں کو اُن پر رشک کرنا چاہئے۔ گو ترکی میں طلاق مل سکتی ہے مگر اندراجات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ صورتیں جن میں مرد یا عورت ایک دوسرے کو طلاق دے سکتے ہیں آسان نہیں۔ اسلام بعض صورتوں میں عورت کو بھی شوہر سے طلاق حاصل کرنے کی اجازت دیتا ہے اور آج ترکی میں ہر عورت کو یہ حق حاصل ہے۔ سلاطین کے زمانہ میں عورت کا مرد سے طلاق حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔ خواہ اس کے کچھ ہی اسباب کیوں نہ ہوں اور اس عمل نے ان کی حالت بہت خراب کر دی تھی لیکن اب جمہوریت نے اس کو مردوں کی برابر اُجرت کا مستحق بنا کر ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے۔ چنانچہ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد کی طرح عورت کو بھی روزانہ سوا دو روپیہ اُجرت ملتی ہے۔

مسلمان کو ایک سے زیادہ شادی کرنے کی اجازت ہے مگر اس اجازت کے ساتھ ایسی پابندیاں ہیں کہ وہ حقیقت میں ممانعت بن جاتی ہے۔ لیکن اب سے قبل ترکی میں اس اجازت کا استعمال بالکل ناجائز طور پر ہوتا تھا اور کسی معمولی آدمی کی وفات کا مطلب تین عورتوں کو باہر سڑک پر نکال دینا ہوتا تھا، جن کے مستقبل کا کوئی انتظام نہ ہوتا تھا۔ اتاترک نے دیکھا کہ جب تک اس اجازت کو بند نہ کیا جائے گا، ترکی عورت کی حالت نہیں سنبھل سکتی، اس لئے اس نے ایک سے زیادہ شادی کرنا بند کر دیا۔ اسی کے ساتھ عورتوں کی آسانی کے لئے اور بھی قوانین نافذ کئے، مثلاً کوئی شخص اس وقت تک شادی نہیں کر سکتا جب تک ڈاکٹری سارٹیفکٹ اپنی صحت و تندرستی کا نہ پیش کرے۔ اسی طرح عورت کے لئے بھی طبی سارٹیفکٹ حاصل کرنا ضروری قرار دیا گیا۔

ہر ترک کے لئے اپنی شادی کا درج رجسٹر کرانا لازمی ہے۔ اس سے پولیس کو یہ معلوم کرنے میں آسانی ہوتی ہے کہ شادی

کرنے والے فریقین کہیں اور کوئی بیویاں یا شوہر تو نہیں رکھتے۔ جب ڈاکٹری سرٹیفکٹ پیش ہوتا ہے تو جمہوریت کو اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ کسی خطرناک یا متعدی مرض کے مریض کو شادی کرنے سے روک دے۔

پیشہ ور عورتوں کو ایک پاسپورٹ دیا جاتا ہے اور ان کے لئے لازم ہے کہ ہفتہ میں کم از کم تین مرتبہ اپنی صحت کی جانچ کرائیں اور پاسپورٹ پر ڈاکٹر کی رائے ثبت کرائیں اس طریقہ سے جو شخص ان چکلوں میں جاتا ہے اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس طرح کی عورت سے تعلق کر رہا ہے۔ بیس سال سے کم عمر لڑکوں کو وہاں جانے کی اجازت نہیں، کیونکہ ان مقامات پر پولیس ہمیشہ چکر لگاتی رہتی ہے اور لڑکے ان کو دیکھ تک نہیں سکتے۔

وہاں پرائیوٹ چکلہ خانہ جاری کرنا ممنوع ہے اور ذرا سی اطلاع پر پولیس چھاپہ مار کر لوگوں کو گرفتار کر لیتی ہے۔ کوئی ہوٹل والا کبھی اپنے کمروں کو ان مقاصد کے لئے کرایہ پر نہیں اٹھا سکتا۔ اس مسئلہ میں ترکی کے متعلق جو کچھ غیر ملکی لوگوں نے ظاہر کیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ جو عورتیں استنبول اور دوسرے مقاموں کے اڈوں میں پائی جاتی ہیں وہ سب غیر ملکی ہیں جو ترکی میں آکر اسی مقصد کے لئے سکونت پذیر ہو گئی ہیں ان میں ایک بھی مسلمان عورت نہیں۔

ترکی میں گداگری کی بھی اجازت نہیں ہے اور حکومت نے اس مسئلہ کو مختلف طریقوں سے حل کیا ہے۔ اول تو اس نے لازمی تعلیم رائج کر دی ہے اور اسی کے ساتھ نوجوانوں کو صنعتی تعلیم دلا کر بیروزگاری کو بہت کم کر دیا ہے۔ علاوہ اس کے جو مضبوط و توانا جسم کے لوگ ہیں ان کو فوج میں بھرتی کر دیا جاتا ہے اور جو اس قابل نہیں ہیں، اُن کے لئے خیر اتخانے قائم کر دئے ہیں، جہاں ان کو اور ان کی عورتوں اور بچوں کو تعلیم دیجاتی ہے اور ہر قسم کی طبی و قانونی امداد مفت ملتی ہے۔

غریبوں کے لئے ان خیر اتخانوں کے علاوہ سفری شفاخانوں کا بھی بندوبست کیا ہے تاکہ دور دور فاصلوں پر بھی ان کو طبی امداد پہونچ جائے۔ یہ ادارے اس طرح چلائے جاتے ہیں کہ جمہوریت نے زکوٰۃ جمع کرنے کا کام اپنے ذمے لیا ہے۔ علاوہ زکوٰۃ کے ہر فرد کو اپنی ماہانہ آمدنی سے ایک فیصدی ٹیکس بھی دینا ہوتا ہے اور اس آمدنی سے تعلیمی اخراجات ادا کئے جاتے ہیں۔ اسوقت وہاں ابتدائی تعلیم بالکل مفت اور لازمی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک ہر طبقہ کا انسان پڑھا لکھا نظر آتا ہے

پردہ کے متعلق ترکی کے رویہ کو بہت بدنام کیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ موجودہ ترکی کا خیال ہے کہ عورت کے پردہ کا تعلق بجائے چہرہ کے زیادہ تر اس کے دل سے ہے۔ ترکی میں پردہ اُٹھ جانے سے یہ فایدہ ہوا کہ وہ ہزاروں بدنصیب عورتیں جو قیدیوں کی طرح زندگی بسر کرتی تھیں، آزادی کی سانس لینے لگیں۔ جمہوریت نے اول اول صرف مشورہ و ہدایت سے پردہ ترک کرانا چاہا۔ لیکن جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو قانون نافذ کیا گیا، اور اب وہاں کی عورت نے اچھی طرح جان لیا ہے کہ یہ سب انھیں کی بہتری کے لئے تھا۔

اسی اصلاح کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر آج ترکی جنگ میں شامل ہو جائے تو ایک ایک مرد وہاں کا میدان جنگ میں جا سکتا ہے اور تمام ملکی عہدے ملک کی اقتصادی و صنعتی حالت کو کسی قسم کا خطرہ پہونچائے بغیر عورتیں سنبھال سکتی ہیں۔

بلاشبہ عورتوں کا اکیلا پھرنا اکثر خطرناک ہوتا ہے مگر ترکی میں ایسا نہیں ہے۔ ہر عورت چاہے وہ کتنے ہی کم درجے کی کیوں نہ ہو بلاخوف چل پھر سکتی ہے۔ وہ پولیس کو اطلاع دے دیتی ہے اور فوراً ایک سادہ ملبوس کا پولیس مین ۱۵ فٹ کے فاصلہ سے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ یہ شخص اس بات کا ذمہ دار ہوتا ہے کہ کوئی شخص عورت سے مذاق یا اس پر حملہ نہ کر سکے۔

اب دوسری اصلاحات کو ملاحظہ کیجئے۔ آج ترکی میں اگر کسی شخص کو سڑک پر تھوکتا ہوا پایا جائے تو فوراً پولیس چوکی پر لیجایا جاتا
ہے اور وہاں اسے دو ترکی پونڈ جرمانہ دینا ہوتا ہے۔ اس قانون سے بہت سی بیماریاں رک گئی ہیں۔
دودھ انسان کی نہایت ضروری خوراک ہے۔ ترکی نے اس مشکل مسئلہ کو یوں حل کیا ہے۔ کوئی دودھ والا بوتلوں میں
یا گھر کے بنائے ہوئے پیپوں میں تقسیم نہیں کرسکتا۔ اسے اپنا دودھ جمہوریت کی مقررہ دوکانوں پر پیش کرنا ہوتا ہے۔ یہاں افسر
دودھ کو جانچتا ہے اور ایک پیپہ میں رکھ کر سر بمہر کردیتا ہے۔ اس پیپے میں کیتلی کی طرح ایک ٹونٹی ہوتی ہے۔ جس سے دودھ
باہر انڈیلا جاتا ہے مگر سیفٹی والو کی وجہ سے اندر کچھ نہیں ڈالا جاسکتا۔ اس طرح تمام قوم کو تازہ خالص دودھ مہیا ہوجاتا
ہے۔ یہی حال گوشت اور مچھلی کا ہے، کہ پہلے ان کا امتحان کیا جاتا ہے اور افیسر انچارج قیمتیں مقرر کردیتا ہے اور گوشت اور مچھلی
کا بازار ایک مقررہ وقت کے بعد جب اس کے خیال سے مچھلی سڑنے لگتی ہے بند کردیا جاتا ہے۔
پھل ترکی میں کثرت سے پیدا ہوتے ہیں اور ان کی خرید و فروخت کے متعلق بھی خاص انتظامات ہیں۔ مثلاً کوئی خوانچہ والا
اس طرح پھل نہیں بیچ سکتا کہ اس پر مکھیاں یا کیڑے چھائے ہوئے ہوں، سب لفافوں میں بند ہوتے ہیں۔ یہی انتظام
مٹھائی کا بھی ہے۔ روٹیوں کے متعلق بھی خاص احتیاط کی جاتی ہے، چنانچہ حکومت وہاں کوئی ایسا تنور قایم نہ رہنے دیگی
جہاں آٹا ہاتھوں یا ٹانگوں سے گوندھا جاتا ہو، وہاں یہ سب کام بجلی سے ہوتا ہے۔ اب سے قبل ترکی کا تقریباً ایک تہائی حصہ
ملیریا کی آماجگاہ تھا اور آنکھوں کی ایک نہایت خطرناک بیماری وہاں عام تھی۔ جمہوریت نے جمہوریت کا اعلان ہونے کے
بعد ہی اول ملک کو دق اور ملائیت کی خطرناک بیماریوں سے صاف کرنے کا عزم کیا اور اس کے بعد دوسرے امراض کی طرف
توجہ کی۔ وہاں آنکھوں کی ایک بیماری عام تھی جس میں پپوٹے پر دانے نکل آتے تھے اور اگر اس سے غفلت برتی جاسکے تو
آدمی کو اندھا کردیتی تھی، جمہوریت نے اس کے خلاف منظم جہاد کیا اور صرف ۱۹۳۲ء میں دس لاکھ سے زیادہ کا باقاعدہ
علاج اور پندرہ ہزار سے زیادہ کا آپریشن کیا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بیماری کم خطرناک ہوگئی اور اندھے پن کے واقعات بہت کم ہوگئے۔
ملک کا پانچواں حصہ ملیریا زدہ تھا۔ جمہوریت نے اس مرض کی بھی جڑ کھود دی، انگورہ جو موجودہ دارالخلافہ ہے یہاں سخت
ملیریا ہوتا تھا۔ مگر آج انگورہ جانے آنے والوں سے پوچھئے کہ وہاں اب کوئی ملیریا سے واقف ہی نہیں۔ ۱۹۲۸ء میں علاج ملیریا کے
سلسلہ میں قانوناً ہر ڈاکٹر پر لازم کیا گیا کہ تین ماہ تک ملیریا کے متعلق تعلیم پائے اور ان علاقوں میں جہاں ملیریا کے کیڑے اور مچھر
موجود تھے، سیکڑوں شفاخانے قایم کرکے اس مصیبت سے ملک کو نجات دلائی۔
جمہوریت نے یہ بھی حکم دیا کہ تمام دلدلیں اور رکا ہوا پانی خشک کیا جائے، اسی کے ساتھ مچھروں کو تیل چھڑک کر مارنا
لازم کیا گیا۔ ان احکامات کی خلاف ورزی قابل سزا تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ حکومت اپنے ملک کو ان آفات سے بچانے کا
عزم مصمم کرچکی تھی اور اس نے رعایا کو اس جہاد میں کمزوری دکھانے کی بھی سزا دی۔

تعلیمی اصلاحات

جمہوریت نے جس رفتار سے تعلیمی اصلاحات کو رائج کیا وہ یقیناً حیرتناک ہے۔ سلاطین کے
دور میں تعلیم عیسائی مشنریوں کے ہاتھ میں تھی جو قومی تعلیم دینے کے بجائے عیسائی بنانے
کی طرف زیادہ توجہ دیتی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی زبان اور اسلام کو کافی نقصان پہنچا۔
ظاہر ہے کہ جمہوریت کے سامنے نہایت دشوار کام تھا اور اکثر ماہران تعلیم نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے

کہ ترکی اس قدر کم مائیگی کے باوجود بیس سال کی قلیل مدت میں اتنے اسکول اور کالج کس طرح جاری کر سکا۔ یہ صحیح ہے کہ مالی اعتبار سے ترکی دوسری قوموں کے مقابلہ میں کمزور ہے مگر دولتمند ترکوں کے بے نظیر اتحادِ عمل کی وجہ سے تمام تعلیمی تجاویز کامیاب ہوئیں۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ کچھ صدی پہلے مسلمان نہایت خوش حال تھے اور یہ حالت اسوقت تک قایم رہی جب تک زکوٰۃ جمع کرنے اور اس کا صحیح تصرت کا کام ایمانداری سے ہوتا رہا۔ اب ترکی نے پھر اسی اُصول پر عمل شروع کیا ہے۔ اور وہ اس ٹیکس کو اس قدر صحت سے وصول کرتی ہے کہ غربت بہت کم ہوگئی ہے اور ایسی اخوت قایم ہوگئی ہے کہ اسوقت ترکی میں امیر و غریب کا کوئی سوال نہیں۔

جمہوریت نے ہر اسکول میں عربی تعلیم لازمی کر دی ہے اور یہ بڑی حد تک قرآن پاک کے صحیح استعمال کا سبب ہوا ہے۔ مکمل ابتدائی تعلیم تمام رعایا کو بالکل مفت دیجاتی ہے جو لازمی ہے۔ ترکی میں بے پڑھا ہونا مستوجب سزا ہے۔ جب دو تین سال کی تنبیہ کے بعد تعلیمی قانون پاس کیا گیا تو بوڑھے مردوں اور عورتوں کا کاغذ، کتاب اور پنسل سنبھالنے کا نظارہ واقعی قابل دید تھا۔ قوم کو متاثر کرنے کے لئے کارخانوں میں بے پڑھوں کے ملازم رکھنے کی مخالفت کا قانون پاس کیا گیا اور اس قانون کی خلاف ورزی کی سزا تین سو ترکی پونڈ تھی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد پبلک کتب خانوں کے ذریعہ سے جو جمہوریت نے اس مقصد کیلئے بنائے ہیں یہ سلسلہ برابر جاری رکھا جاتا ہے۔ جمہوریت نے پہلا قدم معمر لوگوں کے خلاف نہیں بلکہ نوجوانوں کے خلاف اٹھایا اور تمام ملک میں جہاں کہیں جوہر قابل نظر آیا اس کے لئے بیرون ملک تعلیم پانے کے لئے تمام ممکن آسانیاں اور سہولتیں بہم کی گئیں۔ محکمۂ تعلیم کو پہلی دشواری کسانوں کے بچوں کی بابت اُٹھانی پڑی، جن کے مکان اور کھیت اسکولوں سے میلوں دور تھے۔ مگر اس دشواری کو جلد دور کر دیا گیا۔ علاوہ تعلیم کے ان لڑکوں کو مفت کھانا بھی دیا جاتا تھا۔ اس سے انکے والدین پر خاطر خواہ اثر ہوا اور انھوں نے اپنے سب بچوں کو مدرسہ بھیج دیا۔

زبان کی اصلاح جو اتاترک نے کی وہ ترکی کی نئی قومیت کا لازمی نتیجہ تھی۔ اس کا مقصد تمام فارسی اور عربی الفاظ کی بجائے جو روزمرہ کی ترکی میں شامل تھے مناسب و موزوں ترکی الفاظ مہیا کرنا تھا۔ اس مقصد کے لئے ایک سرکاری لغت چھاپا گیا اور اخبارات کو وقتاً فوقتاً اس کے اقتباسات شایع کرنے پر مجبور کیا گیا۔

اب آئیے لڑکے اور لڑکیوں کے مدرسوں کی سیر کیجئے: ــــــــــ ان مدرسوں میں پہلی چیز جو ہمیں نظر آتی ہے وہ لڑکوں کی سادگی ہے، لمبے اور فیشن ایبل بال رکھنے اور نہایت عمدہ شکن دار پتلون پہننے کی اسکولوں میں ممانعت ہے۔ البتہ صاف ستھرا لباس استعمال کرنا ضروری ہے اور یہ بھی کوشش کی جاتی ہے کہ لڑکے زیادہ تر پور ڈنگ میں رہیں۔ نصاب بہت سادہ ہے۔ اس میں کوئی ایسی چیز شامل نہیں جو نوجوان کے لئے بار ہو۔ ترکی تاریخ کی کتابوں میں صرف سچے واقعات درج ہوتے ہیں اور غلط تاریخ کی کتاب اسکول کی عمارت میں آ نہیں سکتی۔ ان زبانوں پر جو بعد کو زندگی میں کام آتی ہیں بہت زور دیا جاتا ہے۔ اس لئے ہر سال ہر متعلم کو موقعہ دیا جاتا ہے کہ تین ماہ کی تعطیل میں طیاری کر کے اگلے درجے میں داخل ہوسکے اور لڑکا تھوڑی ہی عمر میں وہ پیشہ سنبھال سکے جس کے لئے وہ موزوں ہے۔

جسمانی تربیت لازمی ہے اور اس کے ذمہ دار تربیت یافتہ اُستاد ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت توانا و تندرست نوجوان تمام ملک میں پیدا ہو رہے ہیں۔

اسکولوں میں لڑکوں کو آداب معاشرت کی بھی تعلیم دیجاتی ہے مشرق میں اس طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے لڑکے جوان ہونے پر خود کو نہیں سنبھال سکتے، انھیں آداب نشست و برخاست معلوم ہوتے ہیں اور نہ یہ کہ عورت سے کس طرح گفتگو کی جاتی ہے ۔ ترکی میں آداب مجلس پر بہت زور دیا جاتا ہے اور علاوہ اسکول کے متمول والدین اپنے بچوں کے لئے اسکے واسطے نجی اُستاد بھی رکھتے ہیں ۔ جمہوریت ہر ممکن کوشش حقیقی انسانوں کے پیدا کرنے کی کر رہی ہے تاکہ وہ دوسروں کی رہنمائی کر سکیں ۔ جو ملک کے حقیقی محافظ ہوں ۔ اسکول کے ارباب حل و عقد سوشل مجمعوں کا انتظام و انصرام لڑکوں کے سپرد کرتے ہیں تاکہ وہ عملاً آداب مجلس سے واقفیت حاصل کریں ۔ علاوہ ان ضیافتوں کے بچوں کو ملک کے تمام مشہور مقامات کی سیر بھی کرائی جاتی ہے ۔ ترکی کا جغرافیہ لڑکے کے دماغ میں اس قدر بھر دیا جاتا ہے کہ ہر لڑکا ملک کے تمام راستوں سے واقف ہو جاتا ہے اس طرز تعلیم سے لڑکے ملک کی حفاظت کے لئے طیار ہو جاتے ہیں تاکہ اگر کبھی انھیں کسی مہم کی سرکردگی سپرد ہو یا ملک میں سے فوج لیجانی پڑے تو وہ بآسانی تمام اپنے فرض کو انجام دیں ۔

ہر سال طالبعلموں کا ایک گروہ چنا جاتا ہے اور اسے بیرونی ممالک میں مزید مطالعہ کے لئے نہایت سخت ہدایتوں کے ساتھ بھیجا جاتا ہے ۔ یہ طالبعلم سرکاری خرچ سے جاتے ہیں اور واپسی پر ان کو ملازمت کا یقین دلا دیا جاتا ہے ۔ ان طالبعلموں کے انتخاب میں نسل و خون کا کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا بلکہ صرف ذہنی استعداد کا خیال کیا جاتا ہے ۔

تازہ پاس شدہ ڈاکٹروں کے لئے ترکی میں یہ دستور ہے کہ وہ کم از کم تین سال تک کسی اسپتال میں عملی کام کریں اور اس طرح کوئی نیم حکیم خطرۂ جان اس ملک میں ہرگز کام نہیں کر سکتا ۔ جب کوئی ڈاکٹر شہرت حاصل کرنے لگتا ہے تو حکومت اس سے درخواست کرتی ہے کہ ہفتہ میں کم از کم دو گھنٹے کسی اسپتال میں صرف کرے تاکہ غربا بھی مفت مشورہ حاصل کرنے کے موقع سے فایدہ اٹھا سکیں ۔ یہی مطالبات وکیلوں اور بیرسٹروں سے بھی کئے جاتے ہیں جنھیں سال میں کم از کم تین مقدمے غریبوں کے بلا فیس کرنے پڑتے ہیں ۔ ان مقدموں میں اسٹامپ کی قیمت جمہوریت ادا کرتی ہے ۔

تعلیم کی یہ فراوانی دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ وہاں بھی پڑھے لکھے لوگ اکثر بیکار ہوں گے ۔ مگر ترکی میں زراعتی و صنعتی ترقی کی وجہ سے یہ دشواری پیدا نہیں ہوئی ۔ جمہوریت اسبات کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے کہ تعلیمگاہوں سے نکلے ہوئے لوگ تجارت میں کھپ جائیں ۔

علاوہ لازمی ابتدائی تعلیم اور جسمانی تربیت کے ترکی نوجوان کو تین سال فوجی تربیت حاصل کرنا لازم ہے ۔ ملیٹری سائنس یونیورسٹی میں لازمی مضمون ہے ۔ فوجی تربیت جو یونیورسٹیوں میں دیجاتی ہے وہ اتنی مکمل ہوتی ہے کہ تین سال کے بعد لڑکا مکمل سپاہی بن کر نکلتا ہے ۔

وہاں کی فوجی تربیت اور ڈسپلن نہایت زبردست ہے اور کوئی ملک بہادری میں ترکی کا مقابلہ نہیں کر سکتا ۔ الکھڑ اور غیر معمولی جرأت والا جاپانی سپاہی بھی ترکی سپاہی کا مقابلہ نہیں کر سکتا ۔

پولیس میں بھی تعلیمی اصلاحات جاری کی گئی ہیں، چنانچہ وہاں آپ کو ایسا کوئی سپاہی نہ ملے گا جو کم از کم تین زبانیں نہ جانتا ہو اسی لئے وہاں پولیس والوں سے بات چیت میں کبھی دقت نہ ہوگی مگر شرط یہ ہے کہ تم بھی براعظم کی زبانوں میں سے کوئی زبان جانتے ہو ۔ پولیس والے نہایت خوش اخلاق ہوتے ہیں اور غیر ملکیوں سے نہایت نرمی کا برتاؤ کرتے ہیں ۔ ترکی پولیس کی بڑی خصوصیت

یہ ہے کہ وہاں کبھی رشوت کا کوئی معاملہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ باوردی پولیس والے یا فوجی سپاہی کو سینما یا پبلک قہوہ خانے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے اگر وہ ایسا کرنا چاہیں تو انھیں شریف شہریوں کے کپڑے بدلنے پڑیں گے۔

اب آیئے لڑکیوں کے مدرسہ کی سیر کیجئے :- لڑکیوں کے مدرسے میں کسی کو پوڈر، پالش، برش، یا غازہ کے استعمال کی اجازت نہیں ہے۔ وہاں انتہائی سادگی ہے۔ ہر نوجوان لڑکی کو سینا اور کھانا پکانا سیکھنا پڑتا ہے اور جسمانی تربیت لازمی ہو اور ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ عورتیں جسمانی لحاظ سے مضبوط اور مستعد ہوں۔ وہاں تیمارداری بھی سکھائی جاتی ہے اور فرسٹ ایڈ کی بھی تعلیم ہوتی ہے۔

تعلیمی شعبہ جات کے سب دروازے ترکی عورتوں کے واسطے کھلے ہوئے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ترکی خاتون ہوابازوں۔ ڈاکٹروں۔ ایڈوکیٹوں۔ بیرسٹروں۔ دندان سازوں اور وزیروں پر فخر کرسکتا ہے۔ لیڈی ڈاکٹروں کی اتنی کثرت ہے کہ جنگی خدمت کی پہلی ہی پکار پر کم سے کم ۲۵۰۰۰ عورتوں نے اپنے نام پیش کردئے۔ وہاں زنانہ پولیس کی بھی ایک خاص جماعت قایم ہے۔ عورتوں کو زراعت۔ صنعت اور تجارت کے محکموں میں بھی تعلیم دیجاتی ہے تاکہ اگر ترکی کو جنگ میں شامل ہونا پڑے تو ملک کی صنعتی اور اقتصادی حالت کو کسی طرح نقصان نہ ہو۔ لڑکوں کے مدرسوں کی طرح لڑکیوں کے مدرسے بھی اپنی سوشل تقریبوں کا انتظام کرتے ہیں جن میں آداب معاشرت اور جماعتی انتظامات کی تربیت دیجاتی ہے تاکہ لڑکیاں آیندہ زندگی میں شوہروں کے گھروں اور اُن کے دوستوں اور مہمانوں کا انتظام کرنا سیکھ جائیں۔ اکثر کھانے پکانے کے مقابلے بھی منعقد ہوتے رہتے ہیں اور سندیں بھی دیجاتی ہیں۔

قبل اس کے کہ میں یہ گفتگو ختم کردوں، مجھے ترکی کے ان لڑکوں اور لڑکیوں کے اداروں کے متعلق ایک بات اور کہنی ہے اور وہ یہ کہ ہر بچے کو پہلے یہ تعلیم دیجاتی ہے کہ روئے زمین پر سوائے اللہ جل شانہ کے اور کوئی نہیں جس کا خوف کیا جائے اور یہ کہ پہلے خدائے برتر کی محبت ہونی چاہئے پھر وطن کی۔ اس طرح سے جمہوریت نے ہر بچہ کی رگوں میں قومی اسپرٹ بھردی ہے اور آج وہاں کا ہر فرد اپنے ملک کی خاطر لڑنے اور مرنے کو طیار رہتا ہے۔

زرعی و صنعتی انقلاب

ترکی زراعتی ملک ہے اور اس کی زمین نہایت زرخیز ہے چنانچہ مذہبی اور اجتماعی انقلابات کے ساتھ ساتھ اتاترک نے ترکی کی زرعی زندگی میں بھی تبدیلیاں کیں۔ انھوں نے انگورہ میں ماڈل فارم قایم کئے جہاں اپنی فرصت کے اوقات میں وہ معمولی کسان کی طرح کام کرتے تھے اور رفتہ رفتہ اس کو اتنی ترقی دی کہ انگورہ آج ایک بہترین زراعتی ادارہ ہونے پر فخر کرسکتا ہے۔ یہاں زراعتی کالج بھی جاری کردئے گئے ہیں۔ جہاں مفت تعلیم ہوتی ہے اور غیر ملکی طالبعلموں کو بھی دعوت دیجاتی ہے۔

سگرٹ بنانے کی تقریباً ۵ فیکٹریاں اور ۵ کارخانے ہیں۔ مرد عورت دونوں یہاں کام کرتے ہیں اور ان کی اوسط اُجرت سوا دو روپیہ روزانہ ہے۔

یہاں کے تمام کارخانوں میں ایک بیمار فنڈ ہوتا ہے، ہر ملازم اس میں اپنی اُجرت کا دو فیصدی ادا کرتا ہے اور فیکٹری ایک فیصدی چندہ دیتی ہے۔ بیماری کے پہلے ہفتے میں فنڈ سے آدھی تنخواہ دیجاتی ہے اور دوسرے اور چوتھے ماہ میں ایک چوتھائی۔ جس عورت کے بچہ ہوتا ہے وہ پوری اُجرت پر ایک ماہ کے آرام کی مستحق ہوتی ہے اور مزید تین ماہ کی رخصت آدھی تنخواہ

لے سکتی ہے۔

۱۵ سال سے کم عمر میں کام کرنے کی اجازت نہیں اور جن فیکٹریوں میں بچے ملازم پائے جاتے ہیں ان پر مقدمہ چلایا جاتا ہے اور انھیں ۵۰۰ ترکی پونڈ جرمانہ دینا ہوتا ہے۔ مرد اور عورت مزدوروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر وہ مرد کی برابر کام کرے وہی اُجرت عورت کو بھی دیجاتی ہے۔

گیہوں غلہ میں گیہوں کا درجہ سب سے آگے ہے۔ یہ وسطی اور غربی اناطولیہ میں کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ سلاطین کے زمانے میں گیہوں کی پیداوار سے غفلت برتی جاتی تھی۔ جمہوریت نے اس سلسلے میں بہت کام کیا ہے اور گیہوں کی قسم بھی اچھی کردی ہے۔ اس نے بیج کی جانچ کے ادارے مقرر کردئے ہیں اور کسانوں کو صرف ترقی یافتہ قسمیں اُگانے کی اجازت ہے۔ مغربی اناطولیہ آج اپنے لئے کافی غلہ پیدا کرلیتا ہے۔ مگر وسطی ترکی سے گیہوں کی بڑی مقدار میں برآمد ہوتی ہے صرف ایک قونیہ کے ریلوے اسٹیشن سے جو کہ وسط میں واقع ہے ساڑھے چھ لاکھ من گیہوں سالانہ گزرتا ہے۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں گیہوں کی فصل ۴ کرور من ہوئی مگر سنہ ۱۹۳۳ء میں وہ ۹ کرور ۲۰ لاکھ من ہوئی مگر سنہ ۱۹۳۷ء میں وہ ۱۰ کرور ۲۰ لاکھ من تک جا پہونچی۔ کل گیہوں کی فصل کی سالانہ قیمت کا اندازہ بیس کرور روپئے ہے۔ اس پر بھی جمہوریت کی یہ کوشش ہے کہ پیداوار میں اور ترقی ہو اور ترکی کو مطلق اپنا ہی بھروسہ ہو۔

کپاس روئی بھی یہاں کی خاص پیداوار ہے اور اس کو بھی بڑی ترقی دیگئی ہے، شروع شروع میں تقریباً ۷۵ فیصدی (تین چوتھائی) پیداوار چھوٹے ریشے والی تھی مگر حال میں امریکن لمبے ریشے والی کپاس جاری کی گئی ہے۔ جب امریکن کپاس ملک میں شروع کی گئی تو کسانوں کو کم از کم اس کا ۲۰ لاکھ ٹن بیج یا تو مفت تقسیم کیا گیا یا پرانے بیج کے بدلے میں دیا گیا۔ موجودہ کل پیداوار ۱۲ کرور ۲۰ لاکھ پونڈ ہے۔ اس پیداوار کا تقریباً نوّے فیصدی خود ترکی ملوں میں صرف ہو جاتا ہے۔ ترکی ایشیا ریشم پیدا کرنے میں بھی خاص درجہ رکھتا ہے اور جمہوریت نے اس کو بھی بڑی ترقی دی ہے۔

جنگل ترکی کے کل رقبہ کا دس فیصدی سے زیادہ جنگل ہے۔ سب جنگل سرکار کی ملکیت ہیں۔ انناس، اخروٹ اور شاہ بلوط بکثرت ہیں۔ ترکی عمارتی لکڑی۔ تعمیر جہاز بنانے اور ایندھن کے کام میں آتی ہے۔ جنگلات نہایت سائنٹفک طریق پر رکھے جاتے ہیں۔

پھل پھلوں کے کاروبار میں بھی بڑی ترقی ہو رہی ہے یہ ترکی کے (بحر روم) والے علاقے کا اہم کاروبار ہے۔ انگور اُگانے کی طرف آجکل خاص توجہ دیجارہی ہے۔ سمرنا کے خشک انگور (کشمش) بڑی مقداروں میں یوروپ بھیجے جاتے ہیں اور انجیر بھی باہر بھیجے جاتے ہیں۔ سخت چھلکے والے پھل بحر اسود کے ساحل پر پیدا ہوتے ہیں جن کی مانگ دوسرے ملکوں میں بھی بڑھتی جارہی ہے۔

معدنی دولت کسی ملک کی آیندہ اقتصادی بہبودی کا انحصار اس کے معدنی ذخائر پر ہوتا ہے۔ ترکی، بلقان اور دیگر مسلم ممالک کے مقابلہ میں زیادہ معدنیات کا مالک ہے۔ کوئلہ بڑی مقداروں میں پایا جاتا ہے اور سب سے قیمتی کوئلے اور لوہے کی کان بحر اسود کے نزدیک ایک سو میل تک پھیلی ہوئی ہے اس علاقے کے کوئلے میں لوہا گلانے کی زبردست خاصیت ہیں۔ اس کان کے ذخیرے کا اندازہ دو ارب ٹن کے قریب ہے۔ موجودہ وقت میں ترکی کی کل پیداوار

نصف کروڑ ٹن ہے۔

جمہوریت نے ترکی کی زیر زمین دولت کو دریافت کرنے اور کام میں لانے کے لئے بڑی دقتیں اُٹھائی ہیں اور اس مقصد کیلئے طالبعلم بیرون ملک مطالعہ کے لئے بھیجے جاتے ہیں اور پھر ان کانوں پر مامور کئے جاتے ہیں۔ دیگر معدنیات تانبا۔ سونا۔ چاندی جست۔ گندھک۔ نمک اور پارہ ہیں۔ میرشام (meerschaum) جو ایک کمیاب دھات ہے ترکی میں اسکی دنیابھر کی پیداوار کا اسی فیصدی پیدا ہوتا ہے۔ کروم اور سمباد (chrome & emery) میں بھی یہ دنیا میں سب سے زیادہ دولتمند ملک ہے۔ منگانیز۔ ابرق۔ لی کوائٹ۔ بورے سائٹ اور جست بھی پائے جاتے ہیں۔ بہت سا تانبا جنوبی ترکی میں کھودا جاتا ہے پٹرول مشرقی اناطولیہ میں پایا جاتا ہے اور ترکی کے تیل کے چشمے عراق اور روس کے چشموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ گندھک کی کل پیداوار ۲ لاکھ ٹن سالانہ ہے۔

ہوائی راستے اور ریلیں جب ۱۹۲۳ء میں ترکی نے جمہوریت کا اعلان کیا تو اس نے تمام غیر ملکی ریلیں خرید لیں اور قومی سرمایہ سے نئی ریلیں جاری کیں، جمہوریت نے ۴۵۰۰ میل لمبی نئی لائنیں بنائیں اور سب مشہور شہروں اور صنعتی مرکزوں کو ملا دیا۔ ترکی کی اقتصادی پالیسی کی بنیاد سڑکوں۔ ریلوں اور ہوائی راستوں پر ہے۔ وہ دن گئے جب کسانوں کو اپنی پیداوار اونٹوں پر لاد کر دنوں اور مہینوں گھسٹنا پڑتا تھا۔ آج ریل اسے بندرگاہوں اور دیگر مرکزوں تک لیجاتی ہے۔ مشرق سے مغرب تک ایک لائن بنائی گئی ہے اور اس طرح ایران سے ریل کی سیدھی آمدورفت ہوگئی ہے۔ انگورہ اور استنبول کے درمیان ایک قومی ہوائی سروس قایم کردی گئی ہے۔ استنبول کا براہ راست تعلق ماسکو۔ ایتھنز۔ صوفیا اور بخارسٹ سے بھی ہے۔ ہوائی کلب تمام بڑے بڑے شہروں میں جاری کردئے گئے ہیں اور ہزاروں مردوں اور عورتوں کو ہوابازی کی تعلیم دیجارہی ہے۔

دوسری صنعتیں ترکی قالین تمام دنیا میں مشہور ہیں۔ اور اب حکومت کی امداد سے یہ صنعت بھی ترقی کررہی ہے۔ اسلحہ سازی نے یہاں اتنی ترقی کرلی ہے کہ آج ترکی اپنی توپیں۔ مشین گنیں۔ ٹینک۔ ہوائی جہاز زہریلی گیسیں۔ آبدوز اور بحری جہاز وغیرہ طیار کرتا ہے۔ اور یہ تمام صنعتی ترقی بلا غیر ملکی قرضہ لئے ہوئے کی گئی ہیں۔

ملکی انتظام یورپ کا "مرد بیمار" بقول نکولس اول شہنشاہ روس جس نے یہ اصطلاح ۱۸۵۳ء میں اختراع کی تھی آج اس کا سب سے تندرست بچہ ہے۔ ۱۹۲۳ء میں صلحنامۂ لازین کے طے ہونے کے بعد، انگورہ کی حکومت کو ترکی کی جایز حکومت تسلیم کیا گیا اور اس صلحنامہ سے ترکی نے اپنے کھوئے اقتدار کا بڑا حصہ حاصل کرلیا۔ غازی مصطفٰے کمال نئی جمہوریت میں تمام معاملات کا مرکز تھا، جمہوریت کا پایۂ تخت استنبول سے انگورہ کو تبدیل کیا گیا۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ استنبول کی سلامتی و تحفظ قایم رکھنے کے لئے نہایت زبردست بحری فوج کی ضرورت ہوگی اور یہ کہ عیسائی اتحادی طاقتوں سے بغیر ایسی بحری فوجوں کے مقابلہ کرنا ناممکن ہوگا۔ لہذا جغرافی حیثیت سے انگورہ ترکی کا دار الخلافہ ہونے کے لئے زیادہ موزوں ہے۔

نئے دستور نے یہ نافذ کیا کہ ترکی حکومت کا جمہوری آئین کبھی تبدیل نہ کیا جائے۔ ترکی کی گرانڈ نیشنل اسمبلی ایک منتخب شدہ جماعت ہے جس کو تمام انتظامی قوانین وضع کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اسمبلی اپنے ممبران میں سے اپنا صدر منتخب کرتی ہے۔

اور وہی جمہوریت کا بھی صدر ہوتا ہے۔ صدر اپنا وزیر اعظم اسمبلی کے ممبروں میں سے چنتا ہے اور وہ اپنے وزرا کا بھی انہیں میں سے انتخاب کرتا ہے۔ یہ تمام تقررات اسمبلی کی منظوری کے تابع ہوتے ہیں۔ وزرا انفرادی اور مجموعی طور سے اسمبلی کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں اسمبلی میں ۲۱۵ نمایندے تھے اور مشیران کار کا چناؤ حسب ذیل تھا:

(۱) صدر کونسل۔ (۲) وزیر اندرونی۔ (۳) وزیر مالیات۔ (۴) وزیر عدل۔ (۵) وزیر تعلیم۔ (۶) وزیر قومی تحفظ

(۷) وزیر پبلک ورکس۔ (۸) وزیر قومی اقتصادیات۔ (۹) پبلک ہیلتھ۔ (۱۰) وزیر معاملات خارجہ۔

عدالتی نظم ونسق کے لئے بھی علٰحدہ ایک اسمبلی موجود ہے۔ وہاں تقریباً ۵۰، ۷ قانونی عدالتیں ہیں جن میں سے ۲۰۰ موضعی میں ہیں اور بقیہ میں تمام عدالتیں سپریم کورٹ کے ماتحت ہیں، جس میں ۳۲ جج شامل ہیں۔ ججوں کو مختلف نشستوں میں تقسیم کیا ہے جو عدالتہائے ماتحت کی اپیلوں کا جو ان کے لئے قابل سماعت ہوں فیصلہ کرتی ہیں۔ ان عدالتوں کو دیوانی۔ فوجداری تجارتی مقدمات کی سماعت کا اختیار حاصل ہے۔

یہاں کے قید خانوں کا اصول یہ ہے کہ قیدی اپنا گزارہ خود کرتے ہیں۔ ان کی اجرت کا کچھ حصہ روک لیا جاتا ہے اور جو جمع ہوتا ہے ان کے حساب میں منتقل کر دیا جاتا ہے تاکہ جب وہ قید خانے کی کوٹھری چھوڑیں تو ان کے پاس کچھ دن بسر کرنے کے لئے روپیہ موجود ہو۔ وہ اپنے ممبروں کی ایک کمیٹی کے ذریعہ سے جیلخانوں کو جمہوری طرز پر چلانے اور قواعد بنانے میں سرکار سے اتحاد عمل کرتے ہیں۔ قواعد کی خلاف ورزی کے معاملات قیدیوں کی ایک کونسل طے کرتی ہے۔

صوبہ جاتی طرز حکومت میں بھی بہت اصلاحات ہوئی ہیں۔ ان کے انتظامی حصہ کا صوبہ جاتی حکومت میں سب سے زیادہ با اختیار حاکم ہوتا ہے۔ صوبہ کی اپنی الگ منتخب شدہ کونسل ہوتی ہے، جو تمام اہم مقامی امور طے کرتی ہے۔ کونسل اپنے ممبروں میں سے ایک صدر اور مجلس انتظامیہ کا انتخاب کرتی ہے۔ صدر انتظامی امور کا افسر اعلیٰ ہوتا ہے اور انتظامی معاملات میں صرف قومی اور مقامی اختلاف کی صورت میں دخل دیتا ہے۔

رفیع اللہ خاں

ایک قیمتی شعر

(تاریخی گفتگو)

حال ہی میں کتاب موسومۂ "مضامین چغتائی مرزا عظیم بیگ چغتائی" میری نظر سے گزری، یہ کتاب مختلف عنوانات اور مختلف مضامین پر مشتمل ہے، اس کے ایک مضمون کی سرخی "ایک قیمتی شعر" ہے، وہ قیمتی شعر جو کتاب مذکور کے صفحہ ۱۹۵ پر ٹکڑے ٹکڑے کرکے تحریر ہوا ہے، یہ ہے:

ہیچ مادر کس نزاید زیر چرخ چنبری
بادشاہے چوں جلال الدین گدا چوں انوری

جیسا کہ ظاہری الفاظ سے متبادر ہے، ممدوح جلال الدین اکبر اور مصنف انوری ہیں، لیکن واقعتاً تو اس شعر کے مصنف حکیم اوحد الدین انوری ہیں اور یہ ممدوح جلال الدین اکبر!

مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ مضمون مذکور کے بعض اقتباسات نقل کردئے جائیں، تاکہ ناظرین اندازہ کرسکیں کہ فاضل مضمون نگار نے، مضمون مذکور کو تاریخی جامہ پہنانے کی کس درجہ کوشش کی ہے مضمون کی ابتدا لائق مقالہ نگار ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

"یہ اُس زمانہ کا ذکر ہے، جب ابوالفضل و فیضی و راجہ بیربل کے ایسے لایق اور زندہ دلوں نے اپنے زور بیان اور زور قلم سے، اکبر کے دل پر ایسا سکہ جما رکھا تھا، کہ کسی دوسرے کی دربار شاہی میں دال بھی نہ گلتی تھی، یہ ایک مشہور بات ہے کہ اگر کوئی شاعر آیا اور اُس نے بادشاہ کو قصیدہ سنایا اور اس دوران میں، ابوالفضل یا فیضی نے قصیدہ کا بیشتر حصہ ذہن میں ایسے رکھ لیا کہ بعد قصیدہ ختم ہونے کے بادشاہ کو دوبارہ وہیں سنا دیا، اور یہ کہا کہ یہ قصیدہ تو میں نے کہا تھا"

مسٹر چغتائی اس واقعہ کو مشہور بات کہتے ہیں، ممکن ہے کہ یہ شہرت اُن کے کانوں تک پہونچی ہو، لیکن صفحات تاریخ اس شہرت سے معرّا ہیں۔ آگے چل کر ابوالفضل کی تعریف ان الفاظ میں ملاحظہ ہو:

"ابوالفضل کی خداداد ذہانت اور قابلیت نے اس کو بیک وقت ہندوستان کا ملک الشعراء اور فردوسی و سعدی بنا دیا تھا وہ شاعر تھا، عالم تھا، ناصح تھا، فلاسفر تھا اور ساتھ ہی درباری رسوخ کی کنجی بھی تھا"

حیرت ہوتی ہے کہ فاضل مقالہ نگار کے قلم سے یہ الفاظ کیونکر تحریر ہوئے، ابوالفضل کی غیر معمولی قابلیت سے کون انکار کرسکتا ہے، اپنے عہد میں نثاری کا وہ بادشاہ تھا اور عدیم النظیر لیکن اُس کا ملک الشعراء ہونا اور فردوسی و سعدی کا ہم پلہ ہونا درست نہیں اب فاضل مقالہ نگار ابوالفضل کی جانب سے روگردانی فرما کر، انوری کی جانب ان الفاظ میں اپنی توجہ مبذول فرماتے ہیں:

"ادہر تو فارسی شاعری میں ابوالفضل کی شہرت زوروں پر تھی، اور اُدہر ایران میں انوری کی شاعری کی دھوم تھی۔ انوری کا زور پکار کر اہلِ ہند اور اہلِ فارس سے کہتا کہ کجا علی کا پسینہ اور کجا گلاب کی بو، کہاں اہلِ زبان انوری اور کہاں بیچارہ ابوالفضل ناگور علاقہ مارواڑ کا رہنے والا، چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔"

مسٹر چغتائی کیا کہنا، ابھی تو ابوالفضل عرش کے تارے تھے اور اب ناگوری اور مارواڑی ہو گئے، کیا اس سے بڑھکر ابوالفضل کی ہجو ہو سکتی ہے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ نہ اُس تعریف میں کوئی اصلیت تھی اور نہ اس ہجو میں کوئی مغز۔ خلاصہ یہ کہ بقول فاضل مقالہ نگار، اکبر کی قدر دانی کے شہرہ نے انوری کو ایران میں بےچین کر دیا اور ہندوستان آئے اور دربارِ اکبری میں پہنچکر قصیدہ سنانے کی دل میں ٹھان لی، جب آگرہ پہونچا تو اُس کا مرقع مسٹر چغتائی ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

" ان تمام امور پر غور کر کے انوری نے ایک نئی راہ نکالی، وہ ایک دیوانہ صورت گداگر بن گیا اب یہ اس کی قابلیت تھی کہ اس نے کسی نہ کسی طرح "توکیستی" کی چڑھ بنا لی یعنی تو کون ہے، کوئی پوچھتا تو انوری اُس کی جان کو آجاتا۔ ۔ ۔ شدہ شدہ ابوالفضل کے کان میں بھنک پہونچی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ابوالفضل پالکی میں سوار دربارِ شاہی کو جا رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ دیکھا کہ "توکیستی" والا دیوانہ لوگوں کے لئے باعثِ تفریح بنا ہوا ہے، ابوالفضل نے پالکی رکھوائی اور پوچھا "توکیستی" ابوالفضل کے جواب میں انوری نے کہا "توکیستی" ابوالفضل نے جواب دیا "من شاعرم"۔ انوری نے جواب دیا "من ماعرم" انوری "شاعر گرامی گویند" ابوالفضل "ہر کہ شعر می گوید" ابوالفضل "ماعر کرا می گویند" انوری "ہر کہ معر می گوید اور اماعری گویند"۔ ۔ ۔ ۔ ابوالفضل نے سوچا کہ اسی دیوانے کو بطور تحفہ بادشاہ کے سامنے پیش کیا جائے، چلنے کا حکم دیا اور دربارِ اکبری پہونچا"

مضمون کو طوالت سے بچانے کے لئے میں اُن مناظر کو جو دربار میں داخل ہونے کے سلسلہ میں مسٹر چغتائی نے پیش کیا ہے ترک کرتا ہوں۔ انوری نے بادشاہ کے اس سوال کے جواب میں کہ "توکیستی" متذکرہ صدر شعر کا پہلا مصرعہ اپنے خاص انداز میں پڑھکر چند دقیقہ خاموشی اختیار کی اور جب لوگوں کو مشتاق دیکھ لیا تو پہلا مصرعہ پھر دہرایا اور اُس کے ساتھ مصرعہ دوم کا رکنِ اول یعنی "بادشاہے چوں جلال الدین" کہکر پھر خاموش ہو گیا۔ اکبر اپنا نام سنکر دل میں خوش ہوا، لیکن اُس سے زیادہ مصرعہ پورا ہونے کا مشتاق تھا، جب انوری نے اندازہ کر لیا کہ اب پورا دربار ہمہ تن گوش ہے تو کڑک کر پورا شعر

ہیچ مادر کس نزاید زیر چرخ چنبری
بادشاہے چوں جلال الدین، گدا چوں انوری

پڑھ دیا، شعر ختم ہوا اور پورا دربار انگشت حیرت بدنداں تھا، کہ کجا ایران اور کجا ہندوستان اور پھر دارالسلطنت آگرہ اور کجا انوری، بہرحال بادشاہ نے قصیدہ پورا کرنے کا حکم دیا، اور انوری جب قصیدہ ختم کر چکے، تو مضمون مذکور کے یہ الفاظ قابلِ تحریر ہیں:

"اُدھر انوری کے منھ میں سچے موتی بھر رہے تھے، اور اِدھر بادشاہ جھوم جھوم کر اس کا شعر پڑھ رہا تھا"

۔ ۔ ۔ چنانچہ اس کے بعد انوری نے بڑے زوروں کے ساتھ اپنا قصیدہ پورا کا پورا سنایا اور بے طرح خراجِ تحسین وصول کیا"

اب آئیے تاریخی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر نگاہ ڈالیں۔ شاہنشاہ جلال الدین اکبر کے تفصیلی حالات تحریر کرنے کی نہ تو اس مختصر مقالہ میں گنجائش اور نہ ضرورت، وہ ہمایوں کا فرزند اور بابر کا پوتا تھا اور امیر تیمور صاحبقران کی نسل سے تھا۔ سنہ ۹۴۹ھ میں پیدا ہوا، ۱۴ برس کے سن میں تخت نشین ہوا اور ۲۲ جمادی الآخر سنہ ۱۰۱۴ھ کو وفات پائی۔ موضوع زیر بحث سامنے لئے

صرف انھیں سنین کا ذہن نشین رہنا کافی ہے۔

حکیم انوری کے حالات کسی حد تک تفصیل کے ساتھ تحریر کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ اُن کے حالات ہندوستان میں کم شہرت رکھتے ہیں۔ اوحدالدین نام، انوری تخلص، مقام ابیورد جو کہ دشت خاوراں میں شامل تھا جائے ولادت، ابتدا میں وطن اور مولد کی مناسبت سے "خاوری" تخلص کرتے، لیکن بعد کو اپنے اُستاد عماد کی فرمائش سے، "انوری" ہو گئے تاہم خاوراں کی روشنی انوری میں بھی موجود ہے، وہ حکیم خردمند، اور شاعر صاحب پایہ بلند تھے، فن نظم میں، اپنے دور میں بیعدیل تصور کئے جاتے، صاحب آتشکدہ آذر آقا لطف علی قمی، انوری کا تذکرہ الفاظ ذیل میں فرماتے ہیں:

"بزعم فقیر از عہد دولت آل سامان، کہ اُستاد رودکی قانون شاعری ساز کردہ، اے آلان کہ یکہزار و یکصد و ہشتاد ہجری است چہار کس گوئے فصاحت از ہمگنان ربودہ، و ہر یک بمفتاح زبان، قفل از گنجینہ سخنوری کشودہ و دریں مدت مدید کسے نیامدہ کہ لاف برابری با ایشاں بزند اول حکیم ابوالقاسم فردوسی، دوم شیخ نظامی گنجوی، سوم شیخ المشارق والمغارب مصلح الدین شیخ سعدی شیرازی، و میاں انوری و ظہیر فاریابی قطعات گفتہ اند، بزعم فقیر ایں مقولہ سوالات از تاثیر ورق الخیال است والا باندک ربطے ایں تشکیک خارج از دائرۂ انصاف است غرض حکیم انوری یکے از ارکان اربعہ بنیان نظم است و در قصیدہ گوئی دولتش بیش از بیش"

صاحب تذکرہ دولت شاہ سمرقندی کا بیان ہے، کہ حکیم انوری نے مدرسۂ منصوریہ شہر طوس میں حاصل کی اور بالآخر جواہر علم و کمال سے آراستہ و پیراستہ ہوئے۔ باوجود علم و فضل تنگدستی اور عسرت سے سابقہ رہتا، ایک روز کا ذکر ہے کہ ملک الشعراء ابوالفرج سنجری کا ورود بمقام زاکان ہوا جو کہ قریب مشہد مقدس امام رضا ہے۔ ملک الشعراء کا حشم و خدم اور تجمل و اجلال دیکھ کر حکیم انوری کو رشک دامنگیر ہوا۔ دل میں کہا کہ ملک الشعراء کی میرے مقابلہ میں حقیقت ہی کیا ہے، میں تو شاعری کو دون مرتبت خیال کرتا ہوں، اب اس فلاکت اور عسرت سے چھٹکارا اسی صورت میں نظر آتا ہے، کہ علم و فضل کے عمامہ کو تہ کر کے، شاعری کی دستار باندھی جائے، اُسی وقت اپنے خیال کو عملی جامہ پہنایا۔ سرشام بیٹھ گئے، رات بھر میں سلطان سنجر کی مدح میں پورا قصیدہ کہہ ڈالا جس کا مطلع یہ ہے:

گر دل و دست بحر و کاں باشد   دست دست خدائگاں باشد

پچاس شعر کا قصیدہ ہے، اور انوری کے معرکۃ الآرا قصائد میں اُس کا شمار ہے، صبحکو دربار پہونچے سلطان سنجر سن کر بہت خوش ہوئے، انعام و صلہ سے مالامال کئے گئے اور عسرت و فلاکت، عشرت و بہبود سے مبدل ہو گئی اور شعراء دربار میں باعزت و احترام داخل کر لئے گئے۔

حکیم انوری علوم متعارفہ میں دستگاہ و کمال رکھنے کے علاوہ علم نجوم میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، اور استخراج احکام بالکل صحیح کرتے، سلطان طغرل شاہ سلجوقی کے عہد دولت میں ایک مرتبہ کواکب سبعہ کا قران برج میزان میں ہوا، جو کہ برج ہوائی ہے، چنانچہ حکیم انوری نے حکم لگایا، کہ فلاں تاریخ شدید ترین طوفان آئے گا اور اس کی تائید میں بیان کیا کہ بعینہٖ اسی طرح اجتماع کواکب برج آبی میں بعہد نوح پیغمبر ہوا تھا، جس کا نتیجہ و اثر بذریعہ طوفان نوح کے ظاہر ہوا، انوری کا یہ قول سنکر لوگ بہت گھبرائے اور سخت مشوش اور پریشان ہوئے، شب موعود ایک شخص نے ایک بلند مینار پر چراغ روشن کیا، خدا کی قدرت کہ اُس شب ہوا میں اتنی بھی حرکت نہیں پیدا ہوئی کہ مینار کا چراغ ہی گل ہو جاتا، دوسرے روز بادشاہ اور ارکین دولت

نے انوری کو بیحد ذلیل وخفیف کیا اور انوری کی ندامت اور شرمندگی کی کوئی حد و انتہا نہ تھی۔ چنانچہ ادیب صابر نے اس قطعہ کے ذریعہ سے انوری کا رنگ زرد کر دیا؛

گفت انوری کہ از اثر بادہائے سخت ویراں شود سراچہ وکاخ سکندری
در روز حکم او نوزید است ہیچ باد، یا مرسل الریاح تو دانی و انوری

اب اسے خواہ انکی مجبوری اور لاچاری پر اشک فشانی کہو یا ادیب صابر کے قطعہ کا جواب بہرحال انوری کو بھی جائے دم زدن نہ رہی اور یہ قطعہ کہا اور اپنی ذمہ داری، اللہ میاں کے سپرد کر دی۔

میگفت انوری کہ دریں سال بادہا چنداں وزد کہ کوہ بجنبد توانگری
بگذشت سال و برگ نجنبید از درخت یا مرسل الریاح تو دانی نہ انوری

خلاصہ کلام انوری کو اس واقعہ کے بعد خراسان سے بھاگنا پڑا اور شہر بلخ کو جائے امن تصور کر کے قاضی حمید الدین کی حفظ و حمایت میں داخل ہوئے، قاضی صاحب کی جانب سے انوری کی حمایت اور ضیافت میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں ہوا، تاہم ایک روز قاضی صاحب کی لاعلمی میں انوری صاحب شکنجہ میں کھینچ دئے گئے اور تختہ کلاہ کئے گئے۔

انوری کو بلخ میں بھی چین سے رہنا نصیب نہیں ہوا، ایک طرف تو تختہ کلاہ ہونے سے جسمانی اذیت اٹھانی پڑی دوسری جانب، ان کے دشمنوں نے سلطان فیروز شاہ فرمانروائے بلخ سے یہ چغلی کھائی کہ انوری نے شہر بلخ کی ہجو کہی ہے اس کی صفائی میں انوری کو بہت کد و کاوش کرنا پڑی، اپنی صفائی اور بلخ کی مدح سرائی میں ایک بہت طویل اور معرکۃ الآرا قصیدہ لکھنا پڑا، جس کا ذکر آیندہ آئے گا۔

اس مقام تک بقدر ضرورت حکیم انوری کے حالات تحریر کئے گئے، اب ضروری واقعہ جس کی توضیح کرنا ہے یہ ہے کہ حکیم انوری نے کن کن بادشاہوں کا دور پایا، اور عہد دیکھا، اس کے متعلق خود اُن کا کلام بہترین شاہد ہے، خراسان میں اُن کی شاعری کی ابتدا سلطان سنجر کے عہد سے ہوتی ہے، سلطان طغرل شاہ سلجوقی کے عہد میں طوفان ہوا کا آیا اور اسے بلخ بھاگنا پڑا، وہاں سلطان مجد الدین و طغرل تکین اور امرار دربار کی مدح سرائی کرتے رہے، اور وہیں راہی ملک عدم ہو گئے سنہ وفات کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے، صاحب تذکرہ دولت شاہ سمرقندی سنہ وفات ۵۴۷ھ تحریر کر کے خود ہی اُس کی تردید کرتے ہیں کہ واقعہ طوفان ہوا، اس کے بہت بعد ۵۸۲ھ میں واقع ہوا تھا سلطان طغرل سلجوقی کا عہد تھا، جو کہ بہرحال انوری کی زندگی ہی میں ہو سکتا تھا۔

صاحب تذکرہ آتشکدہ کے الفاظ انوری کی وفات کے متعلق یہ ہیں، "وحکیم در ۵۶۵ھ در بلخ وفات یافتہ"

کاتب سطور کی نظر مطالعہ کلیات انوری کے سلسلہ میں ایک مدحیہ قطعہ پر پڑی جس کا مطلع ہے:

اے نمودار سپہر لاجورد گشتہ ایمن چوں سپہر از گرم وسرد

یہ قطعہ سلطان وقت کی مدح میں ہے اور آخر شعر میں مادۂ تاریخ بھی پیدا کیا گیا ہے۔ آخر شعر یہ ہے:

بردہ در نرد فرح نقشش بکام تا فرح تاریخ این "نقش" است و "نرد"

اعداد الفاظ نقش و نرد سے تاریخ پیدا ہوتی ہے، نقش کے ۴۵۰ و نرد کے ۲۶۰ عدد ہوتے ہیں جن دونوں کو جمع کرنے سے

۴۰۷ ہوتے ہیں، جس کے معنی یہ ہوں گے کہ انوری ۷۰۴ھ تک بقید حیات تھے -

بہرحال انوری کی وفات بقول صاحب تذکرہ دولت شاہ سمرقندی اگر ۵۴۷ھ میں واقع نہیں ہوئی تو بنا بر بیان آثار لطف علی قمی ۵۸۵ھ میں واقع ہونا صحیح ہوگا، یا بسبیل تنزل قطعہ تاریخ متذکرہ صدر کی بنا پر ۷۰۴ھ کے کچھ بعد مان لیجائے ہر حالت میں شاہنشاہ اکبر کی ولادت سے دو ڈھائی سو برس قبل حکیم انوری کی وفات بمقام بلخ ہو چکی تھی، لہذا مابین ۹۹۰ھ و ۱۰۱۱ھ حکیم انوری کا آگرہ پہونچکر دربار شاہنشاہ ہندوستان میں قصیدہ پڑھنا اُن کا "سچے موتیوں" سے منھ بھرا جانا اور "بے طرح خراج تحسین وصول کرنا" سمجھ میں نہیں آتا - کیونکہ انوری کے دور میں اکبر کے مورث اعلیٰ امیر تیمور صاحبقران بھی پیدا نہیں ہوئے تھے -

اس درجہ معلومات بہم پہونچانے کے بعد میں نے شعر مابہ النزاع کی تلاش کلیات حکیم انوری میں اس خیال سے کی کہ شاید کوئی بادشاہ جلال الدین نام کا اُس دور میں رہا ہو، اور حکیم انوری نے اُس کی مدح میں قصیدہ کہا ہو لیکن ناکام رہا -

آخر میں مجھے یہ خلش ہوئی، کہ ممکن ہے دور اکبر اعظم میں کوئی اور مشہور شاعر انوری تخلص رکھنے والا پایا جاتا ہو اور اُس نے یہ قیمتی شعر تصنیف کرکے دربار اکبری میں سنایا ہو، لیکن میں اس میں بھی کامیاب نہ ہوا -

شیخ علی حسن (لکھیم پور)

پیغمبروں کے لطائف

مدعیان نبوت تین طرح کے ہوئے ہیں، ایک وہ جو واقعی ملک و قوم کی اصلاح کا جذبہ اپنے اندر رکھتے تھے اور باوجود موانع کے انھوں نے اپنے مشن کی تبلیغ کی اور آخرکار وہ کسی نہ کسی طرح اس میں کامیاب ہوئے۔
دوسری قسم ان لوگوں کی جنھوں نے صرف اس لئے دعوائے نبوت کیا کہ وہ دنیاوی جاہ و حشم اور دولت و ثروت کے خواہشمند تھے اور اپنی قوم یا قبیلہ میں خاص مرتبہ رکھنے کی وجہ سے انھوں نے کچھ دن نبوت کا بھی مزہ اُٹھا لیا، تیسری قسم ان مدعیان نبوت کی تھی جو محض لطف و تمسخر کی بنا پر نبی بن بیٹھے اور ان کی نبوت ایک لطیفہ بن کر رہ گئی۔
قسم اول کے انبیاء کا ذکر اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے اور نہ اس میں کسی لطایف کا گزر، قسم دوم میں طلیحہ، اسود عنسی کے علاوہ مسیلمہ اور سجاح بنت حارث نے کافی شہرت حاصل کی اور اس کا سبب زیادہ تر یہ تھا کہ ان دونوں نے ایک ہی وقت میں نبوت کا دعوے کیا اور بالآخر دونوں کی مراسلت پر یہ کھیل ختم ہو گیا۔
مردوں میں تو خیر متعدد نام ایسے گنائے جا سکتے ہیں، جو نبوت کی نسبت سے مشہور ہوئے، لیکن عورتوں میں غالباً ایک سجاح ہی ایسی تھی جس نے نبیہ ہونے کا دعویٰ کیا اور آخر عمر میں اسلام لائی۔
تیسری قسم انبیاء کی بہت پُرلطف تھی، اور انھیں کے لطایف آج ہم بیان کرتے ہیں جو مولانا اثر کے ایک مقالہ سے لئے گئے ہیں۔

دور عباسیہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اسلامی حکومت کا بڑا عجیب و غریب زمانہ تھا۔ علم و فضل اور تہذیب و شائستگی کا کوئی پہلو اور جاہ و امارت کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جو انتہائی عروج تک نہ پہونچا ہو۔ اور جب کسی قوم کا تمدن اتنا وسیع و بلند ہو جاتا ہے تو اس میں اُپچ کی بھی کمی نہیں ہوتی، چنانچہ ایک خاص اُپچ لوگوں میں یہ بھی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ نبوت کا دعوے کر کے ملک میں مشہور ہو جائیں اور اس طرح دربار عباسیہ تک ان کی رسائی ہو جائے۔

مامون رشید کا زمانہ ہے اور ایک نہ دو، اکٹھے دس مدعیان نبوت شاہی حراست میں قصر شاہی تک جا رہے ہیں۔ راستہ میں تماشائیوں کا ہجوم ہے اور بہت کم لوگ واقف ہیں کہ یہ اچھے خاصے مہذب و شائستہ پڑھے لکھے انسان شاہی باڈی گارڈ کے ساتھ کہاں اور کیوں جا رہے ہیں۔
انھیں تماشائیوں میں سے ایک شخص یہ سمجھ کر کہ شاید یہ لوگ دعوت میں جا رہے ہیں خود بھی ان میں غول میں شریک ہو گیا، مامون الرشید کے سامنے جب یہ لوگ پیش کئے گئے اور دروازہ کا شاہی دروازہ بند ہوا تو یہ کہ یہ دس کے گیارہ نکلے۔ مامون نے سب کو

حیرت ہوئی لیکن کوئی زیادہ کاوش اس باب میں نہ کی گئی اور ان سب کے قتل کا حکم صادر کیا گیا۔
اب یہ شخص بہت گھبرایا اور بولا کہ "آپ مجھے کیوں قتل کرتے ہیں"۔ ماموں نے پوچھا "کیوں، کیا تم نے نبوت کا دعوےٰ نہیں کیا"۔ وہ بولا "اجی، کہاں کی نبوت، اور کیسی رسالت، میں تو یہ سمجھ کے ان کے ساتھ ہولیا تھا کہ کہیں دعوت میں جارہے ہیں، مجھے دعوائے نبوت سے کیا واسطہ" یہ سنکر ماموں ہنستے ہنستے بیتاب ہوگیا۔

خلیفہ مہدی عباسی کے زمانہ میں ایک شخص نے نبوت کا دعوےٰ کیا اور جب گرفتار ہوکر خلیفہ کے سامنے لایا گیا تو پوچھا گیا "تم نبی ہو"۔ بولا "جی ہاں"۔ پھر سوال کیا گیا کہ "تم کن لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے ہو"۔ بولا کہ "تم نے کسی کے پاس مجھے جانے ہی نہیں دیا، نام لوں، تو کس کا، اُدھر میں نے دعویٰ کیا اور اِدھر تم نے مجھے پکڑ کر قید خانہ بھیجدیا"۔

ایک بار کسی شخص نے بصرہ میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ یہاں کا حاکم اسوقت سلیمان بن علی تھا۔ جب یہ شخص گرفتار ہوکر حاکم بصرہ کے سامنے لایا گیا تو اس سے سلیمان نے پوچھا: "کیا تم خدا کے بھیجے ہوئے پیمبر ہو؟"۔ اس نے جواب دیا: "جی، اس وقت تو قیدی ہوں"

سلیمان: "کمبخت تجھے کس نے نبی بنایا"

——: "کیا پیمبروں سے ایسی ہی گفتگو کی جاتی ہے، کیا کروں مجبور ہوں کہ اس وقت قید میں ہوں، ورنہ جبرئیل کو حکم دیتا کہ تم سب کو ہلاک کرڈالیں"

سلیمان: "کیا قیدی کی دعا قبول نہیں ہوتی"

——: "جی اور کیا، خصوصاً انبیا کی دعا تو قید کی حالت میں اوپر جاتی ہی نہیں"

سلیمان نے ہنسکر کہا: "اچھا میں تمھیں چھوڑے دیتا ہوں، آزاد ہونے کے بعد جبرئیل کو حکم دو اور اگر انھوں نے تمھارا حکم مان لیا تو ہم سب تم پر ایمان لے آئیں گے"۔ وہ یہ سُنکر بولا:۔ "خدا سچ فرماتا ہے فلایومنوا حتیٰ یروا العذاب الالیم" (یعنی جب تک عذاب کو دیکھ نہ لیں گے ایمان نہ لائیں گے)

سلیمان یہ جواب سنکر ہنس پڑا اور اسے چھوڑ دیا۔

ماموں الرشید کے زمانہ میں ایک اور شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ یہ اپنے آپ کو ابراہیم خلیل اللہ کہتا تھا۔ جب یہ گرفتار ہوکر سامنے لایا گیا تو ثمامہ بن اشرس نے کہا اگر اجازت ہو تو میں اس شخص سے گفتگو کروں۔ ماموں نے اجازت دی۔

ثمامہ: "تم اپنے آپ کو ابراہیم خلیل اللہ کہتے ہو، لیکن اُن کے پاس تو نبوت کی دلیلیں تھیں، تمھارے پاس کونسی دلیل ہے"

——: "ابراہیم کے پاس کونسی دلیلیں تھیں"

ثمامہ: "وہ آگ میں ڈالے گئے اور آگ انھیں نہ جلا سکی، ہم تمھارے لئے بھی آگ روشن کراتے ہیں اور اس میں تمھیں ڈالتے ہیں اگر تم نہ جلے تو بیشک یہ تمھاری نبوت کی دلیل ہوگی"

یہ سنکر وہ بولا کہ " یہ تو بہت مشکل ہے، کوئی اور آسان صورت تجویز کرو"

ثمامہ: " اچھا تو پھر کوئی ویسی ہی دلیل پیش کرو جیسی حضرت موسیٰ نے پیش کی تھی"

اس نے پوچھا: " موسیٰ کے دلایل کیا تھے"۔ ثمامہ نے جواب دیا کہ " ان کے پاس ایک عصا تھا جو زمین پر ڈالنے سے اژدہا بن جاتا تھا" یہ سنکر بولا کہ " یہ بھی مشکل ہے، اس سے زیادہ کوئی آسان صورت بتاؤ"

ثمامہ: " تو پھر حضرت عیسیٰ کی سی نشانی پیش کرو"

اس نے پوچھا ان کی نشانیاں کیا تھیں۔

ثمامہ: " وہ اندھوں کوڑھیوں کو اچھا کر دیتے تھے اور مردہ کو زندہ"

یہ سنکر وہ بولا کہ " واہ، یہ تو اور زیادہ مشکل بات ہے، میں آسان صورتیں پوچھتا ہوں اور تم انھیں اور زیادہ مشکل کرتے جاتے ہو"

ثمامہ: " تو پھر تمھیں کوئی صورت بتاؤ، تم نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، تو کوئی ثبوت دینا ہی پڑے گا"

اس نے کہا: " میرے پاس کوئی ثبوت نہیں، میں نے جبرئیل سے پہلے ہی کہدیا تھا کہ مجھے شیطانوں کے پاس بھیجتے ہو تو کوئی دلیل بھی دو، لیکن وہ اس پر بگڑ گئے، بہر حال میں مجبور ہوں، اس لئے اگر بغیر کسی دلیل کے مجھے نبی مانتے ہو تو مانو، ورنہ جانے دو، جھگڑا ہی کیا ہے ؟"

خلیفہ مہدی ہنس پڑا اور اسے رہا کر دیا۔

خلیفہ مہدی کے پاس ایک اور شخص اسی طرح کالا یا گیا۔ مہدی نے پوچھا: " تم کب مبعوث ہوئے"۔ بولا۔ " آپ کو اس سے کیا بحث کہ میں کب مبعوث ہوا۔ کیا نبوت تاریخ کی پابند ہوتی ہے"

مہدی نے پھر سوال کیا کہ " تمھیں کہاں نبوت ملی"۔ بولا: " خدا کی قسم یہاں تو ایسی باتیں پوچھی جا رہی ہیں، جن کا نبوت سے کوئی تعلق ہی نہیں، سنئے، اگر آپ میری نبوت مانتے ہیں، تو مانئے ورنہ اپنے گھر خوش رہئے۔ یہ میں چلا"

ایک دن عبداللہ بن حازم، دجلہ کے پل کے پاس اپنے احباب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ لوگ ایک شخص کو پکڑ کر لائے اور کہا کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔

عبداللہ نے پوچھا " تم پیغمبر ہو" بولا " جی ہاں" پوچھا " کس قوم پر مبعوث ہوئے ہو" بولا " کسی پر ہوا ہوں تمھیں کیا، میں شیطان پر مبعوث ہوا ہوں"۔ یہ سنکر عبداللہ ہنس پڑے اور کہا کہ " اسے چھوڑ دو، شیطان کے پاس جائے"

ثمامہ بن اشرس کہتے ہیں کہ میں قید میں تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک مہذب و شایستہ انسان قید خانے میں لایا گیا، اس وقت میرے ہاتھ میں شربت کا پیالہ تھا، اسے دیکھ کر میں اس قدر متحیر ہوا کہ پیالہ منہ سے لگانا بھول گیا اور اس سے پوچھا: " آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں، آپ کو کس جرم میں مقید کیا گیا ہے"

بولا۔ " یہ بد معاش مجھے پکڑ لائے ہیں اور محض اس قصور پر کہ میں نے سچی بات ظاہر کی، میں نبی مرسل ہوں"

یہ سنکر وہ متعجب ہوا اور بولا "کوئی معجزہ بھی آپ کے پاس ہے" - اس نے جواب دیا کہ "جی ہاں، میرے پاس سب سے بڑا معجزہ ہے" پوچھا "کیا" بولا کہ "کسی حسین عورت کو لاؤ، دیکھو ابھی حاملہ کرادوں گا اور اس سے ایک بچہ پیدا ہوگا جو میری نبوت کی تصدیق کرے گا"

ثمامہ یہ سنکر مشکل سے ہنسی ضبط کرسکے اور کہا "صلی اللہ علیک" اور پیالہ پیش کرکے کہا: "لیجئے اسے نوش فرمائیے"

محمد بن عتاب کا بیان ہے کہ میں نے ہارون الرشید کے زمانہ میں ایک روز شہر رقہ میں دیکھا کہ لوگ ایک شخص کو گھیرے ہوئے ہیں جو صورت سے بہت مہذب معلوم ہوتا تھا، پوچھا "اسے کیوں گھیرے ہوئے ہو" لوگوں نے کہا "یہ پیغمبری کا دعوے کرتا ہے" میں نے کہا "تم غلط کہتے ہو، ایسے شخص سے ایسا فعل سرزد نہیں ہوسکتا" - یہ سنکر اس نے بگڑکر مجھ سے کہا:- "تمھیں کیونکر معلوم ہوا کہ یہ لوگ غلط کہتے ہیں" میں نے کہا "تو کیا تم نبی ہو" بولا "بیشک" میں نے کہا "اس کی دلیل؟" بولا "دلیل یہ ہے کہ تم ولدالزنا ہو" میں نے ضبط کرکے کہا کہ "بھلا پاکدامن عورتوں پر زنا کا اتہام لگانا پیغمبروں کا کام ہے؟" بولا "میں تو اسی غرض سے مبعوث ہوا ہوں" - میں نے کہا "تو مجھے تمھاری نبوت سے انکار ہے" بولا - "انکار ہے تو اپنے گھر خوش رہو" اتنے میں کسی نے اسے چند سنگریزے کھینچ مارے جس سے وہ زخمی ہوگیا اور بولا "یہ فعل خاص ابن زانیہ کا ہے" اور آسمان کی طرف سر اٹھاکر کہنے لگا - "تم نے اچھا: کیا جو ان جاہلوں کے ہاتھوں میں مجھے مبتلا کردیا"

مامون کے زمانہ میں ایک اور شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا - مامون نے قاضی یحیٰی بن اکثم کو ساتھ لیا اور کہا "چلو اس شخص سے چھپ کر ملیں اور دیکھیں کیا کہتا ہے -

چنانچہ دونوں بھیس بدل کر اس کے پاس پہونچے اور کہا کہ "ہم دونوں اس لئے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ کے ہاتھ پر ایمان لائیں" اس نے کہا "تو آؤ بیٹھو" - اجازت پاکر مامون اس کے داہنے ہاتھ اور قاضی یحیٰی بائیں ہاتھ بیٹھ گئے -

مامون نے پوچھا "آپ کن لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے ہیں؟" بولا - "ساری دنیا کے لئے" - پوچھا: "تو کیا آپ پر وحی نازل ہوتی ہے، یا القا ہوتا ہے، یا فرشتہ آکر آپ سے گفتگو کرتا ہے" - بولا - "فرشتہ گفتگو کرتا ہے" پوچھا "کون فرشتہ آتا ہے" - بولا: "جبرئیل" - پوچھا "اس سے پہلے کب آئے تھے" - کہا: "ابھی ابھی تمھارے آنے سے پہلے وہ موجود تھے" پوچھا "تو تم پر اس وقت کیا وحی آئی" بولا "یہی کہ عنقریب میرے پاس دو شخص آئیں گے ایک میرے داہنے طرف بیٹھے گا، دوسرا بائیں طرف اور جو بائیں ہاتھ بیٹھے گا وہ دنیا کا سب سے بڑا لوطی ہوگا" (قاضی صاحب اس باب میں بدنام تھے) مامون یہ سنکر ہنسی ضبط نہ کرسکا اور کہا "اشہد انک رسول اللہ" (میں تمھاری رسالت پر ایمان لاتا ہوں)

کوفہ کے ایک شخص کا بیان ہے کہ ایک دن میرے ایک دوست آئے اور کہا "تم نے کچھ اور بھی سنا، یہاں ایک پیغمبر صاحب پیدا ہوئے ہیں، چلو ذرا ان سے ملکے دیکھیں، وہ کیا کہتے ہیں" - میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور ہم دونوں اس

نبی کے مکان پر پہونچے۔ یہ ایک نہایت ہی بدصورت خراسانی بڈھا تھا اور بھینگا بھی تھا، میرے دوست کانے تھے، انھوں نے کہا تم "چپ رہو، میں گفتگو کرتا ہوں"۔ میں نے کہا "بہتر" اب اس سے ان دوست نے پوچھا "جناب کا کیا دعوے ہے"، بولا۔ "میں نبی ہوں"۔ پوچھا "دلیل"۔ بولا۔ "دلیل یہ کہ تم کانے ہو، اگر اپنی دوسری آنکھ نکال کے اندھے ہو جاؤ، تو میں اسی وقت دعا کر کے تمھیں اچھا کر دوں گا"۔

میں نے ہنسی روک کر کہا کہ "پیغمبر صاحب آپ نے بات معقول کہی، لیکن یہ مانے گا نہیں"۔ میرے دوست نے مجھ سے کہا۔ "تو تمھیں اپنی آنکھیں پھوڑ کے کیوں نہیں امتحان لیتے"

اس کے بعد ہم دونوں ہنستے ہوئے گھر چلے آئے۔

ایک بار مامون کے پاس کسی مدعی نبوت کو پیش کیا گیا، پوچھا "تمھارے پاس کوئی معجزہ بھی ہے"۔ بولا۔ جی ہاں، میں آپ کے دل کی بات بتا سکتا ہوں"۔ مامون نے کہا "اچھا بتاؤ، اس وقت میرے دل میں کیا ہے" بولا "اس وقت آپ کے دل میں ہے کہ یہ شخص بڑا جھوٹا ہے"

مامون نے کہا "یہ تو تم نے سچ بتایا" اور اسے قید خانہ بھیج دیا۔ چند روز بعد پھر بلوایا اور پوچھا "اس درمیان میں کوئی وحی تم پر نازل ہوئی یا نہیں"۔ بولا۔ "نہیں"۔ پوچھا۔ "کیوں" کہا "اس لئے کہ قید خانے میں فرشتے نہیں آتے"۔ مامون ہنس پڑا اور اسے چھوڑ دیا۔

مامون کے پاس آذربیجان سے ایک مدعی نبوت گرفتار کر کے لایا گیا۔ مامون نے اپنے محل کے داروغہ ثمامہ کو حکم دیا کہ اس سے باتیں کرے۔

ثمامہ نے پوچھا کہ "تمھاری نبوت کی کیا دلیل ہے"۔ بولا "تم اپنی جورو کو میرے پاس بھیج دو، اس سے ایک بچہ پیدا ہوگا جو گہوارہ ہی میں میری نبوت کی تصدیق کرے گا"

ثمامہ نے کہا "جناب میں بغیر کسی دلیل کے آپ کو نبی مانتا ہوں، اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد انک رسول اللہ" مامون نے کہا۔ "تم تو چھوٹتے ہی ایمان لے آئے" ثمامہ نے عرض کیا "امیرالمومنین کا تو کچھ بگڑے گا نہیں، اور میں بے آبرو ہو جاؤں گا، جسے اپنی بیوی سے دست بردار ہونا ہو، وہ ان کی نبوت میں شک کرے"

مامون ہنس پڑا اور اسے چھوڑ دیا۔

ایک بار ہارون الرشید کے ایک مدعی نبوت پیش کیا گیا۔ رشید نے پوچھا تو بولا "جی ہاں، میں نبی کریم ہوں"۔ پوچھا "دلیل"۔ بولا "آپ جو فرمائیں"

رشید نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ یہاں جتنے بے ریش و بروت غلام کھڑے ہیں، ان سب کے اسی وقت داڑھیاں نکل آئیں"۔ جواب دیا "بھلا، اس میں کیا خوبی ہے کہ ان کے خوبصورت چہرے داڑھی نکال کے خراب کئے جائیں،

ہاں یہ معجزہ دکھا سکتا ہوں کہ یہاں جتنے داڑھی والے اس وقت موجود ہیں، ان سب کی داڑھیاں غائب کر دوں"
یہ سنکر رشید بہت ہنسا اور اُسے انعام دیکر رخصت کر دیا۔

ایک اور مدعی نبوت کو ماموں کے سامنے لایا گیا اور جب اس سے معجزہ طلب کیا گیا تو کہا "میں سنگریزے پانی میں ڈالتا ہوں، اگر گھل جائیں تو جانئے میں سچا نبی ہوں"
ماموں نے کہا "منظور" ـ اس نے ایک کٹورے میں پانی بھر کر سب کے سامنے سنگریزے ڈالے تو وہ گھل گئے
ماموں نے کہا یہ اصلی سنگریزے نہ تھے، ہم جو سنگریزے دیں، انھیں گھلا دو تو جانیں" ـ بولا ـ "نہ تم فرعون سے بڑے ہو اور نہ میں موسیٰ سے ـ فرعون نے موسیٰ سے کب کہا تھا کہ تمھارے عصا کی سند نہیں، ہم جو عصا دیتے ہیں اسے اژدہا بناؤ تو جانیں"
ماموں اس لطیفہ پر بہت ہنسا اور اسے انعام دیکر رخصت کر دیا۔

خلیفہ معتصم باللہ کے پاس ایک مدعی نبوت گرفتار کرکے لایا گیا۔ خلیفہ نے پوچھا "تم کس کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے ہو"۔ بولا ـ "آپ کی ہدایت کے لئے" معتصم بولا "تو میں گواہی دیتا ہوں کہ تم کمینے اور احمق ہو" بولا ـ جی ہاں، یہ تو قاعدہ ہی ہے کہ جیسے لوگ ہوتے ہیں ویسے ہی پیغمبر ان کے پاس بھیجے جاتے ہیں"
یہ جواب سنکر معتصم ہنس پڑا اور اسے رہا کر دیا۔

ماموں کے پاس ایک مدعی نبوت لایا گیا، تو ماموں نے کہا کہ "اگر تم نبی ہو تو اسی وقت ایک خربوزہ لاکر پیش کرو"
اس نے کہا "تین دن کی مہلت دیجئے"
ماموں نے کہا "مہلت نہ دیجائے گی" بولا ـ "یہ کونسا انصاف ہے کہ خدا تو کم از کم چھ مہینے میں خربوزے پیدا کرتا ہے اور میں اسی وقت پیدا کر دوں"

خلیفہ متوکل کے زمانہ میں ایک عورت پکڑ کر لائی گئی جو پیغمبر ہونے کی مدعی تھی۔
متوکل نے پوچھا ـ "تو نبیہ ہے" بولی "جی ہاں" پوچھا "تو محمد کو بھی رسول مانتی ہے یا نہیں"، بولی "کیوں نہیں"
متوکل نے کہا: "جب تو انھیں مانتی ہے، تو اُن کے اس قول کو بھی مانتی ہوگی کہ لانبیّ بعدی (میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا)"
بولی کہ "میں ان کے ہر قول کو مانتی ہوں، لیکن انھوں نے یہ تو نہیں فرمایا کہ لانبیۃ بعدی (میرے بعد کوئی نبیہ نہ ہوگی)"
متوکل ہنس پڑا اور اسے چھوڑ دیا۔

بلقان پر روس کے آیندہ اثرات

روسی فوجوں کا رومانیا کی سرزمین تک پہونچ جانا، فوجی نقطۂ نظر سے تو خیر اہم واقعہ ہی، لیکن سیاسی حیثیت سے اسکی اہمیت غالباً بہت زیادہ ہے، کیونکہ اگر جرمن اثرات دور ہوکر یہاں روسی اقتدار قایم ہوگیا، تو یہ تاریخ بلقان کا بالکل نیا ورق ہوگا۔

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ یوروپ کے اس مشرقی جنوبی حصہ کے حالات پر پہلے ایک سرسری نظر ڈال لیں۔

جزیرہ نمائے بلقان کی چار حکومتیں (ہنگری، رومانیا، یوگوسلاویا اور بلغاریا) دریائے ڈینوب کی وادی میں واقع ہیں اور پانچویں حکومت یونان، گو جغرافی حیثیت سے ذرا علحدہ واقع ہوئی ہے، تاہم اقتصادی و تمدنی لحاظ سے یہ بھی انھیں چار حکومتوں کی طرح ہے، سوا اس کے کہ یونان کا بڑا حصہ جزایر پر مشتمل ہونے کی وجہ سے یہاں کے لوگ بحری ذوق زیادہ رکھتے ہیں۔

آبادی کے لحاظ سے یہ پانچ ملک دو حصوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں، یعنی ان میں سے دو ملک یونان اور بلغاریا نسبتاً چھوٹے ہیں اور ان کی آبادی ستر ستر لاکھ کے قریب قریب ہے، ان کے بعد ہنگری کا نمبر ہے جس کی آبادی ۹۰ لاکھ ہے اور پھر رومانیا اور یوگوسلاویا دو بڑی حکومتیں ہیں جن کی آبادی ڈیڑھ ڈیڑھ کرور کے قریب ہے۔ لیکن آبادی کی نوعیت کے لحاظ سے یہ سب ایک ہی ہیں۔

اگر آپ موٹر میں بیٹھ کر ان ملکوں کا دورہ کریں تو آپ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ ان سب کی آبادی، اپنی معاشرت و معیشت کے لحاظ سے بہت کچھ ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہے اور قدامت پسندی کے نشانات ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔

دیہات و قصبات سے جب آپ گزریں گے تو دیکھیں گے کہ ان کی معاش زیادہ تر زراعت پر منحصر ہے، لیکن سوائے چند بڑے شہروں کے کہ یہاں تو بیشک کچھ مشینیں نظر آجاتی ہیں، باقی سب جگہ وہی پُرانے طریقے کاشت کے پائے جاتے ہیں۔

ان کی عورتوں کا لباس بھی اب تک وہی چلا آتا ہے، جس کا کپڑا وہ خود بنتی ہیں اور جس پر کشیدہ کاری بھی انھیں کی ہوتی ہے۔ صنعت و حرفت تقریباً یہاں مفقود ہے اور سوائے بوڈاپسٹ، بلگریڈ، بخارسٹ اور سالونیکا کے کسی جگہ صنعتی کارخانے نظر نہیں آتے۔

معدنی پیداوار کی کیفیت یہ ہے کہ یوگوسلاویا میں کچھ کانیں تانبہ کی پائی جاتی ہیں اور رومانیا میں پٹرول چشمے۔ لیکن کوئلہ اور لوہا تقریباً بالکل مفقود ہے۔ اس لئے یہاں کی دولت جو کچھ ہے وہ صرف یہاں کی زراعت ہے۔

گیہوں اور جوار یہاں کی خاص پیداوار ہے اور اسی پر یہاں کی آبادی کی زندگی کا انحصار ہے ۔ رومانیا میں البتہ سویابین اور سورج مکھی زیادہ پیدا ہوتا ہے جس سے تیل طیار ہوتا ہے، اسی طرح یونان میں تمباکو کی پیداوار کافی ہوتی ہے لیکن یہ سب ضمنی چیزیں ہیں، اصل چیز وہی زراعت ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس لحاظ سے دریائے ڈینوب نے اس حصۂ یورپ کو بہت زرخیز بنا دیا ہے ۔

پھر جس طرح تمام کاشتکار ملکوں کی حالت ہے، اسی طرح یہاں بھی غربت و افلاس عام ہے اور معیار معیشت پست ۔ یہ ہے ان ملکوں کی خصوصیت جس میں وہ باہم گر مشترک نظر آتے ہیں، لیکن اب ان کے باہمی فرق کو بھی دیکھئے ۔

یوگوسلاویا، بلغاریا اور یونان بالکل کاشتکاروں کے ملک ہیں، جہاں زمینداروں کا طبقہ نہیں پایا جاتا، ہر کاشتکار اپنی زمین کا مالک ہے جسے وہ جوتتا بوتا ہے اور دولتمندی و افلاس کا وہاں کوئی فرق نہیں ۔ البتہ بڑے بڑے شہروں میں بعض دولتمند اور سرمایہ دار خاندان ایسے ضرور ہیں، جو ان ملکوں کی پیداوار سے تاجرانہ فایدہ اُٹھاتے ہیں اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو سیاسی لیڈر بنکر پبلک سے ناجایز فایدہ حاصل کرتے رہتے ہیں، لیکن یہ سب بہت کم ہیں اور زیادہ تعداد آبادی کی زراعت پیشہ ہی ہے اور چونکہ ان کے معیشت و معاشرت میں فرق مراتب بہت کم ہے، اس لئے قدرتاً ان کا میلان جمہوریت کی طرف ہے ۔

ہنگری اور رومانیا کی حالت مختلف ہے ۔ ہنگری میں ابتک جاگیردارانہ امارت پائی جاتی ہے اور وہاں کی زمین بڑے بڑے زمینداروں کے قبضہ میں ہے ۔ اس لئے یہاں کے کاشتکاروں کی حالت مزدوروں کی سی ہے، جن کی زندگی زمینداروں کے رحم و کرم پر موقوف ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ سوائے اسپین کے یوروپ کے کسی حصۂ ملک میں ہنگری کا سا جابرانہ جاگیردارانہ نظام نہیں پایا جاتا اور یہی لوگ دراصل یہاں کے حکمراں ہیں ۔

رومانیا میں بھی چوتھائی صدی پہلے یہی حال تھا، اور یہاں کے زمینداروں نے ڈرکر کہ مبادا انقلاب روس کے اثرات دریائے ڈنیسٹر کو عبور کرکے رومانیا تک پہونچ جائیں اور کاشتکار ہاتھ سے نکل جائیں، کاشتکاروں کو زمین دینے میں زیادہ وسعت نظر سے کام لینا شروع کیا، لیکن اس سے ان کی اقتصادی حالت پر کوئی خاص اثر نہ پڑا ۔ کیونکہ جن شرایط پر ان کو زمین دی گئی وہ بہت سخت تھے اور یہ اس قدر غریب تھے کہ کھیت جوتنے کے لئے مویشی تک نہ خرید سکتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب رومانیا کے تیل کے چشموں سے فایدہ اُٹھانے کے لئے غیر ملکی سرمایہ دار پہونچے، تو یہاں کی سیاسیات بہت گر گئی اور شاہ کیرول کے زمانہ میں تو وہ کھلم کھلا فاسستی حکومت ہو گئی ۔

رومانیا اور ہنگری میں جرمنی اثرات قایم ہونے کے کئی سبب تھے، ایک یہ کہ ان دونوں ملکوں کی تمام ضرورتیں جرمنی سے پوری ہوتی تھیں ۔ جرمنی یہاں کی تمام خام پیداوار خرید لیتا تھا اور اپنی مصنوعات یہاں کے بازاروں میں بھیج کر فایدہ اُٹھاتا تھا ۔

ایک دوسرا سبب ہنگری کے متاثر ہونے کا یہ بھی تھا کہ لوگ زیادہ تر کیتھولک مذہب رکھتے ہیں اور اپنے ذوق کے لحاظ سے وہ مغربی حصۂ یوروپ (جرمنی) سے زیادہ متاثر ہیں ۔

یوگوسلاویہ کی حالت اس لحاظ سے البتہ ذرا مختلف ہے، کیونکہ یہاں تین قومیں آباد ہیں، جن میں سے کروٹ اور

سلوان قومیں کیتھولک چرچ کی پابند ہیں اور سربی قوم پروٹسٹنٹ چرچ کی۔ لیکن چونکہ سربی قوم اپنے آپ کو یہاں کا اصلی حکمراں سمجھتی ہے، اس لئے دوسری قوموں سے انکا اتحاد کبھی نہیں ہوا اور یوگوسلاویا کی بدامنی کا بڑا سبب یہی اختلاف عقاید ہے۔

بلغاریا کی حالت یہ ہے کہ یہاں کے حکمراں خاندان نے ہمیشہ اس ملک کو اپنے پڑوسی ملکوں (یونان اور یوگوسلاویا) سے برسرپیکار رکھا اور ہمیشہ ناکام رہا۔ علاوہ اس کے یہاں کے کاشتکار طبقہ کا میلان ہمیشہ روس کی طرف رہا اور اسی لئے جرمنی نے بلغاریا کو زبردستی اپنے ساتھ شامل کرکے روس سے لڑا دیا۔

الغرض بلقان کی سب سے بڑی تباہی یہاں کی قوموں کا باہم اختلاف ہے، اور اسی سے جرمنی نے فایدہ اُٹھایا۔ لیکن چونکہ باوجود ان تمام اختلافات کے بلقان کی اکثر آبادی زراعت پیشہ ہے اور اپنی معیشت و معاشرت کی وجہ سے قدرتاً ان کا میلان جمہوریت کی طرف ہے، اس لئے روس کا اس سرزمین تک پہونچ جانا بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ جس وقت یہاں کی آبادی کو معلوم ہوگا کہ روسی حکومت، جس کے خلاف فاسستی حکومتوں نے اتنا زبردست پروپاگنڈا کر رکھا تھا، دراصل کاشتکاروں ہی کی حکومت ہے تو ممکن نہیں کہ وہ اس اثر کو قبول نہ کریں اور بلقان کے آیندہ نظام حکومت کی بنیاد جمہوری اُصول سے ہٹ کر کسی اور اُصول پر قایم ہو۔

جوتے

سوچتا ہوں کہ جب اگلے مہینے تنخواہ ملے گی تو سب سے پہلے جوتوں کی مرمت کراؤں گا! — میرے پاس دو جوڑے جوتے ہیں۔ حالانکہ وہ پھٹے ہوئے ہیں مگر ان لوگوں سے پھر بھی اچھا ہوں جن کے پاس ایک ہی جوڑا ہے اور جو اسی کو رات دن گھسیٹتے پھرتے ہیں! اسی لئے جب کسم کہتی ہے "پھینک بھی دو ان جوتوں کو — ایک اور اچھا سا خرید لو" — تو میں یہ کہکر ٹال دیتا ہوں، اگلے مہینے ضرور خریدوں گا — مگر سوچتا یہ ہوں کہ "اگلے ماہ تنخواہ ملنے پر سب سے پہلے جوتوں کی مرمت کراؤں گا۔"

وجہ یہ ہے کہ نیا جوتہ خریدے جانے پر یہ دونوں جوڑے دوسرے ہی دن کوڑے پر پھینک دئے جاتے اور میرے پاس ایک ہی جوڑا رہ جاتا جس کو مجھے ہر روز اور ہر وقت پہننا پڑتا اس لئے میں نے یہی بہتر سمجھا کہ بجائے نیا جوتہ خریدنے کے اگلے مہینے ان دونوں کی مرمت کراؤں گا!

ان جوتوں کو پھینکنے کی کچھ ضرورت بھی نہ تھی۔ جوتوں کا صرف پنجہ ہی تو خراب ہوا تھا۔ یعنی پچک کر چوڑا ہو گیا تھا۔ کیا ہوا اگر ان کے تلوں میں سوراخ ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے لوگوں کی نظر ابرے پر پڑتی ہے اور یہ اچھے خاصے تھے۔ اگر تلا غائب ہوا جا رہا تھا تو بھی کیا۔ مجھے تو اس کا بالکل احساس نہیں تھا۔ جب دفتر کو جاتا ہوں تو سائیکل پر، جب دفتر سے لوٹتا ہوں تو سائیکل پر۔ اگر راستہ میں کہیں اترنا پڑے تو نئی دلی کی چکنی سڑکیں ہیں جن پر چلنے سے پیر میں کانٹے یا پتھر چبھنے کا بالکل ڈر نہیں رہتا۔ جب میں کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں تو تلا چھپ ہی جاتا ہے۔ بہت سے لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ نئے جوتے پہن کر آتے ہیں تو اپنی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور ان کے جوتے کی نوک سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کی ناک تک نہیں تو چہرہ تک ضرور ہی پہنچ جاتی ہے اور وہ ان جوتوں کو دیکھ کر تعریف کے پل باندھ دیتا ہے۔ "کیا خوب جوتا خریدا ہے! کتنے میں خریدا ہے؟" وہ کہتا ہے "۲۰ روپے میں خریدا ہے اور پھر بھی دوکاندار نے یہ کہکر دیا ہے کہ بابو جی سستا ہے!!"

دوسرا متعجب ہو کر کہتا ہے "آجکل جوتے خریدنے کی ہمت!!"

وہ فخر کرتا ہوا جواب دیتا ہے "ہاں صاحب! سوچا کہ گیہوں تو جمع ہی ہیں، جوتا ہی خرید لیا جاوے"

مگر میں جوتا کیسے خریدوں۔ ایک تو میری عادت نہیں کہ میں گیہوں جمع کر کے رکھوں اور دوسرے آجکل خطرہ بھی ہے مجھے ہر ہفتہ گیہوں لانا پڑتا ہے اور اس لئے کسی ماہ بھی جوتے لانے کے لئے گیہوں نہیں بچا سکتا!! — خیر! — میری یہ بھی عادت نہیں کہ ایک ٹانگ کے اوپر دوسری ٹانگ رکھ کر کرسی پر بیٹھوں کیونکہ اس طرح بیٹھنا بدتمیزی ہے۔ اور پھر اس طرح بیٹھنے سے گھسے ہوئے سوراخ دار جوتوں کے تلے بھی نظر آجاتے ہیں۔

ایک بات ضرور شرمناک ہے جس کو میں نہیں چھپا سکتا۔ میرے جوتوں کی ایڑی ایک طرف سے اتنی گھس گئی ہے کہ معلوم

ہوتا ہے ایڑی گھِی ہی نہیں !۔ اس لئے جب میں زمین پر قدم رکھتا ہوں تو میرے ذہن میں یہ خیال ضرور آتا ہے کہ میری ایڑی دوسری طرف سے ضرور جھک گئی ہوگی ۔ مگر اس سے کیا ؟ ۔ اگر ہم اپنی زندگی میں ذرا ذراسی باتوں کا خیال کرنے لگیں تو ہماری زندگیاں گزارنے کے قابل نہ رہیں ! صبح سے رات تک ہم بہت سے ایسے کام کرتے ہیں جوکہ جوتوں کی ایڑی گھسی ہونے سے کہیں زیادہ شرمناک ہوتے ہیں !! مگر ہم ان کی پرواہ نہیں کرتے ۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ دنیا اتنی چھچھلی کیوں ہوتی جارہی ہے ۔ ہم جب جوتا پہننے جاتے ہیں تو دیکھتے ہیں اس کا پنجہ خوشنما ہے یا نہیں، فیشن کے خلاف تو نہیں ! ہم جب کسی آدمی سے ملتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس کے جوتوں پر پالش ہے یا نہیں اور ان کے فیتے تو ٹوٹے ہوئے نہیں ہیں ۔ میرا خیال ہے کہ جوتوں کی ایڑی کا خراب ہونا اتنا بُرا نہیں جتنا کسی کے عادات واطوار کا خراب ہونا ـــ اور پھر اگلے ماہ تو تنخواہ ملنے پر جوتوں کی مرمت کرا ہی لوں گا ـــ ایڑی بھی درست ہو جاوے گی !!

تنخواہ ملنے کا دن ہے ۔ ابھی تنخواہ بھی نہ ملی تھی کہ میں حساب لگا رہا تھا ۔

گیہوں ۔ ۱۴ روپیہ کے ایک من صرف ۔ ایشور کا شکر ہے کہ میرے ساتھ زیادہ آدمی نہیں ! ورنہ ایک من سے کیا کام چلتا ! ۔ دودھ ۔ ایک روپیہ کا دوسیر ۔ ایک سیر دودھ لیا جائے تو پندرہ روپیہ الگ نکال کر رکھنے ہوں گے ۔ مگر ـــ دودھ کوئی ایسی ضروری چیز نہیں ۔ میرے ابھی بچے بھی تو نہیں کہ دودھ کے لئے مچلیں !!

کرایہ مکان : بیس روپیہ ! آہ ۔ تنخواہ کا بڑا حصہ تو کرایہ مکان ہی میں نکل جاتا ہے جنگ سے پہلے مکان پانچ پانچ دس دس روپے میں اچھے خاصے مل جاتے تھے ! اسی مکان کا کرایہ کبھی صرف آٹھ روپیہ تھا ۔ مگر پھر بھی میرے مکان کا کرایہ غنیمت ہے ! ـــ ماتھر کو دیکھو ۸۰ روپیہ تنخواہ ملتی ہے جس میں ۴۰ روپیہ مکان کا کرایہ دیدیتا ہے اور دوسری تاریخ کو ہی اس کی جیب خالی ہو جاتی ہے ۔

گھی ـــ دس روپیہ کا ! نہیں اتنے روپیہ کے گھی سے کام نہیں چلے گا ۔ پندرہ روپیہ کا مگر اس سے زیادہ قیمت کا گھی نہیں خریدا جا سکتا ۔

کاغذ پر میں نے اس طرح حساب لگا کر دیکھا تو میزان پچانوے آٹھ آنے ہوئی اور مجھے تنخواہ ملتی ہے، صرف ۷۷ روپیہ !! میں حساب میں جوتوں کی مرمت کا خرچ بھول ہی گیا تھا ۔ اس لئے میں اس طرح سوچ میں بیٹھ گیا جیسے کوئی لڑکی انجان جگہ میں کھو جاوے ! میری نگاہیں فردِ حساب پر تیزی سے پھر رہی تھیں مگر ان میں سے ایک چیز بھی نکالی نہیں جا سکتی تھی ۔ میری سمجھ میں کچھ بھی تو نہیں آرہا تھا ۔ ابھی تنخواہ نہیں ملی تھی مگر معلوم ایسا ہوتا تھا جیسے جیب خالی ہو گئی ہو !! ـــ مجھے خیال آیا ـــ کسم کے چپل بھی تو خراب ہو گئے ہیں ۔

اُس دن میں نے کوٹ اُتار کر رکھا ہی تھا کہ کسم نے جیب سے تنخواہ نکال لی اور کہا " تمھاری جیب سے دس روپیہ میں نے نکال لئے ہیں ۔ باقی گھر کے خرچ کے لئے چھوڑ دئے ہیں !" ۔

" دس روپیہ کا کیا ہو گا " میں نے یہ سوچتے ہوئے کہا کہ دس روپیہ نکال کر گھر کا خرچ کیسے چلے گا " ان جوتوں کو بدلنا ہے ۔ اب کے چاہے کچھ بھی ہو نئے جوتے خریدنے ہیں !!"

میں نے کچھ نہ کہا ۔ صرف اپنے جوتوں کی طرف دیکھنے لگا ۔ حالانکہ جوتے گرد سے اٹے ہوئے تھے پھر بھی ان کی بدصورتی

گرد میں سے جھانک رہی تھی - اور ان کی ایک ایڑی ٹیڑھی ہونے کی وجہ سے میں نے محسوس کیا کہ میرا ایک پیر ٹیڑھا ہوا جا رہا ہے -
میں نے کسم کی چپل کی طرف دیکھا - کمرہ کے کونہ میں رکھی ہوئی تھی کسم نے ان کو پہننا بند کر دیا تھا کیونکہ اس کے ٹانکے ٹوٹ گئے تھے - " اچھا اس مہینے تمھارے چپل خرید لوں کیونکہ میرا جوتہ تو ایک مہینہ اور چل سکتا ہے"

" رہنے بھی دو"

دوسرے روز کسم میری باہیں پکڑ کر چاندنی چوک لے چلی - میں وہاں جا نہیں رہا تھا بلکہ گھسیٹا جا رہا تھا - مجھے خیال ہو رہا تھا - آج پہلی ہی تاریخ ہے - چاندنی چوک میں جا کر جیب خالی ہو جاوے گی - اور پھر گیہوں کہاں سے آویں گے، گھی کہاں سے آویگا - مکان کا کرایہ ! - اور ... - کچھ نہیں !!

" چلو بھی !"

ہم دونوں فتحپوری پر ٹریم کار سے اُتر پڑے اور بیچ سڑک میں گھومنے لگے - دونوں طرف دوکانیں ہیں اور میں یہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ کس طرف چلا جاوے - پٹڑیوں پر کپڑے کے ٹکڑے بیچنے والے آواز لگا رہے تھے - " بارہ آنے گز !" باریک چھینٹ کا کپڑا تھا - کسم کا بلاؤز بہت خوش نما بن سکتا تھا مگر مجھے خیال آیا کہ کسم کے بلاؤز کے لئے میں نے کئی ماہ ہوئے کپڑا خریدا تھا مگر وہ ابھی تک یونہی رکھا ہوا تھا - ہر ماہ سوچتا تھا کہ درزی کو دیدیا جائے مگر تنخواہ میں سے درزی کے لئے سلائی نہ نکل سکتی تھی -

کپڑے والے ڈھیری لگائے ہوئے بیٹھے تھے اور جیسے ہی ہم ان کے پاس سے گزرتے ویسے ہی وہ ہماری طرف مخاطب ہو کر کہتے "آیئے بابوجی ! کیا چاہیئے !!" ہماری نگاہیں ان کے کپڑوں پر جاتیں مگر گردن موڑ کے چلے جاتے !

دوکانیں پیچھے کو ہٹتی جا رہی تھیں - کنگھیوں - تیل - شیشوں کی دوکانیں آئیں اور چلی گئیں !! مجھے خیال آیا کہ میرے کنگھے کا ایک حصہ بالکل ٹوٹ گیا ہے اور بال سنوارنے میں بہت دقت ہوتی ہے - میں نے کنگھے کے دام پوچھے - "سوا دو روپیہ !" میں کنگھے کو واپس کر کے آگے چل پڑا ---- " لے لیتے ایک کنگھا !" کسم نے کہا ---- "سوا دو روپیہ کا تھا"

" قمیصوں کا کپڑا" میرے کان میں کپڑے فروخت کرنے والے کی کرخت آواز آئی - مجھے ایک دم احساس ہوا کہ میری قمیص کندھوں پر سے پھٹ گئی ہے اور قمیص بنانے کا مہینوں سے ارادہ ہے ---- میری نگاہ ان کپڑوں کی طرف چلی گئی -

" آیئے - قمیص کا کپڑا پسند کیجئے - یہ بارہ آنہ گز - یہ سوا روپیہ گز - یہ ڈیڑھ روپیہ ---- یہ دو ---- اور اس سے بھی زیادہ دام کا دکھاؤں !"

"نہیں ---- یہ بارہ آنہ گز کا ہے ؟"

میری انگلیاں اس کپڑے کو ملنے لگیں، کچھ کھردرا سا تھا - دُھلنے پر شاید اچھا نکلے - لڑائی سے پہلے اس کے دام تین آنہ گز تھے -!! ---- "یہ سوا روپیہ گز ---- ! اچھا ہے ---- اور یہ ---- ڈیڑھ روپیہ گز !! ---- یہ ---- یہ دو روپیہ ----
میں پوچھتا جاتا تھا مگر سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کونسا کپڑا خریدا جائے !! میں دوکان سے چل دیا -

" لیتے جایئے بابوجی " مگر میں نے جواب نہ دیا - جیسے سنا ہی نہ ہو -

ہم دونوں پٹڑی پر گھومتے گھومتے گھنٹہ گھر تک آ گئے تھے - کسم نے کہا ؛ " وہ جوتوں کی دوکان تو پیچھے رہ گئی !"
ہم پھر لوٹ گئے -

سشیشہ کی الماریوں میں طرح طرح کے جوتے دوکان کو آراستہ کرنے کے لئے رکھے ہوئے تھے۔ میں دوکان کے باہر ٹھٹھک گیا۔ ایک چپل سفید چمڑے کی ایک کیل پر لٹکی ہوئی تھی اور میں خیال کر رہا تھا ـــ "کسم کے پاؤں میں یہ سفید پٹی سنڈل کتنی اچھی لگے گی ـ" اس کے ساتھ ساتھ ہرے مخمل کی چپل رکھی ہوئی تھی ۔ میں نے کسم کے پاؤں دیکھے ۔ اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں ان ہری پٹیوں سے اپنے گلابی جھلک خوب دکھاویں گے ! اور وہ تیسری چپل کیسی رہے گی ۔ چمڑے کی پٹیوں کو ایسے پرو دیا تھا جیسے کہ دھاگے کو گوندھا جائے ۔ کسم نے کہا " یہ جوتا ـــ ہے تو اچھا"

اور وہ مجھ سے پہلے ہی دوکان کے اندر چلی گئی ۔ میں بھی پیچھے پیچھے اندر آگیا ۔ دوکاندار نے ہمارے چہروں کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا ہی تھا کہ کسم نے کہا ۔ " مردانہ جوتا دکھاؤ" ـ اور میں سوچتا ہی رہا کہ کونسی چپل کسم کے لئے منگائی جائے ! ـــ دوکاندار نے کئی جوتوں کے جوڑے میرے سامنے لاکر رکھدئے ! یہ پتلی ٹو کا تھا سنگل سول ـــ "کچھ چلے گا نہیں" میں نے کہا اور اس کو الگ رکھدیا ـ یہ چوڑی ٹو کا ۔ ڈبل سول ۔ "خوب چلے گا" دوکاندار نے کہا ۔ " دام" "ساڑھے پچیس روپیہ" "زیادہ دام ہیں اتنے دام کا نہیں" میں نے کہا ۔

دوکاندار دوسرا جوتہ نکال کر کہنے لگا ۔ " یہ براؤن شو ہے ۔ اچھے چمڑے کا ہے ۔ ٹو نہ پتلی ہے نہ موٹی ـــ ڈبل سول !! چلنے والی چیز ! ـ"

میں ان جوتوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر ان کے سول کو دیکھنے لگا ۔

" چلنے والی چیز ہے بابو جی ـــ چلنے والی"

" دام ؟ ـــ"

" ساڑھے اُنیس روپیہ"

" ساڑھے اُنیس ! "

" ہاں ـــ "

کسم کو تعجب ہوا کیونکہ وہ دس روپیہ قیمت کا اندازہ کرکے آئی تھی ۔ وہ کچھ بے چین سی ہونے لگی

" تب بھی سستا ہے ! ـ" دوکاندار نے کہنا شروع کیا " یہ تو ہماری ہی کمپنی کا بنا ہوا ہے اس لئے ساڑھے اُنیس میں بیچ رہے ہیں ۔ دوسری دوکان پر ساڑھے پچیس کا ملتا ہے " اور پھر اس نے سول کو دبا کر کہا ۔ " سول گھس نہیں سکتے گھس جاویں تو مرمت مُفت "

میں دوکان سے اُٹھنے ہی والا تھا کہ دو لڑکیاں دوکان کے اندر آئیں !! دوکاندار کی توجہ ان کی طرف ہوگئی اور میرے ہاتھ میں سوچنے کے لئے دونوں جوڑے رہ گئے !! ـــ ان میں سے ایک لڑکی نے وہی سنڈل دھاگوں جیسی بنی ہوئی پسند کرلی اور انھوں نے آناً فاناً دو نوٹ پھینک دئے ! دوکاندار نے اپنی موٹی موٹی اُنگلیوں سے ان کو اُٹھا کر لوہے کے بکس میں رکھ لئے میں اُٹھنا چاہتا تھا مگر سوچ رہا تھا کہ ان کے سامنے یہ کیسے کہوں کہ دوسری دوکان پر جوتے اور دیکھ لیں ! کیا وہ دوکاندار اپنے دل میں یہ نہیں کہے گا کہ یہ بابو صاحب ہیں ۔ گھس گھس کرتے ہیں ، وقت خراب کرکے بھی کچھ نہیں خریدتے !۔ اور اس عورت کو دیکھئے ، منی بیگ میں سے نکال کر دس دس کے دو نوٹ ایک ۔ دم پھینک دئے !!۔ آجکل دوکانداری تو عورتوں ہی کے دم سے ہے !!

--- مجھے خیال ہوا کہ یہ تہذیب نہیں کہ میں دوکاندار کا وقت خراب کر کے اور جوتوں کو اپنے ہاتھ سے مسل کر چلا جاؤں --- یہ تہذیب نہیں ..... میں سوچ ہی رہا تھا کہ دو اور عورتیں اندر آگئیں !! - ان کی باریک دھوتی میں سے ان کی گداز باہیں چمک رہی تھیں - بولیں --- "سینڈل دکھائیے"

میری نگاہ ان کے ہونٹوں کی طرف گئی - ہونٹوں کا قدرتی رنگ لپ اسٹک کے رنگ سے بالکل چھپ گیا تھا - دوکاندار کی نگاہ بھی ان سرخ ہونٹوں کی طرف گئی اور میں سڑک کی طرف دیکھنے لگا - ایک ہندوستانی لڑکی سائیکل پر جا رہی تھی اور ہوا اس کی نیم برہنہ رانوں سے ساری کا پلو اڑا رہی تھی اور وہ اسے سنبھال رہی تھی --- نیم برہنہ پوشاک بھی آجکل تہذیب ہے ! - ایک زمانہ ایسا بھی آوے گا کہ انسان کو اپنے جسم پر کپڑا ڈالنے کی ضرورت ہی نہ رہے گی - ہر ایک تہذیب کے معنی اپنے ہی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور چونکہ آجکل ایک آدمی کا نظریہ دوسرے سے جداگانہ ہے - اس لئے تہذیب بھی ایک چیز نہیں رہی - کیا میرا دوکان سے چلا جانا تہذیب کے خلاف تھا ؟ - میں سوچ ہی رہا تھا کہ ان دو عورتوں میں ایک نے اپنی ترنم بھری آواز میں کہا "وہ ہری سنڈل تو کھاؤ، دو پٹی والی" ان کی ترنم بھری آواز اس دوکان میں کتنی بھلی معلوم ہو رہی تھی - دوکاندار نے بڑی تیزی سے ہری سنڈل نکالنے کو ہاتھ بڑھایا اور پھر دو تین بار اپنی ہتھیلیوں میں الٹ پلٹ کر ان کے تلوؤں کو سجاتا ہوا انکے پیروں کے سامنے لے گیا - اس کی موٹی موٹی کالی انگلیاں لڑکی کے گلابی پیروں کو چھو رہی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ دیر کے لئے اس کی انگلیاں وہیں رہ گئی ہوں اور دوکاندار بھول گیا ہو کہ وہ جوتے کی دوکان تھی - اس نے اس کے پیروں کو سنڈل کے اندر ڈالنے کے لئے بانا شروع کیا - سنڈل پہنا کر تعریفی نگاہ بنا کر بولا : "میم صاحب آپ کے پیروں کے لئے یہی سنڈل اچھی ہے - لیجائیے، دیکھئے کونسی بھلی معلوم ہو رہی ہے --- اور اس کا چمڑا ! آجکل تو ایسا چمڑا ملتا بھی نہیں --- اور اس کا سول ! ؟ - یہ پرانا اسٹاک ہے اس لئے اس کے سول کی مضبوطی میں تو کوئی شک نہیں ! آجکل کے مال کی کوالٹی ردی ہوتی ہے " ..... یہ سول ایک سال تک چل سکتا ہے اور اگر ایک سال کے اندر اس کا سول خراب ہو جاوے یا کہیں سے سنڈل نکل جائے تو مرمت مفت - مرمت معمولی بھی آجکل دو تین روپیہ کی ہوتی ہے - ہماری کمپنی مفت مرمت کرنے ہی میں مشہور ہے !!"

اس عورت نے اپنے دہنے ہاتھ میں سنڈل لی اور اس کے چمڑے کو دبانے لگی - دوکاندار نے پھر کہنا شروع کیا : "لیجائیے کوئی شک کی بات نہیں ! - اسٹاک پرانا ہے ختم ہونے والا ہے - شاید یہ آخری جوتی ہے - شاید اب اس کوالٹی کی نہ آوے !!"

ابھی تک میرے ہاتھ میں جوتوں کے جوڑے تھے اور میں اس الجھن میں پھنسا ہوا تھا کہ ان کو خریدا جائے کہ نہیں - دام تھے ساڑھے انیس روپیہ اور میں اپنے دل میں شمار کر رہا تھا "کرایہ مکان بیس روپیہ ! - گیہوں تیرہ روپیہ - گھی پندرہ روپیہ" مگر میرا شمار کرنا بہت دیر تک جاری نہ رہ سکا کیونکہ اس باریک آواز نے میری سکوت دل کو پھر درہم برہم کر دیا -

"اسے باندھ دو !" اور یہ کہکر اس نے دس کے دو نوٹ دوکاندار کی گود میں پھینک دئے ! اور دوکاندار نے نوٹوں کو لے کر کیش بکس میں رکھدیا اور جوتی واپس کر دی - اب دوکاندار اپنے نووارد گاہکوں سے فرصت پا چکا تھا - اس نے میری طرف مڑ کر دیکھا - کسم حیران ہو رہی تھی - اسے میرے ہاتھ میں جوتے لئے رہنا اچھا نہ لگ رہا تھا -

"اسے ! اسکو بھی باندھ دو" کسم نے کہا

اور میں چونک پڑا - مگر اب میرے دخل دینے کی کوئی گنجایش نہ رہی تھی کیونکہ جوتے بندھنے شروع ہو گئے تھے -

میں اس کو منع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ میں نے اس کا خراب کر دیا تھا۔ تقریباً دس جوڑے ہوں گے اور ان میں سے میں ایک بھی پسند نہ کر سکا تھا۔ دوکاندار کہتا ہوگا "عجب شخص ہے کوئی جوتہ پسند نہیں آتا اور ان عورتوں کو دیکھو۔ دس دس کے نوٹ پھینک دیتی ہیں۔ دوکانداری تو ایسے خریداروں سے ہے ورنہ آدھ آدھ گھنٹے خراب کرنے اور جوتوں کے چمڑے کو انگلیوں سے مسل مسل کر چلے جانے والے خریداروں سے دوکان کیا خاک چلے گی!"۔ میرا دم گھٹا سا جا رہا تھا۔ کیونکہ میں کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ اسی سکتہ کی سی حالت میں، میں نے بھی دس دس کے دو نوٹ پھینک دئے — "اور کیا دکھاؤں"—

"آپ کے پیروں کی سنڈل؟" کسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوکاندار نے پوچھا

"او — نہیں — بس — چلو کسم" کسم اور ہم دونوں جوتوں کی دوکان سے نکل آئے۔ سڑک پر آ کر ہوا کا جھونکا لگا اور میرے ہوش آئے — ٹریم کار چاندنی چوک میں اسی گڑگڑاہٹ سے چل رہی تھیں جیسے پہلے۔ ہجوم ایک دوسرے کو ڈھکیلتا ہوا ویسے ہی پٹریوں پر چل رہا تھا۔ کپڑے بیچنے والے اسی طرح بارہ آنہ کی آواز لگا رہے تھے۔ مگر میں ان آوازوں کو جیسے نہ سن رہا ہوں کسم بھی خاموش تھی اور میرے ساتھ ساتھ چلی جا رہی تھی — شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا۔ بجلی کے قمقمے چمکنے لگے تھے۔ سیر کرنے والوں کا ہجوم دوگنا ہو گیا تھا۔ دوکانیں ایک کے بعد دوسری نکلی جا رہی تھی مگر میری توجہ کسی طرف نہ تھی۔

"بابو جی تانگہ چاہیئے"— میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ تانگہ میرے سامنے کھڑا تھا اور وہ تانگہ والا میرے جواب کا منتظر تھا۔

"قرول باغ چلے گا؟"— "ہاں ہاں" میں بہت تھک گیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نے منزلیں طے کی ہیں میرے ہاتھوں میں جوتے کا ڈبہ تھا جو کئی سیر وزنی معلوم ہوتا تھا۔ ڈبہ کو ایک طرف رکھ کر میں پلنگ پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں پلکوں کے اندر اندھیرا چھا گیا اور اندھیرے میں خیالات کی تصویریں بننے لگیں۔ میں نے جو حساب لگایا تھا وہ تنخواہ سے ۲۵ روپیہ زیادہ کا پہلے ہی ہو گیا تھا اور اب ساڑھے اُنیس کا جوتا اور خرید لیا گیا — میرے آنسو نکلنے ہی والے تھے کہ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ میں نے بٹوا کھولا۔ معلوم ہوا کہ جیسے خالی ہو گیا ہو۔ کسم میری طرف دیکھ رہی تھی اور میرے اندرونی خیالات کو سمجھ رہی تھی۔ یہ جنگ۔ اُف! کب ختم ہوگی یہ جنگ، ہر روز یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اس مہینے کیسے کام چلے گا۔ ہزاروں آدمی میدانِ جنگ میں مر رہے ہیں اور ہزاروں خواہشیں ہمارے دلوں کے اندر مر رہی ہیں ----- کسم کی سنڈل بھی تو پہننے لائق نہ رہی تھی مگر وہ پہن رہی تھی۔ لاکھوں آدمی بغیر آنسو بہائے مر رہے ہیں مگر جو جنگ میں شریک نہیں ہیں ان کو جنگ ذرا ذرا سی باتوں پر رُلا دیتی ہے۔ ہم جنگ سے ہزاروں میل دور ہیں مگر جنگ کے انگارے ہمارے جسم پر پڑ رہے ہیں اور ہم جھلسے جا رہے ہیں!! نہیں تو ان جوتوں کے لئے کسم کے آنسو نہ نکلتے۔ کسم نے آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ کر کہا "میں تو تمھارے ہی لئے لائی ہوں۔ وہ جوتے کوئی پہننے لائق تھے"— "مگر" — "میرے روپیہ میں سے خرچ کو لے لینا۔ تھوڑے ہی سے تو اور رہ گئے ہیں"۔ اس کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے — دوسرے دن علی الصباح میرے دونوں پرانے جوتے پھینکے جا رہے تھے۔ میں نے کہا: "نا۔ نا۔ انھیں رہنے دو!"— "نیا جوتہ تو آ گیا ہے!!"— "وہ تو آ گیا ہے، مگر ان کو بھی مت پھینکو، ان کو ملا کر میرے پاس تین جوڑے ہو جائیں گے!!" — "اونھ —" اور جوتے پھر پھینکے جانے لگے — "نہیں، نہیں" میں نے پلنگ سے اُٹھ کر کہا اور جوتوں کو ایک طرف رکھ کر بولا "اگلے مہینے تنخواہ ملنے پر ان کی مرمت کراؤں گا۔ یہ جنگ کا زمانہ ہے۔ جنگ کا!!"

شنکر سروپ بھٹناگر ایم۔ اے

مالہٗ وماعلیہ

مئی کے رسالہ شاعر آگرہ میں حضرت سیماب اکبرآبادی کی ایک نظم "صبحِ بنارس" کے عنوان سے شایع ہوئی ہے۔ اس نظم کا موضوع منیر شکوہ آبادی کی طرح صبح بنارس کے صرف جمالیاتی پہلو کو پیش کرنا نہیں، بلکہ اصلاحی گفتگو کرنا بھی ہے اور وہ یہ کہ عین اسی وقت جبکہ رودِ گنگا کے مشرقی ساحل پر حسن وجمال، زندگی ونشاط کا ہنگامہ برپا ہوتا ہے، اس کے مغربی ساحل پر مرگھٹ اور چتاؤں کا بھیانک منظر سامنے ہوتا ہے، جو حفظانِ صحت اور جمالیاتی نقطۂ نظر سے سخت ناپسندیدہ امر ہے۔ نظم یہ ہے:

طلوعِ آفتابِ صبح ہے گنگا کے ساحل سے — حسیں جس طرح کوئی جلوہ دکھا دے چاکِ محمل سے
ہوائیں غسل کرنے آرہی ہیں رودِ گنگا میں — جو نزہت ہے لبِ دریا، وہی نزہت ہے صحرا میں،
سرِ ساحل شباب وشیب، سب اشنان کرتے ہیں — خدا سے لو لگاتے ہیں، خدا کا دھیان کرتے ہیں
نظرکش سطوتِ تعمیر سے ہے مغربی ساحل — فلک گویا ہے سطحِ مرتفع سے ایک ہی منزل
کنارِ آب کچھ سادھو ہیں، پنڈت ہیں، پجاری ہیں — بہت سی کشتیاں دریا میں بہرِ سیر جاری ہیں
فضا پہلے سنہری، پھر روپہلی رنگ دیتی ہے — کنارے پر غرض اک زندگی انگڑائی لیتی ہے

مگر مشرق میں جب ہوتا ہے یہ نوروز کا عالم — نظر آتا ہے مغرب کی طرف اک سوز کا عالم
سرِ ساحل ہی اک مرگھٹ بھی ہے بے پردہ وعریاں — چتائیں جل رہی ہیں، ہو رہا ہے موت کا ساماں
ہیں کچھ لاشیں زمیں پر اور کچھ جلتی چتاؤں پر — مسلسل جن کے شعلے رقص کرتے ہیں فضاؤں پر
ادھر تو زندگی کا صبح نو پیغام لاتی ہے — ادھر شامِ فنا یہ موت کا منظر دکھاتی ہے
یہ تکلیفِ نظر، آغاز میں انجام کا عالم! — تحیّرخیز ہے یکجا یہ صبح وشام کا عالم؟
چٹخنی ہڈیوں، جلتے ہوئے جسموں کی بدبو سے — پگھلتی چربیوں، جھلسی ہوئی لاشوں کی بدبو سے
چرانداُٹھتی ہے اور مسموم کرتی ہے فضاؤں کو — بالآخر گرم کردیتی ہے دریا کی ہواؤں کو
یہ منظر، باوجودِ سعی بھولا بھی نہیں جاتا — نہیں ہٹتی نظر بھی، اور دیکھا بھی نہیں جاتا

میں اُن سے پوچھتا ہوں، جو ہیں ذمہ دارِ صحت کے — لبِ دریا ہی کیوں ہیں یہ مناظر یاس وحسرت کے؟

سحر کی گود میں کیوں شام عبرتناک ہو جائے ؟ جواں نظروں کے آگے کیوں جوانی خاک ہو جائے ؟
کنارِ رودِ گنگا کیوں یہ مُردے لائے جاتے ہیں ؟ سر کوثر کہیں آتشکدے سلگائے جاتے ہیں ،
نظر سے دور ، مرگھٹ کیوں نہ ہو تعمیر صحرا میں ؟ وہاں سے راکھ لاکر کیوں نہ ڈالی جائے دریا میں
اگر ممکن نہیں اس رسم سے پہلو تہی ہونا تو ہے دو چار ساعت بہتر اس کا ملتوی ہونا
سحر جب سازِ رنگیں چھیڑ کر اپنا چلی جائے تو پھر اس سوزِ غم افروز کو آواز دی جائے
ابھی اس کو مٹا دیتا ، اگر ہوتا مرے بس میں
یہ داغ آتشیں ہے ، دامنِ صبح بنارس میں

جناب سیماب ، ملک کے نہایت کہنہ مشق ، پُرگو اور ذی فہم شعراء میں سے ہیں اور اپنی کارگاہِ شاعری کی وسعت کے لحاظ سے شاید صفِ اول میں بھی خاص امتیاز رکھتے ہیں ۔ انھوں نے اس وقت تک بہت کہا اور اب بھی وہ بہت کہنے کے لئے مستعد نظر آتے ہیں ، لیکن بہت کہنے والوں میں جو عیب اپنے کلام پر بار بار غور نہ کرنے کا پیدا ہو جاتا ہے ، وہ ان میں بھی ہے اور اسی لئے ہم کو ان کی نظموں میں بعض ایسی باتیں بھی نظر آجاتی ہیں ، جو ان کی مہارت و مزاولت کو دیکھتے ہوئے دل میں کھٹکتی ہیں ۔ چنانچہ اس نظم میں بھی اس نوع کا تسامح متعدد جگہ نظر آتا ہے ، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم انھوں نے انتہائی رواداری میں لکھی ہے ۔

(۱) پہلے شعر کا سب سے پہلا ٹکڑا " طلوعِ آفتاب صبح " اگر جناب سیماب کے کسی نومشق شاگرد کے قلم سے نکلتا ، تو شاید وہ خود اسے قلمزد کر دیتے اور کہتے کہ " طلوعِ آفتاب " لکھو یا " طلوعِ صبح " آفتاب اور صبح دونوں کے اجتماع کی ضرورت نہیں ۔ لیکن خود اپنے کلام میں ان کی توجہ اس طرف مبذول نہیں ہوئی ۔

یقیناً یہ ترکیب غلط نہیں لیکن جناب سیماب کے کلام میں کسی ایسی فروگزاشت کا پایا جانا ، جس کے جواب میں وہ صرف یہ کہ سکیں کہ " غلط " نہیں ہے ، یقیناً اُن کے شان کے خلاف ہے ۔

اس شعر کا دوسرا مصرعہ تشبیہ ہی ہے ، یعنی اس میں " گنگا کے ساحل سے " " طلوعِ آفتاب " کی تشبیہ یہ پیش کی گئی ہے کہ

حسین جس طرح کوئی جھانکتا ہو چاک محمل سے

یہ تشبیہ و تمثیل بھی اُستادانہ نہیں ۔ دریا کے ساحل کو " چاکِ محمل " کہنا " ادنیٰ وجہ شبہ " کے لحاظ سے تو غلط نہیں لیکن جناب سیماب سے ہم اس سے بہتر تمثیل کی توقع رکھتے تھے ۔ جو منظر اس شعر میں پیش کیا گیا ہے ، اس کے لحاظ سے پس دیوار جھانکنا یا طرفِ بام سے جھانکنا کہا جاتا تو زیادہ موزوں ہوتا ۔

(۲) دوسرے شعر میں ایک نہایت نازک معنوی نقص ہے ، جس کی طرف جناب سیماب کی نگاہ نہیں گئی ۔ دوسرے مصرعہ میں " وہی نزہت ہے صحرا میں " پورے شعر کا توڑ ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اسی کے ظاہر کرنے کے لئے شعر کہا گیا ہے ۔ حالانکہ اس وقت گفتگو صرف دریا کے منظر سے ہے اور اسی پر زور دینا چاہئے ۔ لیکن اگر شاعر کا خیال اس سلسلہ میں صحرا کی طرف پہونچ گیا تھا اور اس شعر میں مقصود صحرا ہی کی نزہت کا بیان تھا تو پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہئے تھا :

"ہوائیں غسل کر کے جا رہی ہیں رودِ گنگا سے"

(۳) تیسرے شعر میں "شباب و شیب" کے الفاظ نے ہلکا سا تصنع پیدا کر دیا ہے۔ اگر اس کی جگہ پیر و جواں ہوتا تو بہتر تھا

(۴) چوتھا شعر ناگوار آورد کی مثال ہے اور خصوصیت کے ساتھ پہلا مصرعہ تو بہت بدنما ہے۔ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ مغربی ساحل کی بلند عمارتیں سربفلک نظر آتی ہیں، لیکن اس کے لئے پیرایۂ بیان بہت اُلجھا ہوا اختیار کیا گیا اس مفہوم کو اور مختلف طریقوں سے ظاہر کیا جا سکتا تھا۔

(۵) چھٹے شعر کے پہلے مصرعہ میں فضا کے پہلے سنہری اور پھر روپہلی رنگ دینے کا کوئی سبب نہیں بتایا گیا اور نہ اس سے قبل کوئی ایسا منظر پیش کیا گیا جس سے یہ بات خود سمجھ میں آجاتی۔ علاوہ اس کے دوسرا مصرعہ پہلے سے غیر مربوط ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ دونوں مصرعوں میں دو باتیں علحدہ علحدہ بتائی گئی ہیں اور ان دونوں میں باہم کوئی تعلق نہیں، تو پھر دوسرے مصرعہ میں لفظ غرض بیکار ہو جاتا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ فضا کے سنہری اور روپہلی رنگ آمیزیوں کو زندگی کی انگڑائی لینا کہا گیا ہے تو پھر بھی ہمارا پہلا اعتراض بدستور قایم رہتا ہے کہ سنہرے اور روپہلی رنگ سے کیا مراد ہے۔

(۶) ساتویں شعر میں مشرق و مغرب کے الفاظ سے ساحل نہیں بلکہ ایشیا و یوروپ کی طرف خیال منتقل ہوتا ہے، اس لئے یہاں لفظ ساحل کا اظہار ضروری تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ چوتھے شعر میں انھوں نے مغربی ساحل کی شان و شوکت اور جلوہ گری کا ذکر کیا ہے اور اب اسی مغربی ساحل پر وہ مرگھٹ کا پایا جانا بیان کرتے ہیں۔

(۷) پہلے مصرعہ میں بے پردہ کہدینے کے بعد "ننگے" کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی علاوہ اس کے مرگھٹ اور چتاؤں کو موت کا سامان کہنا بھی درست نہیں۔ ان سے تو موت کی زد کو بھی ہمیشہ کے لئے ختم کیا جاتا ہے۔ چہ جائیکہ انھیں خود "موت کا سامان" کہا جائے۔

(۸) نویں شعر کے دوسرے مصرعہ میں "فضاؤں" محل نظر ہے۔ کیونکہ چتاؤں اور مرگھٹ کی زمین ایک ہی تھی اور اس کی فضا بھی ایک۔

(۹) دسویں شعر میں صبح کے وقت تقابلی منظر مشرقی اور مغربی ساحل کا پیش کیا گیا ہے اس لئے دوسرے مصرعہ میں شامِ فنا کا فقرہ خیال کو تعیین منظر کی طرف سے مشوش کر دیتا ہے۔ علاوہ اس کے اس فقرہ کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔ اگر اس کو حذف کر کے شعر کی نثر یوں کریں: "ادھر تو صبح نو زندگی کا پیغام لاتی ہے اور اُدھر موت کا منظر دکھاتی ہے" تو مطلب واضح ہو جاتا ہے اور زیادہ روانی و سلاست کے ساتھ۔

(۱۰) نویں شعر کے پہلے مصرعہ میں "بہ تکلیف نظر" کا ٹکڑا تصنع سے خالی نہیں اور مصرعہ کے دوسرے حصہ سے غیر مربوط ہے۔ اگر "بہ" کی جگہ "سے" ہوتا تو یہ عیب دور ہو جاتا۔

(۱۱) دسویں شعر میں حضرت سیماب نے قافیہ کی طرف سے بڑی بے اعتنائی برتی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے جسموں اور لاشوں کو کیونکر ہم قافیہ قرار دیا۔

(۱۲) چودھویں شعر کے پہلے مصرعہ میں "بھی" زاید ہے۔ "بھولا نہیں جاتا" کہنا چاہئے تھا اور اس میں "بھی" کے اضافہ کی ضرورت نہیں تھی۔

(۱۳) سولھویں شعر کا پہلا مصرعہ ہے "سحر کی گود میں کیوں شام عبرتناک ہو جائے" دراصل کہنا یہ چاہئے تھا کہ:

" سحر کنان شام عبرتناک ہو جائے " لیکن گود کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شام کا ذکر کیا گیا ہے، وہ سحر سے علٰحدہ کوئی چیز ہے حالانکہ نظم میں منظر صرف صبح کا پیش کیا گیا ہے۔ اس صورت میں شام کی صفت عبرتناک قرار نہ پائے گی، بلکہ عبرتناک خبر ہو جائے گی۔

بہر حال وہ " شام، عبرتناک " ہو یا " شام عبرتناک " دونوں صورتوں میں مصرعہ ناقص ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اول تو " جواں نظروں " کا ٹکڑا ذوق پر بار ہے، علاوہ اس کے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جوان نظروں کی تخصیص کیسی، جبکہ خود دیباچہ صاحب ہی کے قول کے مطابق " سرِ ساحل شباب و شیب سب اشنان کرتے ہیں "

دختران حوا کا کورس

جناب جوش ملیح آبادی کا ایک مسدس عنوان بالا سے یکم جون کے آجکل میں شایع ہوا ہے، جو ان کی طویل نظم حرف آخر کا ایک حصہ ہے۔

اس مسدس کے دس بند ہیں اور بعض بعض اس میں شک نہیں بہت پاکیزہ ہیں لیکن بعض مصرعوں پر نظر ثانی کی ضرورت تھی

دوسرا بند ہے :

اپنے جلووں کو نگاہوں سے اگر ہم نہ چھپائیں　　ذوقِ نظارۂ بیباک سے آنکھیں نہ چرائیں
شوق کے پنجۂ گستاخ سے دامن نہ بچائیں　　زاہدوں کی طرح اگر ہم نہ تغافل کو بڑھائیں
لذتِ گریۂ طول شب ہجراں نہ رہے،
ہم اگر بزم سے اُٹھ جائیں چراغاں نہ رہے

پانچویں مصرعہ میں لفظ طول بالکل بیکار ہے۔ ظاہر ہے کہ طول، گریہ کی صفت تو ہے نہیں، اور اس کا تعلق شب سے ہے اور " گریۂ طولِ شب " کوئی معنی نہیں رکھتا، صرف " گریۂ شب ہجراں " کافی تھا۔

چوتھا بند ہے :

اپنے گھر در میں نہ غلطاں ہو اگر موج گہر　　لب گلرنگ پہ کھیلے نہ تبسم کا اثر،
نوجوانی کی اگر ناز سے لچکے نہ کمر　　ہم رہیں بحر کی مانند نہ مواج اگر
دہر تابندہ و رخشندہ و رقصاں نہ رہے
ہم اگر بزم سے اُٹھ جائیں چراغاں نہ رہے

پہلے مصرعہ میں " میں " غلط ہے " پہ " ہونا چاہئے، کیونکہ غلطانی سطح چاہتی ہے، اور سطح کے لئے " میں " کا استعمال درست نہیں۔ دوسرے مصرعہ میں لفظ اگر یا اگر کا اظہار ضروری تھا۔ تیسرے مصرعہ کا انداز بیان باقی مصرعوں سے مختلف ہے جو نہ ہونا چاہئے، نوجوانی کی کمر لچکنا، گو کنایتاً غلط نہیں لیکن چونکہ پہلے دو مصرعوں میں " کنائی " انداز بیان اختیار نہیں کیا گیا، اس لئے یہ بالکل الگ تھلگ

نظر آتا ہے۔ اگر بجائے آگی کے "میں" ہوتا تو بھی غنیمت تھا، گو اس صورت میں نوجوانی کی تخصیص بھی بے معنی ہوتی۔
چوتھا مصرعہ بے معنی ہے۔ بحر کی مانند ان کا متواج رہنا کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔

پانچواں بند ہے:

ہم سرِ دوش اگر زلف نہ ہنسکر جھٹکائیں، مسکراتے ہوئے چہروں سے نقابیں نہ اُٹھائیں
اپنی رفتار کو چلتی ہوئی کشتی نہ بنائیں ہم زمیں کو اگر انگڑائیاں لیکر نہ جگائیں،
بحرِ کونین میں طغیانی و طوفاں نہ رہے
ہم اگر بزم سے اُٹھ جائیں چراغاں نہ رہے

دوسرے مصرعہ میں نقابیں کے بجائے نقاب کہنا کافی تھا، تیسرا مصرعہ بدنما تصنع و آورد ہے۔ اور چونکہ پہلے دو مصرعوں کے انداز بیان سے اس کی طرزِ ادا بالکل مختلف ہے اس لئے بند کی سلاست و روانی مفقود ہو گئی — کونین کے استعمال کا کوئی موقعہ نہیں اس کی جگہ جذبات ہوتا تو بہتر تھا

چھٹا بند ہے:

ہم اگر نوعِ بشر کو نہ دکھائیں مشعل، سرد سینوں نہ گرمائیں بجا کر چھاگل
افقِ دل پہ نہ گرجائیں جنوں کے بادل خونِ ہمت میں اگر ہم نہ مچائیں ہلچل
آدمی صف شکن و فاتحِ دوراں نہ رہے
ہم اگر بزم سے اُٹھ جائیں چراغاں نہ رہے

"افقِ دل پر جنوں کے بادل گرجانا" اور "خونِ ہمت میں ہلچل مچانا" نامانوس اندازِ بیان ہے اور یکسر تصنع و آورد، علاوہ اسکے پہلے مصرعہ کا تعلق بند کے پانچویں مصرعہ سے بہت کم ہے۔

چھٹے بند کا ایک مصرعہ ہے:

ہم اگر لعلِ زر افشاں کو نہ دیں اذنِ سخن

اگر بجائے زر افشاں کے گہر بار ہوتا تو بہتر تھا۔

ساتواں بند:

ہم ہر اک گام پہ جھٹکائیں اگر زلفِ رسا، چھوڑ دیں آنکھ جھکانے کی بتانے کی دوا
پلوؤں کو نہ سنبھالیں جب اُڑاتی ہے صبا بے محابا ہم اگر کھول دیں یہ بندِ قبا
دہر میں سلسلۂ چاکِ گریباں نہ رہے

پہلے اور تیسرے مصرعہ میں بیان کا منفی پہلو ہونا چاہئے تھا، یعنی اس طرح: "ہم نہ ہر گام پہ جھٹکائیں اگر زلفِ رسا"

ور

بے محابانہ اگر کھولدیں ہم بندِ قبا

اس صورت میں چوتھے مصرعہ کا "نہ" بھی حذف ہوجائے گا جو محض وزن شعر پورا کرنے کے لئے لایا گیا ہے۔

آٹھواں بند:

ہم ہوں لب بستہ تو غنچے نہ فضائے گلزار
ہم ہوں خاموش تو چہکے نہ گلستاں میں بہار
ہم ہوں روپوش تو دھڑکے نہ دلِ لیل و نہار
ہم اگر جنبشِ مژگاں کا بجائیں نہ ستار
لحنِ دریا نہ رہے نغمۂ باراں نہ رہے

تیسرے مصرعہ میں " ہم ہوں روپوش" کی جگہ " ہم جو چھپ جائیں" کہا جاتا تو بہتر تھا۔ چوتھے مصرعہ کا اندازِ بیان پہلے تین مصرعوں سے بالکل علٰحدہ ہے۔ علاوہ اس کے "جنبشِ مژگاں کا ستار بجانا" بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہم مژگاں کو بھی ستار نہیں کہ سکتے، چہ جائیکہ " جنبشِ مژگاں!"
مژگاں کو چنگ سے تو خیر تشبیہ دے سکتے ہیں، لیکن ستار سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔

آخری بند:

اپنی ان مست نگاہوں میں لئے سو پیغام
اور چھلکا کے ان آنکھوں کے چھلکتے ہوئے جام
کھولکر دوش پہ اُس کاکلِ شب رنگ کے دام
ہم اگر صحنِ چمن میں نہ کریں مشقِ خرام
چرخ پر ولولۂ ابرِ خراماں نہ رہے

پہلے دوسرے مصرعہ میں "ان" اور تیسرے میں "اس" محض وزن شعر پورا کرنے کے لئے لائے گئے ہیں ورنہ کوئی ضرورت نہ تھی۔ دوسرے مصرعہ میں "اور" اگر عطف کے لئے استعمال ہوا ہے تو پھر چھلکتے ہوئے جام کو چھلکانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔
پانچویں مصرعہ میں ولولہ کا لفظ بھی اچھا نہیں ہے، کیونکہ ولولہ کا تعلق دل سے ہے اور یہاں یہ لفظ غالباً رفتارِ ابر کے لئے مستعمل ہوا ہے۔ اگر اس کی جگہ کوئی لفظ "مستی" یا "سیہ مستی" کا مفہوم رکھنے والا ہوتا تو مناسب تھا۔

چین کے موجودہ اقتصادی مشکلات

اور

سکۂ کاغذی کی افراط

یہ بات شاید سب کو معلوم ہے کہ حکومت کی طرف سے جو نوٹ شایع کئے جاتے ہیں ان کی بنیاد سونے کی وہ مقدار ہوتی ہے جو حکومت کے خزانہ میں پائی جاتی ہے اور اگر شایع شدہ کاغذی سکّہ کی قیمت کا ۲۵ فی صدی سونا بھی موجود ہو، تو اسے عام طور پر نہیں کہتے۔ لیکن جب سونا کم ہونے لگتا ہے اور نوٹوں کی اشاعت بڑھنے لگتی ہے تو اسے اصطلاح میں۔ "زر کا افراط" یا "افراطِ زر کاغذی" کہتے ہیں۔ جب یہ صورت پیدا ہوتی ہے تو چیزوں کی قیمت بڑھ جاتی ہے اور یہ افراطِ زر جتنا زیادہ ہوتا جاتا ہے، اتنی ہی گرانی بڑھتی جاتی ہے۔ چونکہ جنگ کے دوران میں افراطِ زر کی یہ صورت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے اس لئے اشیاء بہت زیادہ گراں ہو جاتی ہیں، جس کا دوسرے الفاظ میں یہ مفہوم ہوا کہ نوٹ کی قیمت بہت گھٹ جاتی ہے۔ چنانچہ آپ نے پچھلی جنگ میں دیکھا ہوگا کہ جرمنی کے کاغذی سکّہ (مارک) کی قیمت تقریباً بالکل مفقود ہو گئی تھی اور ایک ہزار مارک میں بھی مشکل سے ایک روٹی خریدی جا سکتی تھی۔

اس وقت بھی دنیا اسی مصیبت میں مبتلا ہے اور ملکوں کے غیر معمولی مصارف بڑھ جانے، صنعتی و تجارتی نظام کے خراب ہو جانے کی وجہ سے اس دشواری کو ہر جگہ بری طرح محسوس کیا جا رہا ہے، لیکن چین کی حالت سب سے زیادہ نازک ہے اور مسلسل سات سال تک جنگ جاری رکھنے کے بعد اگر اس کی حالت نازک نہ ہوتی تو تعجب تھا۔

ایرک سیوریڈ لکھتا ہے کہ میں چین کے ایک ہوائی مرکز میں تھا کہ ہندوستان کی طرف سے کچھ طیارے گہرے سبز رنگ کے آتے ہوئے نظر آئے، ان میں کچھ بمبار جہاز تھے، اور کچھ لڑنے والے۔ علاوہ ان کے چند باربرداری کے بھی طیارے تھے۔ جب یہ جہاز نیچے اترے، تو ان سے بھاری بھاری صندوق اتار کر لاریوں میں لادے گئے اور لاریاں روانہ ہو گئیں ان صندوقوں میں چینی نوٹ تھے جو امریکہ سے آئے تھے۔

اس وقت چین میں دس چینی ڈالر سے کم کا کوئی نوٹ رائج نہیں، کیونکہ اس سے کم میں وہاں کوئی چیز ملتی ہی نہیں اور ہزاروں من کاغذ کے یہ نوٹ امریکہ سے چھاپ کر یہاں بھیجے جاتے ہیں۔

چینی حکومت خود بھی نوٹ چھاپتی ہے، لیکن وہاں چیزوں کی قیمت روز بروز اتنی بڑھتی جاتی ہے کہ ان کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی تعداد میں نوٹ چھاپنا ممکن نہیں اور مجبوراً اس باب میں امریکہ سے بھی مدد لیجاتی ہے۔

اس وقت چین میں کتنی رقم کے نوٹ جاری ہیں۔ اس کا اندازہ غالباً خود حکومت کو بھی نہیں اور اگر ہو بھی تو بتانے کی اسے ہمت نہیں۔

چین کی اس اقتصادی دشواری کو کم کرنے کے لئے چیانگ کائی شیک نے اشیاء کی قیمت کو کنٹرول سے باہر نہیں ہونے دیا، پھر بھی بعض علاقوں میں ۱۵ ہزار فی صدی ان میں اضافہ ہوگیا ہے۔

قانوناً ایک امریکن ڈالر کی شرح تبادلہ ۴۰ چینی ڈالر ہے، لیکن بلیک مارکیٹ میں ۸۰ اور ۹۰ تک پہونچی ہوئی ہے گرانی کا یہ عالم ہے کہ ایک امریکن ڈالر یا ۴۰ چینی ڈالر میں (جو ہندوستان کے ساڑھے تین روپیہ کے برابر ہے) سستے سگریٹ کا صرف آدھا پیکٹ مل سکتا ہے۔ اگر آپ کاغذ کے ۲ تختے خریدنا چاہیں یا [illegible] تک موٹر بس میں جانا چاہیں، تو بھی آپ کو اتنا ہی ادا کرنا پڑے گا

ایک جوڑا جوتا آجکل وہاں ۶۰ امریکن ڈالر (تقریباً ۲۰۰ روپیہ) اور ایک استعمال شدہ برساتی ۲۰۰ امریکن ڈالر (تقریباً ۷۰۰ روپیہ) سے کم میں نہیں مل سکتی۔ اگر آپ کسی ہوٹل میں جائیں تو ایک وقت کے معمولی کھانے کے لئے کم از کم تیرہ امریکن ڈالر (۴۰ روپیہ سے زیادہ) ادا کرنا پڑے گا۔

اگرچہ ریلیں اور بندرگاہیں اس وقت جاپانیوں کے ہاتھ میں ہیں اور چین باہر سے کسی مال کی درآمد نہیں کر سکتا، پھر بھی وہاں کی دوکانیں تکلفات سے بھری ہوئی نظر آتی ہیں مٹھائیوں کے پیکٹ، شربت، ہنگھار [illegible] سنگھار کی چیزیں غرض ہر چیز وہاں کی دوکانوں میں مل سکتی ہے، بشرطیکہ آپ ان کی قیمت ادا کرسکیں۔ یہ تمام چیزیں وہاں ناجائز طور پر شنگھائی اور ٹوکیو سے آتی ہیں۔ یہ تجارت آزاد چین اور جاپانی چین کے درمیان بکثرت رائج ہے اور ہزاروں چینی اور جاپانی اس سے دولتمند ہوگئے ہیں۔

وہاں کھانے کی خاص چیز جس پر چینیوں کی زندگی کا انحصار ہے چاول ہے اور اس پر کنٹرول قائم رکھنے کی بڑی کوشش کی گئی ہے۔ پھر بھی وہاں پچھلے سال مارچ اور ستمبر کے درمیان قیمت سہ چند ہوگئی، یعنی ۱۰ پونڈ چاول بجائے ۵۰۰ چینی ڈالر کے ۱۵۰۰ ڈالر میں فروخت ہوا۔

تنخواہ پانے والے ملازمین کی حالت افراط زر کے زمانہ میں بہت خراب ہوجاتی ہے، چنانچہ یہاں بھی یہ حد درجہ غربت کی حالت میں نظر آتے ہیں اور اگر یہاں کی حکومت خود چاول خرید کر اپنے ملازموں کے ہاتھ فروخت نہ کرے تو یہ زندہ نہیں رہ سکتے۔

مزدوری پیشہ والے البتہ اس وقت بہت خوشحال ہوگئے ہیں۔ چنانچہ رکشا چلانے والا ملازم آپ کو وہاں مشکل ہی سے کوئی مل سکتا ہے، کیونکہ وہ خود کم از کم ۲ ہزار چینی ڈالر ماہوار کما رہا ہے۔ ننگے بدن پھرنے والے قلی بھی بس میں سوار ہوکر آتے جاتے ہیں اور ۱۵ ڈالر کرایہ ادا کرتے ہیں۔

ایک سال اُس طرف امریکہ نے چین کو ۵۰ کروڑ امریکن ڈالر قیمت کا مال قرض دینے کا وعدہ کیا تھا، لیکن ان دونوں ملکوں کے درمیان تجارت نہ ہوسکنے کی وجہ سے، چین اس سے کوئی فایدہ نہ اُٹھا سکا، اس لئے یہاں کی اقتصادی حالت درست کرنے کے لئے ۴ کروڑ ڈالر کا سونا بھیجنا تجویز ہوا ہے، جس کے لیجانے کے لئے تقریباً سو ہوائی جہازوں کی ضرورت ہوگی

چینی حکومت اس سونے کو کس طرح صرف کرے گی اس کا پتہ نہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ مزید نوٹ شایع کرے، یا بحساب دس ہزار چینی ڈالر فی اونس فروخت کرکے فایدہ اٹھائے لیکن اس صورت سے یہ سونا جاپان چلا جائے گا، کیونکہ سونا خریدنے والے جاپانی مقبوضات کے ہوں گے۔

مسٹر آرتھر ڈوف نے یہاں کا دورہ کرکے اندازہ کیا ہے کہ ۸ فی صدی آدمی اسوقت تک فاقوں سے مر چکے ہیں اور پچھلے نومبر تک دس ہزار بچوں کو اللہ مرجانا چاہئے۔

وہاں کی حکومت نے فوجی مصارف کے لئے ٹیکس قایم کیا ہے اور اس سلسلہ میں بعض کاشتکاروں سے تقریباً تمام پیداوار لے لیجاتی ہے لیکن چونکہ حکومت غلہ خود خرید کے فروخت کرتی ہے، اس لئے چاول کسی نہ کسی طرح سب کو ملجاتا ہے۔

چین کی ۸۵ فی صدی آبادی کاشتکار ہے اور اپنی زندگی کے لئے وہ کافی غلہ پیدا کرلیتی ہے اس لئے خیال کیا جاتا ہے کہ کم ازکم دو سال تک اور ان شداید کو برداشت کیا جا سکتا ہے۔ اور وہاں کے کاشتکار اسٹازمانہ کسی نہ کسی طرح بسر کردیں گے اس کے بعد اگر گرانی کا یہی عالم رہا تو بجائے نوٹ کے غلہ کے عوض میں خرید وفروخت جاری ہوگی، لیکن اس کے معنے یہ ہوں گے کہ حکومت کی ساکھ بالکل ختم ہوگئی اور اس طرح پھر وہی خانہ جنگی اور آپا دھاپی شروع ہو جائے گی جو پہلے پائی جاتی تھی۔

بہرحال چین اسوقت تک جتنی قربانیاں کر چکا ہے، ان کا اندازہ آسان نہیں اور اگر اس کی تلافی نہ ہوسکی، تو ایشیا کا یہ اتنا بڑا انقلاب ہوگا کہ اس سے یوروپ وامریکہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہیں گے۔ اسی لئے برطانیہ وامریکہ انتہائی کوشش کر رہے ہیں کہ چین کسی نہ کسی طرح زندہ رہے، کیونکہ چین کی زندگی دراصل جاپان کی موت ہے اور جاپان کی موت دُنیا کے امن وسکون کے لئے ضروری ہے۔

باب الاستفسار

مسلم لیگ اور ہندو مسلم اتحاد

(جناب ام۔ اے۔ صمد ملک۔ جہان آباد۔ گیا)

آپ کے ملاحظات جو "نگار" میں ماہ مئی سنہ ۴۲ء شایع ہوئے ہیں بغور اور نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھے۔ آپ کی ہستی واقعی ہندوستان کے لئے ایک مایۂ ناز ہستی ہے۔ اُردو کی جو جو آپ نے بیش قیمت خدمتیں کی ہیں ان سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن جہاں تک آپ کے خیالات کا تعلق ہے، ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ آپ کے خیالات کو زیادہ تر لوگ ناپسند کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ بات آپ کو ناگوار معلوم ہو لیکن چونکہ ہم بد قسمتی سے صاف گو واقع ہوئے ہیں، اس لئے اپنے خیال کو صاف صاف ظاہر کر دیا۔ امید ہے کہ آپ میری اس گستاخی کو معاف فرمائیں گے۔

آپ کے مضمون سے یہ صاف ظاہر ہے کہ آپ ہندو مسلم اتحاد کے لئے مذہب کو نظر انداز کر دینا بہتر سمجھتے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ خیال آپ کے دماغ میں کیونکر آیا۔ مشکل یہ ہے کہ آپ صوبۂ بہار کے باشندہ ہی نہیں ورنہ پتہ چل جاتا کہ واقعی ہنود و مسلمانوں کے کبھی سچے دوست نہیں ہو سکتے ہیں۔ آپ تو اتحاد کے لئے اس قدر ایثار کرنے کو طیار ہیں۔ لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ہنود اپنے مذہب کو اتحاد کے قربانگاہ پر چڑھانے کے لئے کبھی کبھی طیار نہیں ہو سکتے۔ جب یہ بات مسلم ہے، تو پھر آپ اپنا مذہب ہنود کے لئے نیست و نابود کرنے پر کیوں طیار ہیں! ہنود تو چاہتے ہی ہیں کہ اسلام کا خاتمہ ہو جائے۔ اگر آپ بھی ان کا ساتھ دیدیجے گا، تب تو اسلام کا کام ہی تمام ہو جائے گا۔

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ پاکستان اسکیم کا دوسرا نام لاہور رزولیوشن ہے اور یہی وہ نام ہے جس کو مسلم لیگ کانفرنس میں لوگوں نے عام طریقہ سے پسند کیا تھا۔ اس تجویز کا نام "پاکستان" ہنود کا رکھا ہوا ہے۔ جو خود ہی مسلمانوں کی آبادی کے علاوہ اپنی آبادی کو ناپاک سمجھے اس کو آپ کہاں تک روک سکتے ہیں ــــ ہمارے اس خط کے لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی ہمدردی مسلمانوں کے ساتھ ہونی چاہئے۔ آپ کے پرچے کے پڑھنے والے زیادہ تر مسلم لیگی ہیں۔ اگر یہ لوگ آپ سے رنج ہو گئے، تو آپ کے پرچے کا کیا حشر ہوگا، آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں ــــ امید ہے کہ جواب دیکر ممنون و مشکور فرمائیں گے۔

(نگار) مجھے یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ "صاف گو" ہیں لیکن اگر آپ اسی حد تک "راست گو" بھی ہوتے، تو

اور زیادہ مسرت ہوتی۔

میں نے مئی کے ملاحظات میں کب یہ مشورہ دیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے "ترک مذہب" جایز یا ضروری ہے؟ حالانکہ اگر میں ایسا کہتا تو بھی غلط نہ ہوتا کیونکہ "مذہب اسلام" تو فی الحقیقت اسی وقت رخصت ہو چکا تھا جب رسول اللہ کی رحلت کے بعد قدیم قبایلی مخالفت کے آثار عرب میں شروع ہوئے اور بنو امیہ کے عہد میں "مذہب اسلام" کی جگہ کھلم کھلا "حکومت اسلام" نے لیلی۔ پھر اب کہ نہ مذہب ہے نہ حکومت نہ مذہب و حکومت کے نام سے کسی قسم کا اتحاد و اقتدار آپ کے پاس وہ کونسی چیز ہے، جس کے ترک کا مشورہ دوں گا

ہے کیا جو کس کے باندھئیے میری بلا ڈرے   کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں

ہاں، آپ کا ایک کلچر ضرور قایم ہو گیا ہے، سو وہ بھی آپ کی حکومت و اقتدار کے زمانہ کی یادگار ہے، بے درجہ مسرفانہ اور بے انتہا نا عاقبت اندیشانہ اور اب اس کا وزن برداشت کرنے کی آپ میں تاب نہیں۔ لیکن خیر، اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم مان لیں کہ "مذہب اسلام" اسی ظاہرداری، اسی واہمہ پرستی اور اسی سطح اندیشی کا نام ہے جو آجکل نظر آتی ہے، تو بھی ہندو مسلم اتحاد کے لئے میں نے اس کے ترک کرنے کا کبھی مشورہ نہیں دیا۔ آپ دن میں ہزار بار اذان دیجئے اور لاکھ بار نمازیں پڑھئے، کوئی منع نہیں کرتا، لیکن اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اذان کی آواز ایک خشک و تشنہ حلقوم ہی سے نکلنے کے بعد عرش معلیٰ تک پہونچ سکتی ہے، اگر آپ کا یہ اعتقاد ہے کہ صرف وہی نماز بارگاہ قدس میں باریاب ہو سکتی ہے، جو ایک فاقہ زدہ اور خراب و خستہ انسان کی طرف سے پیش کی جائے، تو بیشک میں اس کی مخالفت کروں گا، کیونکہ میری رائے میں اسلام کی اس سے زیادہ توہین اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس کا ماننے والا دنیا میں ذلیل و تباہ نظر آئے۔

میں نے مئی کے ملاحظات میں یہ عرض کیا تھا کہ اصل چیز ملک کی آزادی ہے اور وہ اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب "وطنیت" پر اس کی بنیاد قایم کی جائے، کیونکہ "مذہبیت" اس باب میں ناکام ہو چکی ہے، لیکن اس کے یہ معنے تو نہیں کہ آپ نماز روزہ چھوڑ دیں جو آپ کے نزدیک عین اسلام ہے اور ایک حد تک بے ضرر بھی اگر آپ صدائے ناقوس سن کر پیشانی پر بل لے آنا فریضۂ مذہبی نہ قرار دیں!

میں مانتا ہوں کہ ہندو مسلم تعلقات اب اس قدر خراب ہو گئے ہیں کہ ان کی اصلاح بظاہر بہت دشوار نظر آتی ہے۔ اسی کے ساتھ میں اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں کہ ہندوؤں نے حکومت کانگرس کے زمانہ میں نہ صرف صوبۂ بہار بلکہ یو۔پی اور سی۔پی میں بھی مسلمانوں پر بعض نامناسب زیادتیاں کیں — لیکن بایں ہمہ یہ بات کبھی میری سمجھ میں نہ آئی کہ یہ چیز آزادی ملک کی راہ میں کیوں حایل ہو اور مسلمان اس خوف سے کہ آزاد ہونے کے بعد ہندو اُن پر اور زیادہ مظالم کریں گے، غیر ملکی حکومت کی غلامی کو کیوں گوارا کرتے رہیں۔

آپ فرمائیں گے کہ مسلمان خود ملک کی آزادی چاہتے ہیں، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اُن کا پاکستان، ملک کے دوسرے ملکیہ سے علحدہ کر دیا جائے، تاکہ وہاں وہ اپنی آزاد حکومت قایم کر سکیں جس کا نام انھوں نے حکومت الٰہیہ رکھا ہے۔ یہ خیال بُرا نہیں، لیکن ناقابل عمل ضرور ہے اور ان سب پر بحث ہو چکی ہے۔

اگر آج پنجاب، صوبہ سرحد اور سندھ کا پورا ٹکڑا پاکستان کے نام سے علحدہ کر دیا جائے تو سوال یہ ہے کہ آیندہ وہ

اس خطرہ سے کب آزاد ہو سکتا ہے، کہ ہندو چڑھائی کر کے پھر اپنے قبضہ میں لے آئیں گے اور اگر یہ نہ بھی ہو تو کیا سیاسی صنعتی، تجارتی و اقتصادی حیثیت سے وہ کوئی ایسی کنفیں بالذات حکومت بن سکتا ہے، جو ہندوستان کے دوسرے حصوں سے بالکل بے نیاز ہو جائے ...... یہی وہ چیز تھی جس کی بناء پر محمد علی جینا کو یہ کہنے کی ضرورت ہوئی کہ برطانیہ انھیں پاکستان بھی دے اور پاکستان قایم رہنے کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے۔ اس سے زیادہ مختصر خواہش اس سے بہتر تدبیر حصول پاکستان کی اور کیا ہو سکتی تھی سچ ہے:

کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے

آپ نے لفظ پاکستان کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ یہ خود ہندوؤں کا بخشا ہوا لقب ہے۔ میں اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں، لیکن اگر صحیح ہو تو بھی اس کا کیا جواب ہے کہ اس وقت تک کسی رکن مسلم لیگ نے اس سے خلاف آواز بلند نہیں کی۔ ان کو چاہئے تھا کہ وہ اس بات کا اعلان کر دیتے اور قاید اعظم کے دفتر قیادت سے ایک فرمان جاری ہو جاتا کہ آیندہ مسلم لیگ کے لٹریچر میں اور مسلم لیگیوں کی زبان پر یہ لفظ کبھی نہ آئے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا اور یہ داغ ہمیشہ کے لئے ان پر قایم ہو گیا کہ اس نام کے اختیار کرنے میں، اس ذلیل ذہنیت کو پیش کیا جسے ...... Inferiority Complex میں مبتلا ہونے پر قوموں نے ہمیشہ پیش کیا ہے۔

مسلمان کیا کریں

(جناب عبدالواحد صاحب - مٹیا برج کلکتہ)

"مسلمان کیا کریں" اس موضوع پر کافی بحثیں ہو چکی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب یہ موضوع اتنا پامال ہو گیا کہ اس پر غور و فکر ضروری نہیں۔ مسئلہ جتنا اہم ہوتا ہے، اتنا ہی اس پر نقد و تبصرہ کرنا ضروری ہے۔ چند باتیں غور طلب ہیں۔

مسلمان اگر ایک پلیٹ فارم پر آ جائیں تو اس سے بہتر اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ مسلم لیگ اگرچہ مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت تسلیم نہیں کی جا سکتی تو کم از کم اتنا تو ضرور ماننا پڑے گا کہ مسلمان اکثریت مسلم لیگ میں شامل ہے، لہٰذا مسلم لیگ ہی کا پلیٹ فارم ہے جہاں ہندوستان کے سارے مسلمان متحد ہو سکتے ہیں۔ رہا سوال مسلم لیگ کی بے عملی، سرکار پرستی، اور ذاتی بغض و عناد کا تو یہ سب ہے، آزادی پسند اور بے لوث عملی مسلمان سے، جب تک مسلم لیگ خالی ہے ایسا ہی ہو گا۔ جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمان کانگریس کے پلیٹ فارم پر اس طرح آ کر چھا جائیں کہ ہندوؤں کو ظلم کرنے کا موقعہ ہی نہ دیا جائے، اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے، عملی مسلمان مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر اس طرح آ کر چھا جائیں کہ اس کی بے عملی کا خاتمہ ہو جائے۔ مسلم لیگ ذہنی بھی ہے جو کچھ ہے مسلم اکثریت اس کے ساتھ ہے اور رہا ہے، اکثریت خواہ جتنی بھی گمراہ ہو، چھوڑی نہیں جا سکتی۔ سوال اس کا نہیں ہے کہ

چند مسلمان آزادی اور وطن کی خاطر قربانیاں پیش کرکے، اپنا نام روشن کرلیں۔ سوال پوری مسلم قوم کا ہے اور اس کی اصلاح اسی طرح ممکن ہے کہ مسلم اکثریت صحیح راستہ پر لگ جائے۔ ظاہر ہے مسلمان مسلم لیگ سے باہر رہ کر مسلم لیگ کو راستہ دکھانے کا مستحق نہیں اور نہ اس کی بات پر کوئی لیگی کان دھرنے لگا۔ جب صورت حال یہ ہے تو کیا یہ مستحسن نہیں کہ ہر ممکن طریقہ پر مسلمان کوشش کرے کہ سارے مسلمان مسلم لیگ میں آجائیں۔ سوال مسٹر جناح کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا بھی نہیں۔ سوال وہی مسلم قوم کا ہے۔ اور ظاہر ہے جہاں قوم کا سوال ہے، وہاں انفرادی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کوئی معنی نہیں رکھتی۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے، مسلم لیگ کا نصب العین غلط ہے، اس لئے اس کا ساتھ دینا بیکار ہے۔ خود غلط راستہ پر جارہی ہے، ظاہر ہے سب کو "کعبہ" پہونچانے کے بجائے "ترکستان" پہونچا دے گی۔ اس اعتراض کو صحیح مان لیا جائے، تو بھی ہمیں "مسلم اکثریت" کا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہئے۔ ہمیں "پھانس" نکالنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اُسے نہ نکالنے کا مطلب یہ ہوگا کہ پورا جسم فاسد ہوجائے گا۔ یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ مسلم لیگ اب ڈھائی نہیں جاسکتی۔ یہ مٹ نہیں سکتی، اُبھر رہی ہے، خواہ جس طرح اُبھرے — لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے۔

(۱) مسلم اکثریت اگر گمراہ ہے، تو اس کی اصلاح کی کیا صورت ہے۔

(۲) جو غیر لیگی مسلمان، مسلم لیگ کو نہیں مانتے۔ مسلم اکثریت کو بچانے کے لئے، ان کا کیا رویہ ہونا چاہئے۔

(۳) جو مسلمان مسلم لیگ میں ہیں اور مسلم لیگ سے خوش ہیں اور اصلاح چاہتے ہیں، انھیں کیا کرنا چاہئے۔

(۴) مسلمان کس طرح ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوسکتے ہیں۔

نگار) صفحات ماسبق میں جو کچھ عرض کرچکا ہوں، اس میں اجمالاً آپ کے سوالوں کا جواب آچکا ہے، لیکن چونکہ بعض سوالات آپ نے نہایت صاف صاف کئے ہیں، اس لئے ان کا صاف صاف جواب دینا بھی ضروری ہے۔

۱۔ مسلم لیگ بیشک مسلم اکثریت کی نمایندہ ہے، لیکن کوئی شخص یا جماعت نمایندگی کے صحیح فرایض اس وقت تک انجام نہیں دے سکتی، جب تک وہ قوم کے لئے کوئی مفید لائحۂ عمل متعین کرکے اس پر کاربند نہ ہو۔ افسوس ہے کہ مسلم لیگ نے اس وقت تک کوئی تعمیری پروگرام پیش نہیں کیا، اس وقت تک اس نے جو کچھ کیا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی دیوار کو اور زیادہ مستحکم کردیا اور اس طرح ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ کو زیادہ اُلجھن میں ڈالدیا۔

مسلمانوں کی دو حیثیتیں ہیں، ایک ہندوستانی ہونے کی، دوسری ہندوؤں سے علٰحدہ ایک دوسری قوم ہونے کی۔ اول حیثیت کے لحاظ سے ان کا فرض ہے کہ وہ ہندوؤں سے ملکر کام کریں اور دوسری حیثیت سے ان کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کی ترقی کے لئے جو مفید تدابیر مناسب سمجھیں ہندوؤں سے علٰحدہ عمل میں لائیں۔ لیکن اس وقت تک مسلم لیگ نے نہ یہ کیا نہ وہ۔

اس کو چاہئے کہ وہ آزادی کے مسئلہ میں بالکل غیر مشروط طور پر ہندوؤں کے ساتھ ہوجائے اور قومی تعمیر کے سلسلہ میں وہ سب سے پہلے مسلمانوں کے لئے ایک اقتصادی پروگرام طیار کرے اور جیسا کہ میں نے بارہا ظاہر کیا ہے اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے زکوٰۃ فنڈ کی تشکیل کرے اور غیر ضروری بلکہ ناجائز خیرات کا جو طریقہ (مختلف رسوم کے سلسلہ

میں) رواج پاگیا ہے، اسے دور کر کے ایک مرکزی بیت المال قایم کرے۔ اگر مسلمانوں کی آبادی سے اس فنڈ کے لئے فی کس اوسطاً کم از کم ایک روپیہ سالانہ بھی وصول ہو تو ۹ کرور کی رقم ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ اتنی بڑی رقم سے ہر سال سیکڑوں تعلیمی و صنعتی ادارے مسلمان بچوں کے لئے قایم ہو سکتے ہیں اور دس سال کے اندر قوم کی تعلیمی و اقتصادی حالت کچھ سے کچھ ہو سکتی ہے۔

اگر مسلم لیگ صرف ایک اسی مسئلہ کو سامنے رکھ کر جد و جہد کرتی تو اس وقت تک یہ تنظیم مکمل ہو جاتی اور قومی حیثیت سے مسلمانوں کی اہمیت اتنی بڑھ جاتی کہ شاید پاکستان کا مسئلہ بھی آسانی سے طے ہو جاتا۔

ہندؤں کے ساتھ مل کر ملک کی آزادی چاہنے میں مسلم لیگ کو خوف ہے کہ ہندو اپنی اکثریت سے کام لیکر مسلمانوں کو اقتصادی نقصان پہونچائیں گے اور ان کی مذہبی آزادی میں مخل انداز ہوں گے۔ اس خوف کی اگر زیادہ وضاحت کیجائے تو دوسرے الفاظ میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ:

۱۔ ہندو گائے کی قربانی بند کرا دیں گے۔
۲۔ اذان و نماز کے وقت وہ ناقوس بجائیں گے، جلوس نکالیں گے۔
۳۔ مسلمانوں کو ملازمتوں سے محروم کر دیں گے۔

ان کے علاوہ میری سمجھ میں اور کوئی بات نہیں آتی جس کا خوف ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ باتیں واقعی اتنی ہی اہم ہیں، جتنی سمجھی جاتی ہیں۔

اول تو یہ تمام اندیشے بالکل بے بنیاد ہیں لیکن اگر ہم ان کو صحیح سمجھ لیں تو بھی نہ ان سے مذہبی آزادی میں کوئی فضل پڑتا ہے اور نہ اقتصادی حیثیت سے کوئی نقصان پہونچ سکتا ہے۔

اول تو مذہب نام اذان و نماز کا نہیں، اور اگر ایسا ہو تو بھی جب تک ان سے آپ کو بیر اُروکا نہ جائے، مذہبی خلل انداز نہیں کہا جا سکتا۔ اگر ہندو نماز یا اذان کے وقت ناقوس بجاتے ہیں یا اپنا کوئی جلوس نکالتے ہیں، تو آپ کو بھی دوسروں کا یہی حق حاصل ہے جبکہ وہ اپنے ناقوس یا آرتی کے وقت آپ کو اذان و نماز سے نہیں روکتے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ نماز و اذان میں کوئی ایسا ہنگامہ نہیں کہ کسی دوسرے کے مشاغل میں حرج واقع ہو اور ناقوس و آرتی وغیرہ کا ہنگامہ یکسوئی میں خلل انداز ہوتا ہے۔ لیکن یہ مطالبہ کہ ہونا ہے کہ مطالبہ اخلاقاً تو صحیح ہو سکتا ہے، لیکن قانوناً نہیں اور اخلاقی مطالبہ ہمیشہ میل جول کے بعد ہی ہو سکتا ہے، نہ کہ بگاڑ کے بعد۔

رہا سوال ملازمت کا، سو میں اس کو انتہائی خوش بختی سمجھوں گا اگر مسلمان ہمیشہ کے لئے نوکری سے محروم کر دئے جائیں، کیونکہ اس قوم کی پستی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ سوائے ملازمت کے کوئی دوسرا ذریعہ معاش یہ اختیار نہیں کرتی اور اس طرح تجارت کی طرف سے وہ بالکل بیگانہ ہو گئی ہے جو اسلام کا بتایا ہوا تنہا ذریعہ معاش تھا۔

بہرحال ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ آزادی کامل کے باب میں تقسیم کا فیصلہ کر کے ہندؤں سے علاحدہ نہ چاہیں، کیونکہ اس طرح مقصود بھی حاصل نہ ہوگا اور یہ مسلمانوں کی بڑی نادانی کا ثبوت ہوگا کہ انھوں نے محض اپنی کمزوری اور خوف کی وجہ سے ملک کو آزادی سے محروم رکھا اور دوسری قوموں کی نظر میں ذلیل ہوئے۔

حایل ہوئے کہ وہ خود اپنے لئے کوئی صحیح راہ قایم نہ کر سکے تھے۔

اب رہ گیا قوم ہونے کی حیثیت سے ان کا اپنے آپ کو منظم کرنا، سو یہ نہ صرف مستحسن بلکہ ضروری ہے اور مسلم لیگ کو یہی پہلو سامنے رکھکر تنظیم کرنا چاہئے۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ہمارے رہناؤں کا اولین فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کی تعلیمی و اقتصادی پستی کو دور کرنے کی کوشش کریں اور حکومت کی اعانت سے بالکل بے نیاز ہو کر کریں۔ اس کی بہترین تدبیر ایک تو وہی ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا کہ مسلمانوں کا ایک بیت المال قایم ہونا چاہئے اور اس کی صورت یہ ہے کہ پہلے ان کی خانہ شماری کر کے ہر شخص کی آمدنی معلوم کر لیجائے اور پھر اُن سے ایک مقررہ رقم ماہانہ یا سالانہ وصول کر کے شہر کے بیت المال میں جمع کی جائے، جس کی تنظیم ایک کمیٹی کے سپرد ہو، اور شہروں کی ان کمیٹیوں کی نگرانی صوبہ کے کسی صدر مقام کی کمیٹی کے سپرد ہو اور صوبوں کی کمیٹیاں ایک ایسی مرکزی کمیٹی کی نگرانی میں رہیں جو اس تمام نظام کی واحد ذمہ دار ہو۔

بیت المال قایم ہونے کے بعد دوسرا اہم سوال صرف کا ہے، سو اس کا تعلق شہر، صوبہ اور مرکز میں ہر جگہ ایک ایسی مجلس شوریٰ سے ہونا چاہئے جو مسلمانوں کے تمام طبقات کی نمایندہ جماعت ہو اور بجائے انفرادی مصالح کے اجتماعی ضروریات کو سامنے رکھکر خرچ کرے۔

بہرحال مسلمانوں کی فلاح اور اصلاح کے لئے میرے نزدیک سب سے پہلے ہمیں ان کی اقتصادی و تعلیمی حالت کو درست کرنا چاہئے اور اس کے لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بہتر کوئی اور صورت نہیں ہو سکتی۔

اسی کے ساتھ دوسری کوشش یہ بھی ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کو واہمہ پرستی اور بیجا قدامت پرستی سے بچایا جائے کیونکہ ان کی آمدنی کا بڑا حصہ اسی لغویت میں ضایع ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا جہاد مسرپرستی، قبرپرستی اور ملاپرستی کے خلاف کرنا ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ اول اول بہت دشواریاں پیش آئیں گی، لیکن نہ ایسی کہ ان کا دور ہونا عقلاً محال ہو۔

باب المراسلہ والمناظرہ

میرزا یگانہ چنگیزی نے مئی کے نگار میں سید صفدر حسین کا مقالہ دیکھ کر اپنے تاثرات کا اظہار جن الفاظ میں کیا ہے، ملاحظہ ہو:

بے حیا اقبالچی

کرمفرمائے بندہ سلام علیکم ۔ ذرا اس بے حیا کی بکواس ملاحظہ تو فرمایئے کہتا ہے:

(۱) "سنہ ۱۹۳۵ء تک اصغر، جگر، صفی، عزیز، حسرت اور فانی کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ آپ غزل کو حسن وعشق کی تعبیر سے زیادہ وسعت دینا نہ چاہیں تو کہہ لیجئے کہ اس منزل پر آکر غزل ختم ہو گئی۔ لیکن اس میں حیات وکائنات کے مسایل کا سمونا جرم نہ ہو تو غزل اب بھی اپنی پوری عظمتوں کے ساتھ زندہ ہے"

مگر یہ کس کے دم سے ؟ یگانہ کے دم سے۔ غزل میں حیات وکائنات کے مسائل کو سمونے کا تجربہ تمھیں کہاں ہوا ؟ آیات وجدانی میں یا اور کہیں ؟ غزل کا یہ معیار اس بیسویں صدی میں کس نے مکمل کر دکھایا۔ یگانہ نے یا اور کسی نے ؟

(۲) "نئے ادب کی دستبرد سے غزل کی دایمی مقبولیت کو جو شخص بچا کر آگے بڑھا لایا"۔

وہ کون تھا ؟ کیا یگانہ کے سوا اور کوئی ہو سکتا تھا ؟

"اُردو غزلوں کو نئی قدریں عطا کیں ۔ پُرانی قدروں کو نئی صورت دی ۔ غزلوں کی زبان لہجہ اور آہنگ بدلا۔ نئے مفہوم اور تنوع خیالات کی گنجائشیں پیدا کیں ۔ اسے رہبری اور بصیرت کا ذریعہ بنا کر دل و دماغ کو بیدار کیا اور یہ حیثیت مجموعی غزل کو تعمیری ادب کی شان دیدی"۔ وہ کون تھا ۔ کیا یگانہ کے سوا اور کوئی ہو سکتا تھا ؟ موجودہ غزل کی مذکورۂ بالا خصوصیات اور ان خصوصیات کے علاوہ اور بہت سی خصوصیات جو اس بیسویں صدی میں حاصل ہوئیں وہ کس کے دم سے ۔ کیا یگانہ کے سوا اور کوئی اس کی اہلیت رکھتا تھا ۔ ظاہر ہے کہ غزل کی یہ تعمیری حیثیت یگانہ آرٹ ہی کے مطالعہ سے ملک پر ثابت ہوتی رہی ہے اور ارباب نظر نے یگانہ کی قوت خداداد کا اعتراف بھی کیا ہے مگر اس بے غیرت بے حیا بدنصیب اقبالچی نے یگانہ کے اس تمام کارنامے (نگار بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۶۴ء میں) کس بے حیائی کے ساتھ اقبال کی طرف منسوب کر دیا ہے ۔ ڈاکٹر اقبال نے [illegible]یات کے ذریعہ سے جو تعمیری کام کیا ہے وہ مسلم سہی مگر اُن کی غزل کیا اعتبار رکھتی ہے اپنی غزلوں کے متعلق خود اقبال نے نہ کوئی ایسا جھوٹا دعویٰ کیا نہ کسی پنجابی نے نہ اور کسی ذمہ دار اہل نظر نے ۔

(۴) پھر کہتا ہے: ۔ اقبال کے بعد جس شخص کے ہاں غزل میں تھوڑے بہت کچھ ایسے ہی احساسات ملتے ہیں وہ

فراق میں بالکل جھلک میرزا یگانہ کے ہاں کسی وقت پائی جاتی تھی مگر اب وہ بھی نہیں"
لعنت ہے اقبال کی اس جھلک پر۔ تھو۔ آجتک کسی دشمن نے میرزا یگانہ کی ایسی توہین نہیں کی۔ خیر یہ بھی سہی۔
یہی وہ قوم ہے جو علی جیسی جلیل القدر ہستی کے مراتب پر خاک ڈالتی رہی اور اُن کا حق تلف کرتی رہی۔ یہی وہ قوم ہے جس نے علی کو معزول کرکے معاویہ کو امیر المومنین اور پیغمبر کا جانشین بنا دیا۔ لاحول ولا قوۃ۔ ان بدنصیبوں کو اس کا کچھ احساس نہیں کہ اس قسم کی بےحیائی اور بے ایمانی اسلام پر اک زہریلے زخم کا اثر چھوڑ جاتی ہے۔ افسوس

۲۰ جون ۱۹۳۶ء

میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی
غوری منزل۔ حیدر گوڑہ۔ حیدر آباد دکن

(**نگار**) اس تحریر میں خطاب دراصل سید صفدر حسین ام۔ اے سے کیا گیا ہے، اور انھیں کو اس کا جواب دینا چاہئے، لیکن ہم نے نگار میں اس کی اشاعت اس لئے ضروری سمجھی کہ مبادا میرزا یگانہ کو ہم سے بھی یہ شکایت پیدا ہو جائے کہ اُنکے ان "انتقادات عالیہ" سے ہم نے پبلک کو محروم رکھا۔

میرزا یگانہ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ درست ہو یا غلط اسوقت ہمیں اس سے بحث نہیں، لیکن اُن کو ہم اس امر سے آگاہ کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ جس قفس کو انھوں نے بے غیرت۔ بدنصیب۔ بےحیا اور ملعون وغیرہ کے الفاظ سے یاد کرتے ہوئے دشمنانِ علی اور حامیانِ معاویہ میں شمار کیا ہے، وہ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے میرزا یگانہ ہی کا ہم مذہب ہے اور انھیں کی طرح شیعیانِ علی میں اس کا بھی شمار ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میرزا یگانہ کو یہ سنکر زیادہ غصہ آئے، اور وہ کچھ اور نئے القاب اس کے لئے تجویز فرمائیں، لیکن اگر ایسا ہوا، تو بُرا نہ ہوگا، کیونکہ اس سے اگر کوئی اور فائدہ نہ ہوا تو ترقی پسند لٹریچر کے بعض آزاد حامیوں کو کم از کم یہ تو معلوم ہی ہو جائے گا کہ ترقی پسندی کی جو سطح ان کے سامنے ہے، وہ ہنوز بہت پست ہے، اور اگر انھوں نے اس سلسلہ میں کوئی اور دلیرانہ قدم اُٹھایا تو وہ میرزا یگانہ کی اس تحریر کا حوالہ دیکر معترضین سے کہہ سکتے ہیں کہ:

فتوائے مے ز ساقیِ کوثر گرفتہ ایم !

خلافتِ الٰہی

شہرِ جلیل[1] کے قریب ایک وادی سے آواز آتی ہے:

یہ آزمایشِ طاقت یہ شوقِ خود نگری — یہ ظلم و جہل کا طوفاں یہ زعم بے خبری
سیاسیات کے دھوکے یہ مصلحت کے فریب — خرد تراش رہی ہے مسایلِ نظری
ہوس کے ہاتھ میں اب بھی ہے تیغِ خوں آشام — لہو سے کھیل رہی ہے جنوں کی بے جگری
کہاں ہدایتِ درسِ خروج[2] و استثنا[3] — کہیں کہیں نظر آتے ہیں کتبۂ حجری[4]
مکاشفات[5] کی گرمی نہ سوزِ یوحنا — کمال بے بصری و تمام بے اثری
مری نگاہ میں تھی صلح و آشتی کی بہار — مرے نفس نے کھلایا تھا غنچۂ سحری
نہ برگ و بار ہی باقی نہ وہ ہوائے نشاط — مرے نہالِ تمنا کی ہائے بے ثمری
مرے ضمیر پہ وہ راز ہو چکے ہیں فاش — نہیں ہوئی ہے زمانہ میں جن کی پردہ دری

(اس آواز کے بعد فضا میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے زمان و مکاں کے پردے اُٹھتے چلے جاتے ہیں عالمِ آب و گل اور عالمِ برزخ کے درمیان اجسام و ارواح کا جھرمٹ سا نظر آتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا زمان و مکاں کو ٹھہرا دیا گیا اور ماضی و حال کا فرقِ زمانی باقی نہیں رہا۔ سایہ پر زیتون کے درخت کی شاخیں ہل رہی ہیں۔۔ اتنے میں شخصیتیں نمودار ہونے لگتی ہیں۔)

نپولین: سمندِ عزم مرا شوخ و تیز گام بھی تھا — کہ میرے قلب میں اک جوشِ انتقام بھی تھا
مرے خیال میں طوفاں تھے فتحمندی کے — مری نگاہ میں انساں کا احترام بھی تھا
نہ صرف تیغِ جہاں گیر میرے ہاتھ میں تھی — مری زباں پہ روح القدس کا نام بھی تھا
وہ نسل و رنگ کی کشتی وہ قومیت کا جہاز — اسی میں آپ کا یہ نا سزا غلام بھی تھا

پرنس بسمارک: بہت زمانہ سے تھی انتہائے پستی میں — وہ قوم جس کو مجھے سر بلند کرنا تھا
مرے جنوں کی یہ شوخی معاف ہو جائے — کہ ایک کوزے میں طوفاں کو بند کرنا تھا
فریب و فتنہ کی اس کشمکش میں امن کہ جنگ — تمھیں بتاؤ مجھے کیا پسند کرنا تھا

---

[1] گلیلی — وہ شہر جہاں حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام نے وعظ فرمایا تھا — [2،3] مقدس توریت کی دوسری اور پانچویں کتابیں — [4] آیاتِ توریت عبرانی زبان میں کہیں کہیں لکھی ہوئی نظر آتی ہیں — [5] مکاشفاتِ یوحنا — جن کو حضرت مسیح کے مواعظ کا تتمہ سمجھا جاتا ہے۔

گلیڈسٹن: اُٹھاؤ ہاتھ مرے ساتھ سب دُعا کے لئے
کہ ہند وقف رہے ایسٹ انڈیا[1] کے لئے
فرنگیوں کے سفینہ کا ناخدا ہوں میں
صلائے عام ہے موجِ گریز پا کے لئے
جہاں کے عیش و طرب کا ہے مستحق یورپ
تباہیاں تو مقدر رہیں ایشیا کے لئے

(نہایت خاموشی سے نگاہ نیچی کئے ہوئے ایک شخصیت نمودار ہوتی ہے جیسے یہ بن بلائے یہاں آگئی ہے)

سراج الدین شاہ ظفر:
لہو کا داغ چھپائے سے چھپ نہیں سکتا
دلیل شعلے کو شبنم بنا نہیں سکتی،
وہ بدنصیب کہ جس کا ہو بیگناہی جُرم
اُسے جہاں کی فضا راس آ نہیں سکتی
مری نگاہ نے دیکھے ہیں وہ مناظر بھی
کہ جن کی چشمِ فلک تاب لا نہیں سکتی
سلام قصرِ مُعلیٰ کے شہ نشینوں کو
جہاں عروسِ سحر مسکرا نہیں سکتی

زارِ روس: خطا شعار بھی تھے اور گناہگار بھی تھے
بہت سے میرے جہاں میں شریکِ کار بھی تھے
ہے امتیازِ گل و خار عدل کی توہین
چمن میں سرو و صنوبر نہیں چنار بھی تھے
اُس انقلاب سے دل تنگ ہیں جہاں والے
کہ جس کے واسطے کچھ لوگ بیقرار بھی تھے
وہ بھوک جو کہ ہے بنیادِ فوضویت کی
تباہیوں کے اُسی بھوک میں شرار بھی تھے

لینن: عوام تختِ حکومت کو توڑ سکتے ہیں
یہ رازِ دہر پہ کرنا تھا آشکار مجھے
اُفق سے آتش و خوں کے طلوعِ مہر ہوا
خزاں نے آکے دیا مژدۂ بہار مجھے
دیا تھا میں نے ہی شاہنشہی کو بیتِمہ
ملا عوام سے جس وقت اختیار مجھے
مگر ابھی مرے دل میں خلش سی باقی ہے
جو بعدِ مرگ بھی رکھتی ہے بیقرار مجھے

راسپوٹین: ارے او حامیِ مزدور کر زباں کو بند
رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند
مری ہوس نے بھی کتنے اُٹھائے ہیں طوفاں
کہ جن کے سامنے ہے پست قلۂ الوند[2]
بہت سے تجربے رقصاں مرے خیال میں ہیں
مری نگاہ میں ہیں زندگی کے پست و بلند
عوام کو میں سمجھتا ہوں گلّہ ہائے میش
کہ جن کے واسطے ہر چوب خوش نظر ہے کمند

(ایک شخصیت ــــ جن کے پراگندہ بالوں سے سمندر کا کھاری پانی ٹپک رہا ہے)

کچنز: صلیب سے بھی ہے بڑھکر ہمارے شاہ کا تاج
یہی ہے قومِ فرنگی کی آخری معراج
عزیز تر ہیں مجھے کارتوس اور بارود
کہ جن کے سامنے کمتر ہیں نیلم اور پُکھراج
صدائے جنگ مرے سامنے یہ طاری ہو
میں سُن سکوں گا نہ آوازِ تیہو و دراج
مرے سفینہ کو جس نے کیا تھا زیرِ آب
ابھی جہاں میں ہے باقی وہ حلقۂ امواج

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی ــــ [2] نواحِ ہمدان کے ایک بلند پہاڑ کا نام۔

(ایک نورانی وجود جو آسمانوں کی سیر کرتا ہوا اُدھر آنکلا ہے اس بزم میں آنے کی کوشش کرتا ہے)

روحِ خبیث : یہ کوئی غیر ہے روکو اسے نہ جانے دو

آواز : ہمارے پاس اگر آرہا ہے آنے دو

(بزم میں خامشی طاری ہوگئی، شخصیت نمودار ہوتی ہے)

نورپاشا : یہ خود فروش سیاست یہ خانہ ساز اُصول — اسی کا نام ہے فکر و نظر کی گمراہی،
درندگی کی ہیں خوگر مسیح کی بھیڑیں — نہ ذوقِ حق نگری ہے نہ وہ خود آگاہی
بغیر جذبِ یقیں ہر عمل ہے فتنہ ساز — ہزار توپ اور اک ضربتِ یداللّٰہی
فرنگ جلوہ دگر داد رسمِ آذر را — حذر ز اہلِ سیاست اگر خدا خواہی

(سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے ہیں)

پریسیڈنٹ ولسن :
یہی ہیں ڈھنگ زمانے میں سربلندی کے — اُڑاؤ پرچم رنگین فتحمندی کے
شکست خوردہ جو اقوام اور ممالک ہیں — بتاؤ اُن کو طریقے نیازمندی کے
مرے اُصول کی تہ کوئی پا نہیں سکتا — بہت مہین سے خاکے ہیں خودپسندی کے

(ایک مضطرب الحال وجود ظاہر ہوتا ہے جس کے جسم پر کفن لپٹا ہوا ہے اور کفن کے چاروں طرف "لوزان کانفرنس" لکھا ہے)

قیصر جرمنی : عجیب فیصلہ مل کر سنا دیا تم نے — مجھے ہر ایک نظر سے گرا دیا تم نے
تمام مشرق و مغرب ہیں جس کے زیرِ اثر — وہ دام مکر و سیاست بچھا دیا تم نے
کسی کے تیر چبھویا کسی کے چٹکی لی، — کسی کا ناز سے پہلو دبا دیا تم نے
یہ سخت سخت شرائط یہ جبرِ پابندی — کہ میری قوم کو قیدی بنا دیا تم نے

ترکش جانباز : فریب و مکر و تصنع کی آتشِ بے دود — طلسمِ فکر و تدبر یہ سیمیا کی نمود
یہ بزمِ فتح و مسرت یہ مجلسِ اقوام — سلگ رہے ہیں جنازے بجائے عنبر و عود
یہ غور و فکر یہ اندیشہ ہائے مستقبل — یہ طاقتوں کے توازن کی کوششِ بے سود
اِدھر سحاب کے چھینٹے، ترشحِ شبنم — اُدھر ہے گرم ابھی انقلاب کی بارود

(فضا میں غیر معمولی حرکت پیدا ہوتی ہے۔ پولینڈ سے لیکر اسٹالن گرڈ تک کی زمین نظر آتی ہے! ٹینک اور آتشبار طیارے حرکت میں ہیں۔ لاشیں تڑپ رہی ہیں انسانی خون کے چشمے اُبل رہے ہیں۔ خبیث روح ان ہلاکت سامانیوں کو دیکھ کر مسکراتی ہے۔ اتنے میں ایک ستارہ ٹوٹ کر گرتا ہے اور ایک وجود ظاہر ہوتا ہے)

حافظ شیرازی :
زبانِ حال پہ نغمہ بھی بن گیا فریاد — کہاں گئی وہ مری سرزمینِ رُکنا باد
ہے کس عذاب میں شیرازہ بندیِ گلگشت — کسی روش پہ ہے گلچیں کسی طرف صیاد

یہ اقتدار و سیادت کی وادیِ پُر پیچ — کہ دیکھنے میں ہے گویا غلام بھی آزاد
یہ چشمِ خود نگرِ سطوت و شکوہِ عجم — زاوجِ بامِ ثریا بہ سطحِ خاک اُفتاد

کاؤنٹ[1] چیانو:

کہیں پرستشِ سلطاں[2] کوئی ہے فاسستی — کہیں ہے عشوہ طرازی لعبتِ جمہور[3]
جنوں سوار کسی پر ہے آمریت[4] کا — تراشتا ہے زمانہ نئے نئے دستور
کسی مقام پہ[5] روٹی ہے زیست کا محور — چھڑی ہوئی ہے کہیں بحثِ افسر و مزدور
قیامِ امن و سکوں اب یہاں ہے ناممکن — کہ ہر نظام ہے انسانیت سے کوسوں دور
میں اپنے خون سے خاکے بنا کے آیا ہوں — اک آئینہ سا جہاں کو دکھا کے آیا ہوں

(اتنے میں ایک سفینہ نظر آتا ہے جس کے رنگیں بادبان پر "تہذیبِ حاضر" لکھا ہے، طوفانی موجیں اس سفینہ کو ہچکولے دے رہی ہیں -)

روحِ خبیث: ارے بچا دُمرے ڈوبتے سفینے کو،

آواز: نکال دو مری محفل سے اس کمینے کو

(سفینہ ڈوب جاتا ہے اور سطحِ آب پر یہ دو شعر نورانی حروف میں لکھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ——)

کوئی دماغ بھی اب کام کر نہیں سکتا، — سفینہ ڈوب کے پھر سے اُبھر نہیں سکتا
وہ دیکھ! حق و صداقت کا لشکر آ پہونچا — کہ جس کے سامنے باطل ٹھہر نہیں سکتا

(امثال و صور کی جگہ بزمِ آب و گل اور مادی اجسام نظر آتے ہیں جہاں عدل و انصاف کے چشمے اُبل رہے ہیں، حق و صداقت کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے اور انسانوں کی خود ساختہ بادشاہت اور اقتدار کی جگہ "خلافتِ الٰہی" قایم ہے)

آخری آواز:

یہ دین اور سیاست کا امتزاجِ لطیف — اسی کو آخری دستور بن کے رہنا تھا
خدا کا خوف بھی ہے پاسِ آدمیت بھی — زمیں کو عدل سے معمور بن کے رہنا تھا
یقین و عدل و صداقت کا دور دورہ ہے — کہ ظلم و جہل کو مجبور بن کے رہنا تھا

یہی نظام ہے فطرت کا حاصل و مقصود
بہ روحِ پاکِ محمد درود نامحدود

ماہر القادری

---

[1] مسولینی کا داماد، غداری کے جرم میں جسے گولی مار دی گئی —— [2] جاپان — [3] یورپ کا عام جمہوری نظام ——
[4] [illegible] — [5] روس

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بےمثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:

۱— چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔
۲— مادیئین کا مذہب
۳— حرکت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوش خط سرورق رنگین۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل یعنی عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے۔ ایک بار اس کو شروع کردینا آخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے بادیانِ طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ ہلاکت آفریں ہے۔ زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

قیمت آٹھ آنے

علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے زیر طبع)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات جو دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے مثلاً مومن، ظفر، غالب، مصحفی، نظیر، سیماب، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے حصہ میں تمام وہ انتقادی مباحث ہیں جنکا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے ہر ایک حصہ پانچ پانچ سو صفحات سے کم نہ ہوگا اور ہر حصہ کی قیمت [illegible] ہوگی

مذہبیات (زیر طبع)

حضرت نیاز کے تمام وہ بہترین مقالات جن میں انھوں نے مذہب و تعلقات مذہب سے اپنے خاص رنگ میں بحث کی ہے۔ نیاز کے یہ مضامین اس قدر دلچسپ و پرشکوہ دلائل ہیں کہ ان کا جواب [illegible] نہیں کیا جا سکتا۔ اس مجموعہ میں تمام وہ مضامین ہونگے جنھوں نے دنیائے مذہب میں ہلچل ڈالدی تھی اور جنکے مطالعہ کرکے لوگوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ یہ بھی دو حصوں میں شایع ہونگے اور ہر حصہ کا حجم ۵۰۰ صفحات اور قیمت پانچ روپیہ ہوگی

"نگار" کے خاص نمبر

پیشگی قیمت بھیجئے — فوراً طلب کیجئے

جنوری ۱۹۳۹ء
(مصحفی نمبر)
اس کے بعض عنوانات یہ ہیں: حیات مصحفی۔ اُردو غزل گوئی میں مصحفی کا مرتبہ۔ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ
قیمت دو روپے علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۰ء
(نظیر نمبر)
اس کے بعض عنوانات یہ ہیں: نظیر کا مسلک — شاعری پر تبصرہ۔ نظیر اور عوام۔ انتخاب انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ
قیمت دو روپے علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۱ء
یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزل گو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے۔
قیمت تین روپے علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۲ء
اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری ۱۹۴۱ء میں شایع ہوا تھا۔
قیمت دو روپے علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۳ء
اس نمبر میں ریاض خیر آبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔
قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۴ء
جدید شاعری نمبر اس میں بتایا گیا ہے کہ جدید رجحانات شعری کی کیا حقیقت ہے اور آزاد نظم نگاری کا قافیہ و قافیہ سے بے نیاز ہو جانا کیا معنی رکھتا ہے۔
قیمت دو روپے علاوہ محصول

نرخنامہ اُجرت اشتہار

	ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۶۰۰ روپیہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
آدھا صفحہ	۳۶۰ روپیہ	۱۸۰ روپیہ	۹۰ روپیہ	۳۰ روپیہ
چوتھائی صفحہ	۱۸۰ روپیہ	۹۰ روپیہ	۴۵ روپیہ	۱۵ روپیہ

(۱) اُجرت بہرحال پیشگی لی جائے گی۔ وی پی کے ذریعہ سے وصول منظور نہیں۔
(۲) جتنی مدت کے لئے اشتہار دیا جانا طے ہوا ہے اسکی رقم پیشگی یکمشت لی جائیگی
ماہانہ ادائی کی صورت میں نرخ دگنی نافذ رہیگا۔
(۳) اشتہار فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کمیشن ذریعہ خط و کتابت طے ہو سکتا ہے۔

مینیجر

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر بارہ روپیہ ششماہی ہندوستان کے اندر چھ روپیہ
" بیرون ہند آٹھ روپیہ۔ " بیرون ہند پانچ روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہو جاتا ہے۔ ۲۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے۔ ورنہ بعد کو ۸ر فی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔

مینیجر

حصول جواب کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے
خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے

رجسٹرڈ نمبر ۴۴



قیمت فی کاپی ۸ ر

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اُسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔ قیمت تین روپیہ

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن زبان قدرتِ بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت للعہ

علاوہ محصول

حُسن کی عیّاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشا لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

مکتوبات نیاز حصہ اول

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں ایک ایسی چیز ہیں، اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ مع تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت تین روپیہ

علاوہ محصول

مکتوبات نیاز حصہ دوم

یہ حصہ پہلے حصہ سے زیادہ ضخیم ہے اور اس میں اکثر مکاتیب انتقادی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ حضرات جنھیں شعر و شاعری سے دلچسپی ہے انھیں ان مکاتیب میں بہت سے عجیب و غریب نکات شعری نظر آئیں گے۔ رنگین تحریر اور اسلوب ادا کی دلکشی کا ذکر فضول ہے کیونکہ حضرت نیاز کی اس خصوصیت سے ہر شخص آگاہ ہے۔ قیمت تین روپیہ

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخییل اسکی نزاکت بیان، اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

ترغیبات جنسی (یا)

شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں۔ نیا اڈیشن

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

مجموعہ استفسار و جواب سہ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۲۲ء سے لیکر ۳۹ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ علاوہ محصول

کتنی بار کہا جائے

کہ خط و کتابت میں نمبر خریداری درج کیا کیجئے، آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کی اس فروگزاشت سے دفتر کو کتنی تکلیف اُٹھانا پڑتی ہے ۔۔۔ آپ کا نمبر خریداری ہر مہینے پتہ کی چٹ پر بائیں طرف درج ہوتا ہے۔ اسے کسی جگہ نوٹ کر لیجئے، کیا یہ کوئی بڑا مشکل کام ہے۔

چندہ سالانہ پانچ روپیہ
ششماہی تین روپیہ

نگراں : نیاز فتحپوری

ادارہ : مجید نیازی
شوکت جہاں

جلد ۴۶	فہرست مضامین ستمبر سنہ ۶۴ء	شمار ۳

ملاحظات

کل ہند اُردو کانگرس

مجھے اس اجتماع کا حال اگست ہی کی اشاعت میں درج کرنا چاہئے تھا، لیکن میں حیدرآباد سے ۳۰ر جولائی کو واپس آیا جبکہ رسالہ تقریباً چھپ چکا تھا، اور اس ذکر کا موقعہ نہ ملا۔ یہ کانگرس کس غرض سے منعقد ہوئی، اسکے تین دن کے ۶، ۷ اجلاسوں میں کیا کیا ہوا، اور کن کن حضرات نے اس میں شرکت کی، اسکا علم اخبارات کے ذریعہ سے سب کو ہو چکا ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں، لیکن اس کانگرس کی وہ خصوصیت جس پر اخبارات نے بھی کم توجہ کی اور جس کا علم صرف انھیں کو ہو سکتا ہے جو اس میں شریک ہوئے تھے، اس کا حُسن نظم و اہتمام تھا۔

اس اجتماع کے محرک غالباً ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ اور قاضی عبدالغفار صاحب مدیر روزنامہ پیامؔ تھے، لیکن یہ تحریک قطعاً ناکام رہتی، اگر آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر نے اس کے نظم و اہتمام کی ذمہ داری اپنے سر نہ لی ہوتی۔ ہر اجتماع کے دو پہلو ہوا کرتے ہیں، داخلی و خارجی اور جب تک یہ دونوں اپنی جگہ کامیاب نہ ہوں، ہم کسی اجتماع کو کامیاب نہیں کہہ سکتے، ہمارا یہ روز کا تجربہ ہے کہ اکثر جلسے زیادہ تر اسی لئے ناکام رہتے ہیں کہ ان کی ترتیب و تشکیل معقول نہیں ہوتی اور ان کی حیثیت قرونِ وسطیٰ کی پنچایت سے آگے نہیں بڑھتی، لیکن اُردو کانگرس کا یہ اجتماع اپنی تنظیم کے لحاظ سے بالکل مغرب کی چیز معلوم ہوتا تھا جس کے ہر ہر پہلو سے اس کا بلند جمالیاتی ذوق نمایاں تھا ــــ مندوبین کی پذیرائی، قیام و طعام، نقل و حرکت، شرکت جلسہ، دعوتیں، تفریحیں، سب کچھ ایک مرتب نظام سے وابستہ تھا اور یہ سب کچھ اس قدر سکون کے ساتھ ہو رہا تھا، گویا یہ جلسہ مسلمانوں کا تھا ہی نہیں

یہ تھا اس اجتماع کا خارجی پہلو جس کی کامیابی بلحاظ نواب صاحب موصوف کی ذات گرامی کی ممنون ہے اور جس کا اعتراف وہاں کے تمام شرکا کو ہے، لیکن شاید یہ بات بہت کم حضرات کو معلوم ہوگی کہ اس کانگرس کی معنوی کامیابی کا سبب بھی بڑی حد تک نواب صاحب موصوف کی ذات تھی۔ کیونکہ اس کانگرس کی بعض صحبتوں میں ایسے اوقات بھی آئے جب دو جماعتوں کے اختلافات نے بہت نازک صورت اختیار کر لی، اور کانگرس کا وجود خطرہ میں پڑ گیا، لیکن نواب صاحب موصوف اور آنریبل مسٹر غلام محمد کی فراست نے ان تمام جھگڑوں کو نہایت خوش اسلوبی سے طے کرا دیا اور اس طرح کل ہند اُردو کانگرس کی بنیاد استوار ہوگئی، بہرحال حیدرآباد کی اُردو کانگرس بہت کامیاب رہی اور اس کے مستقبل سے ہماری بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔

اُردو پریس کانفرنس یوپی و دہلی

میں جب ۳۰ر جولائی کو لکھنؤ واپس آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اُردو پریس اسوسی ایشن جس کی بنیاد یہاں کئی مہینے پہلے پڑ چکی تھی، ۱۵ر اور ۱۶ر اگست کو کانفرنس طلب کر رہی ہے ــ اس تحریک کے اصل بانی جناب انیس احمد صاحب عباسی بی۔ اے اڈیٹر حقیقت ہیں اور وہ پچھلے چند ماہ کے اندر متعدد جلسے کر کے اور یہاں کے مختلف سر برآوردہ حضرات سے ملکر اس اسوسی ایشن کو اس حد تک لے آئے تھے کہ کانفرنس کا انعقاد ضرور ہو گیا تھا۔ اور آخرکار یہ کانفرنس جس میں یوپی کے اخبارات کے بہت سے نمایندوں نے حصہ لیا، اور جس کی کامیابی میں جناب امین سلونوی اور جناب نسیم انہونوی کا بھی بڑا ہاتھ تھا، ۱۵ر اور ۱۶ر اگست کو منعقد ہوئی اور اس میں بہت سی تجاویز پاس کی گئیں۔ اس کانفرنس کا اصل مقصود یوپی اور دہلی کی صحافت کو ایک مرکز سے وابستہ کرنا ہے تاکہ اخبارات و

مسایل کو جو مشکلات پیش آتی ہیں ان کو اجتماعی حیثیت سے دور کیا جائے، چنانچہ اس مقصد کے لئے متعدد تجویزیں پاس کی گئیں جس میں سب سے زیادہ اہم یہ تھی کہ کم از کم ۵۰ ہزار کا مستقل سرمایہ اس اسوسی ایشن کو فراہم کرنا چاہئے، بظاہر یہ تجویز بہت دشوار طلب نظر آتی ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر نیس احمد صاحب عباسی اور اسی عزم و ارادہ کے چند نفوس اور اس کے لئے طیار ہو جائیں تو چنداں دشوار نہیں ہے۔ غالباً آیندہ موسم سرما میں ایک وفد اس غرض کے لئے ہندوستان کا دورہ کرے گا اور وہ یقیناً اس مقصد میں کامیاب ہوگا۔

دوسری تجویز جو اتنی ہی اہم ہے، یہ تھی کہ ہمارے ملک کے اُن نوجوانوں کے لئے جو صحافت کا خاص درک و سلیقہ رکھتے ہیں آیندہ ترقی کے مواقع فراہم کئے جائیں ۔

اس وقت یوپی کے نوجوانوں میں ایک نام میرے سامنے سبط حسن کا ہے جو ترقی پسند جماعت کے نہایت پُرجوش کارکن اور صحافت کا نہایت اچھا سلیقہ رکھنے والے ہیں، لیکن اس وقت تک ہم ان کی اہلیت سے واقعی کوئی فایدہ نہیں اُٹھا سکے، بالکل اسی اہلیت کے ایک اور نوجوان خالد رامپوری ہیں جو کئی سال سے روزنامۂ ناظم رامپور کو ایڈٹ کر رہے ہیں اور جن کو میں ان کی بعض خصوصیات کے لحاظ سے "خالد جانباز" کہا کرتا ہوں۔ قوتِ حافظہ، ذہانت، اسلوب تحریر، اور احساس کے لحاظ سے خالد اسوقت صف اول کے صحافیوں میں جگہ پانے کے قابل ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ریاستی اخبار سے متعلق ہونے کی وجہ سے نہ پبلک نے ان کی اہلیت کو سمجھا اور نہ وہ اپنے حوصلہ کے لحاظ سے کوئی کام کر سکے۔ تیسرا نام رضا انصاری کا ہے، جو فرنگی محل کے ایک مشہور خانوادۂ علم و فضل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں بھی کام کرنے کی بڑی صلاحیت پائی جاتی ہے اور یہ نہایت کامیاب صحافی بن سکتے ہیں، اگر ہم ان کو فکر معاش کی طرف سے کچھ بھی مطمئن کر سکیں، اس طرح اور بھی متعدد نوجوان ہمارے صوبے میں ایسے ہیں، جن کا صحافتی مستقبل بہت روشن ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ اسوسی ایشن اجتماعی سرمایہ سے کوئی معقول اخبار جاری کرنے میں کامیاب ہوگئی جس کی پوری کوشش کی جارہی ہے، تو ہم ایسے نوجوانوں کو یکجا کر سکیں گے۔

بہرحال اس اسوسی ایشن کا قیام بڑی برمحل چیز ہے اور اس حیثیت سے کہ فی الحال اس کی صدارت کا بار میرے سر ڈال دیا گیا ہے، میں نگار کے تمام پڑھنے والوں سے خواہ وہ کسی صوبہ سے متعلق ہوں، درخواست کروں گا کہ جہاں تک ممکن ہو اس کے کامیاب بنانے میں ہماری مدد کریں ۔

یہ اسوسی ایشن باقاعدہ رجسٹرڈ کرائی جارہی ہے۔ اس کا سرمایہ بنک میں محفوظ رہے گا اور سند یافتہ آڈیٹروں (حساب جانچنے والوں) کے ذریعہ سے حساب کی جانچ کراکے سالانہ رپورٹ پیش ہوتی رہے گی ۔

اس کی مجلس عاملہ اور کونسل کے لئے دہلی اور یوپی کے تمام سربرآوردہ صحافیوں کا انتخاب کیا گیا ہے اور انھیں کے مشورہ سے سب کام ہوں گے ۔

سکریٹری "اُردو جرنلسٹس اسوسی ایشن"، لکھنؤ کو خط لکھ کر دستور العمل اور کارروائی کانفرنس کی ایک کاپی طلب فرمالیجئے اور اس کے مطالعہ کے بعد ہمیں اپنے مشورہ سے آگاہ کیجئے ۔

حکومت کی اقتصادی و صنعتی پالیسی

اور

پاکستان کا معاشی مستقبل

پرانے زمانہ میں ذاتی یا قومی وقار کے لئے دو بادشاہ آپس میں لڑجایا کرتے تھے، یا مذہب و خدا کے نام پر جنگ ہوا کرتی تھی۔ قدیم یونان، روما اور ایران میں اکثر نبرد آزمائیوں کے رومانی اسباب بھی ہوا کرتے تھے لیکن اس دور میں دنیا کی حکومتیں محض موچھوں کی لڑائیاں نہیں لڑا کرتی ہیں۔ آج کل کے سیاسی جھگڑوں کے اسباب ہمیشہ اقتصادی ہوتے ہیں اور صرف اقتصادی۔

جنگ کے بہانے گزشتہ جنگ عظیم میں شکست کھانے کے بعد ہی جرمنی اپنی اہانت کے انتقام کی تیاریاں کرنے لگا تھا تاکہ رفتہ رفتہ اپنی کھوئی ہوئی طاقت حاصل کرنا شروع کردے، اور ۱۹۳۹ء میں جب ہٹلر کی سمجھ کے مطابق مساعد صورت حالات پیدا ہوگئی تو اس نے یوروپ کی جمہوری حکومتوں کی مزاحمت کے باوجود انکی دھمکیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے پولینڈ پر قبضہ کر ہی لیا اور اپنے اس حرکت کے جواز میں یوروپ کی جمہوریتوں کے طرز عمل کے خلاف اظہار بیزاری کرتے ہوئے اقوام یوروپ کو فریب تسکین دینے کے لئے ایک نیا نظام عالم، نیا نصب العین اور نیا سیاسی اصول عمل و اصول زندگی بخشنے کا اعلان کیا۔ اس خطرناک اقدام کو دیکھ کر برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا باوجودیکہ وہ خود اسکے لئے طیار نہ تھا۔ روس اپنے نصب العین کے لئے خاموش طریقہ پر جدوجہد کر ہی رہا تھا کہ جرمنی نے اس کے خلاف بھی لڑائی چھیڑ دی اور روس کو اپنی مدافعت کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑا۔ ایشیا کی پاسبانی کا مدعی جاپان اپنے براعظم کے لئے خطرات محسوس کرنے لگا اور اس نے بھی آہستہ آہستہ مدافعانہ کارروائی کے بہانہ اپنے ہاتھ پاؤں پھیلانا شروع کئے اور جب اپنے خیال کے مطابق زمین خوب مضبوط کرلی تو اس نے بیک وقت برطانیہ اور امریکہ دونوں کے خلاف دھاوا بول دیا۔ غریب امریکہ جو ہمیشہ آمریت اور استبدادانہ طرز حکومت کا دشمن رہا ہے قبل ہی سے بے چین ہو رہا تھا مگر اپنے ساہوکارانہ مصالح کی بناپر خاموش تھا اب اپنے اخلاقی فرض کو پیش نظر رکھتے ہوئے اصول جمہوریت کے تحفظ کے لئے وہ بھی شریک جنگ ہوگیا۔ جنگ میں اس کی یہ شرکت شاید صرف اپنی مدافعت کے لئے نہ تھی۔

جنگ کے اصلی اسباب ظاہری اسباب جو کچھ بھی ہوں لیکن یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس قسم کے سارے ہنگاموں اور سیاسی بے امنیوں کی علتِ غائی صرف ایک ہی ہوتی ہے یعنی اقتصادی اقتدار

برقرار رکھنے کی جد و جہد یا اسے اور بھی بڑھانے کی ہوس ،انسانی ذہنیت کچھ ایسی پست ہو گئی ہے کہ اسے وطنیت ، قوم پروری اور نسل پرستی کا احساس بھی اسی وقت ہوتا ہے جب اقتصادی حالت بگڑنے لگ جاتی ہے ، چنانچہ فلسطین میں یہودیوں اور عربوں کی مخالفت ، ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی نزاع بھی محض اقتصادی اسباب کی منت پذیر ہے بلکہ میں یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہندوستان کی اقتصادی حالت اطمینان بخش ہوتی تو چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے ہندوستانیوں پر مذہبی جنون بھی سوار نہ ہوتا اور وہ مذہب یا دھرم کے نام پر شاید اس شدت کے ساتھ آپس میں کٹ مرنے کے لئے مستعد نظر نہ آتے ۔

ان باتوں سے ظاہر ہے کہ جنگ میں فتح و شکست کے معنی اقتصادی فتح و شکست کے ہیں چنانچہ آج بھی وہ قومیں جنہیں جنگ میں فتحیاب ہونے کا ننانوے فیصدی یقین ہے ، اپنی اس یقینی کامیابی کے باوجود اقتصادی حالت کی طرف سے مطمئن نہیں ہیں جنگ میں کامیابی کے یہ معنی ہیں کہ جنگ کے بعد اقتصادی حالت درست رہ سکے ، گزشتہ جنگ میں اتحادیوں کی فتح ہوئی تھی جس میں روس بھی شامل تھا لیکن روس کو جن اقتصادی خطرات سے گزرنا پڑا ہے وہ سب پر ظاہر ہے چنانچہ یہی سبب ہے کہ اسوقت تمام اقوام عالم کی نگاہیں خواہ وہ شریک جنگ ہوں یا غیر جانبدار ، حالات جنگ سے زیادہ امکانات بعد از جنگ کا تجزیہ کر رہی ہیں جنگ کو تقریباً پانچ سال ہو رہے ہیں ابتدا میں جب اتحادی بالکل طیار نہ تھے ، محوری قوتیں بظاہر بڑھتی ہوئی نظر آتی تھیں ہٹلر کی فوج ادھر روس میں اسٹالن گراڈ تک پہونچ گئی تھی اور ادھر رومل مصر کے قریب شمالی افریقہ میں آچکا تھا اور ہٹلر یوروپ کے نئے آرڈر کے خواب کی تعبیر طیار کر رہا تھا ، اسی وقت سے اتحادی قوتیں کامیابی کے یقین کے باوجود جنگ کے بعد کی تعمیری اسکیمیں سوچنے لگیں - وزیر اعظم چرچل اور صدر جمہوریت امریکہ مسٹر روزولٹ دونوں مل کر اٹلانٹک چارٹر مرتب کرنے لگے لیکن اب جبکہ جنگ کی کایا پلٹ ہو چکی ہے ، روسیوں نے جرمنوں کو اپنے ملک سے نکال دیا ہے ، اٹلی میں جرمنوں کی قوت ٹوٹ چکی ہے وہاں اب اتحادیوں کا قبضہ ہے اور فرانس میں بھی اتحادی فوجیں داخل ہو چکی ہیں ، شریک جنگ ممالک کی تعمیری سرگرمیاں بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں -

امریکہ ، برطانیہ اور چین آزاد ممالک ہیں ان کے یہاں جنگی جد و جہد ، جنگ کے بعد کی تعمیری اسکیمیں اور اقتصادی تباہی کے خطرات کے سدباب کی مساعی ہم معنی الفاظ ہیں لیکن ہندوستان نہ تو اپنی خوشی سے شریک جنگ ہے ، نہ یہ اس کی اپنی جنگ ہے کیونکہ وہ اپنی شرکت اور عدم شرکت کے متعلق کوئی اختیار اور رائے نہیں رکھتا ہے ، اور نہ اس کی صنعتی و اقتصادی پالیسی خود اس کے ہاتھ میں ہے -

گزشتہ جنگ عظیم میں محض حکومت کے وعدوں پر بھروسہ کر کے ہندوستان نے اتحادیوں کی فتح کے لئے ہر قسم کی قربانیاں کیں مگر ہم کو جنگ کے بعد جو کچھ ملا وہ ظاہر ہے چنانچہ آج جب ہندوستان زیادہ سمجھدار ہو چکا ہے اور موجودہ جنگ میں اسے اپنی پوزیشن کا کافی اندازہ ہو چکا ہے وہ حکومت برطانیہ سے زیادہ حسن ظن نہیں رکھتا ہے اور اپنے مستقبل کے لئے مضطرب ہے -

اس وقت جتنی قومیں شریک جنگ ہیں خواہ وہ اتحادی ہوں یا محوری اپنے آپ کو منصف ، ہمدرد انسانیت اور سب کی سب ہندوستان کا ہمدرد کہتی ہیں ، لیکن میں ہندوستان سے کسی کی بھی ہمدردی کا قایل نہیں ہوں - خواہ وہ جمہوریت پسند امریکہ ہو یا سوشیلسٹ روس ، آزادی پسند برطانیہ ہو یا مظلوم چین - سبھی قومیں طاقت کے لئے لڑ رہی ہیں اور جس طرح آج طاقتور قوموں کی للچائی ہوئی نگاہیں ہندوستان پر پڑ رہی ہیں اور جس طرح آج طاقتور قوموں کی للچائی ہوئی

...وئی نگاہیں ہندوستان پر پڑ رہی ہیں، اسی طرح کل بے دست و پا اقوام کے اعضا میں قوت آجانے کے بعد ہندوستان سے ...ن کی بھی ہمدردی ختم ہو جائے گی۔

ہندوستان کے خزاین و جواہرات کے تذکرہ سے یورپ کا لٹریچر بھرا پڑا ہے وہاں کی تقریباً ساری قومیں ہندوستان ...ی دولت سے فایدہ اُٹھا چکی ہیں۔ انگلستان کی صنعت ہمیشہ سے ہندوستان کی دولت سے پرورش پاتی رہی ہے۔ آج بھی ...کومت ہند کی صنعتی اور محصولاتی پالیسی برطانوی صنعت کی ترقی و تحفظ کی ضامن ہے۔ ہٹلر یورپ کو نظام نو دینا چاہتا ہے لیکن مرکزی یورپ کے اندر اُس کی پوزیشن ہر چہار طرف سے کچھ اس طرح گھری ہوئی ہے کہ جرمنی کو اوروں کی طرح ہندوستان ...ی دولت سے منفعت حاصل کرنے کی سہولتیں کبھی حاصل نہ ہو سکیں جس کی اُس کو آج تک حسرت ہے۔ برطانیہ نے سینن ...اضیہ میں اپنے مفتوح ممالک کے ساتھ جو سلوک روا رکھے ہیں اور آج بھی ہندوستان میں اور جنوبی افریقہ کی ہندوستانی آبادی کے ساتھ جو ان کی پالیسی رہی ہے وہ اُس قوم کی ذہنیت کی نمایندگی کر رہی ہے۔ ترکوں نے جنگ عظیم کے بعد بڑی بہادری سے اپنی آزادی کے لئے جنگ کی اور یوروپ کے مرد بیمار کو موت کے چنگل سے چھڑا لیا ساری دُنیا نے اُن کی ہمت اور جذبۂ آزادی کی تحسین کی اور اُن کی کامیابی پر آفریں کہا اور چونکہ انھوں نے دنیا کو اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے دکھلا دیا تھا اسلئے اُن کی جنگ آزادی کی جنگ تسلیم کر لی گئی لیکن اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد جب کُردوں نے اسی جذبۂ آزادی کے تحت ترکوں کے خلاف جدوجہد کی تو اسے بغاوت سے تعبیر کیا گیا اور ان کو اس طرح کچل ڈالا گیا کہ شاید اب صدیوں تک ان کو اپنے قومیت کا احساس بھی نہ ہو سکے۔ یہ صحیح ہے کہ کردوں نے ترکوں کے لئے بڑے خطرہ کی صورت پیدا کر دی تھی اور ترک ان کو دبانے میں بالکل حق بجانب تھے لیکن کردوں کے اس جذبہ کی جس نے ان کو ترکوں کی کمزور پوزیشن سے فایدہ اُٹھا کر غلامی کی زنجیروں سے خود کو آزاد کرانے کی کوشش پر آمادہ کر دیا تھا، قابل داد ضرور تھی ——

—— ابتدائے قیام حکومت امریکہ سے آج تک جمہوریت پسند امریکیوں کا ...سُرخ حبشیوں کے ساتھ جو رویہ رہا ہے دُنیا کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ آج چین مجبور، بے دست و پا اور مظلوم ہے۔ ہندوستان سے اُسے بڑی ہمدردی ہے دونوں ملکوں کے درمیان علمی اور سیاسی روابط قایم ہوتے جا رہے ہیں قدیم تعلقات کی احیاء ہو رہے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ یہی چینی کل جب آزادی کے ساتھ ساتھ طاقت حاصل کر لیں گے تو ہندوستان کے لئے شاید جاپانیوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہوں۔ آج کے روسی کمیونسٹ کل جب اپنی دشواریاں حل کر لیں گے تو کون جانتا ہے کہ وہ اپنا مسلک نہ بدل ڈالیں گے اس لئے ہندوستان کو نہ تو کسی کمزور قوم کی عارضی ہمدردی سے مستقبل میں کسی فایدہ کی امید رکھنا چاہئے اور نہ طاقتور ممالک کی قوت سے —— اسے اپنی قوت آپ حاصل کرنا ہے۔

جنگی جدوجہد میں ہندوستان کی سیاسی اور صنعتی اہمیت

لندن ٹائمز ۱۲ مئی ۴۲ء کی اشاعت میں موجودہ پاسیفک محاربات میں ہندوستان کی اہمیت پر لکھتا ہے " اس (یعنی ہندوستان) نے اس وقت جو حیثیت حاصل کر لی ہے اس کے متعلق امید کی جاتی ہے کہ وہ ہندوستان کی مستقل خصوصیت بن جائے گی، کیونکہ جنوب مشرقی ایشیا میں قیام امن کی جو اسکیم دنیا میں ہوگی اس میں ہندوستان کو نہایت اہم پارٹ ادا کرنے کے لئے ناگزیر طور پر مدعو کیا جائے گا۔ جنگ کے بعد آیندہ زمانہ

میں حریص اقوام کے جارحانہ اقدام کے سدباب اور اس کی مدافعت کے لئے ہندوستانی آبادی نیز اس کے قدرتی وسایل سے دو طریقہ سے فایدہ اُٹھایا جا سکتا ہے ایک تو یہ کہ وہاں کے قدرتی ذرایع مفید طریقہ میں استعمال کئے جایئں اور دوسرے یہ کہ ہندوستان اپنے وسایل سے فایدہ اُٹھانے میں امریکہ اور برطانیہ کا اشتراک عمل حاصل کرے"

مسٹر مانٹیگو ۱۹۱۷ء میں جنگ عظیم کے دوران میں ہندوستان تشریف لائے تھے اور مونٹفورڈ رپورٹ تیار کی تھی اس میں یہاں کی صنعتی پالیسی سے متعلق جو حصہ ہے بہت سے دلخوش کن اور امید افزا فقروں سے بھرا ہوا ہے - لیکن ظاہر ہے کہ یہ محض جنگی اہمیت اور سیاسی مصالح کے پیش نظر لکھے گئے تھے، ہندوستان کا کوئی اقتصادی مفاد ان کے پیش نظر نہ تھا چنانچہ دوسرے سال جنگ ختم ہوگئی لیکن حکومت کی پالیسی میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی ---- لندن ٹائمس کے فقروں کو لارڈ مانٹیگو کے الفاظ سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی، اُسوقت ہندوستان پر دس کروڑ پاؤنڈ کا بار ڈالا گیا تھا اور آج بھی برطانیہ اور امریکہ کے تعاون کے معنی یہ ہوں گے کہ ہندوستان اس بار سے اور زیادہ گرانبار کر دیا جائے - بیرونی رابطہ سے جو اقتصادی نیز سیاسی نقصانات ہمیں پہونچتے رہے ہیں اُن کا ذکر آیندہ صفحات میں کیا جائے گا، ہمیں اسی سلسلہ میں صرف اس قدر کہنا ہے کہ ہندوستان کو اپنے اہمیت کا کافی علم ہے اور وہ جانتا ہے کہ اپنے قدرتی ذرایع کو مفید طریقہ سے کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے، اسے صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ بغیر کسی تعاون و مشورہ کے وہ جس طرح چاہے پوری آزادی کے ساتھ اپنے صنعتی، اقتصادی اور ٹیرف[1] (محصولاتی) پالیسی بنائے اور اس عمل کرے -

جنگ شروع ہونے کے بعد جب اشیاء کی درآمد ہندوستان میں بند ہوگئی تو بیرونجات سے مقابلہ کا خطرہ نہ رہا اور ہندوستانی صنعت کو فروغ دینے کی بڑی اچھی صورت پیدا ہوگئی، چنانچہ حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ کم از کم زمانۂ جنگ میں ہندوستان کی صنعتی پیداوار کو بڑھانے کی کوشش کرے لیکن کوئی توجہ نہیں کی گئی، روجر کمیشن اور گریڈی کمیشن نے [illegible] بھی کیں لیکن گورنمنٹ کا جواب یہی رہا کہ دوران جنگ میں کچھ ممکن نہیں ہے بلکہ سرکار نے نئی کمپنیوں کی تعداد میں اضافہ کو روکنے کے لئے امتناعی اعلان کر دیا جس سے بڑی مایوسی ہوگئی اس سلسلہ میں گھنشیام داس برلا نے نہایت معقول بیان دیا تھا ان کا خیال بہت صحیح ہے کہ ہماری نئی صنعتوں کے قایم ہونے میں سرکار کی طرف سے ہر قسم کی رکاوٹیں پیدا کی جائیں گی -

بمبئی انڈسٹریل پلان

حکومت کی طرف سے جب مایوسی ہو چکی تو ہندوستان کے [illegible] اقتصادیات نے مل کر بمبئی میں ایک زبردست صنعتی اسکیم بنائی "جو بمبئی انڈسٹریل پلان" (Bombay Industrial Plan) کے نام سے مشہور ہے - اس پلان کی اشاعت سے انگلستان میں یکایک بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا پریس اور پلیٹ فارم ہر جگہ سے اس کے خلاف صدائیں بلند ہونا شروع ہوئیں اس کی مخالفت میں خصوصیت کے ساتھ برطانیہ اکانومسٹ (Economist) کی آواز سب سے زیادہ بلند تھی

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ حیرت مانچسٹر گارجین کے رویہ پر ہوتی ہے یہ اخبار اپنی کشادہ دلی، حریت پسندی اور

[1] درآمد اور برآمد کے محصول کی فہرست

ہندوستان و دولتی کے لئے مشہور ہے۔ لیکن اس کا مشورہ بھی یہی ہے کہ ہندوستان میں اساسی ثانوی صنعت کی جیسے جیسے توسیع ہوتی جائے انگلستان بھی اس کے قدم بقدم چلے وہ لکھتا ہے "چونکہ ہندوستانی مارکٹ کی صورت حال بدل چکی ہے اور جنگ کے بعد اس میں اور بھی تبدیلیاں پیدا ہو جائیں گی اس لئے برطانیہ اسوقت تک ہندوستان کی مانگ کی مقدار (volume of demand) میں اپنا مناسب حصہ حاصل نہ کر سکے گا جب تک وہ ہندوستان کے دوش بدوش نہ چلے"۔ ہندوستان کے سربرآوردہ تجار کا ایک مشن اس غرض سے انگلستان جا رہا ہے کہ ہندوستان کی اقتصادی ترقی کے لئے ضروری سامان اور مشینریاں حاصل کرنے کی صورت پر غور کرے اور انھیں مہیا کرے یہ سنکر مانچسٹر گارجین اور بھی بدحواس ہو گیا ہے وہ حکومت ہند سے بدظن سا ہو گیا ہے اس کی پالیسی کو نہایت ناپسندیدہ نگاہ سے دیکھتا ہے گویا حکومت بغیر اس خوف کے کہ انگلستان کی صنعت کا کیا حال ہوگا ہندوستان کی صنعتی ترقی کی کوششوں کو عمداً سراہ رہی ہے اس اسکیم پر عمل کرنے کے لئے سرمایہ کی فراہمی کی مخالفت کرتے ہوئے وہ سرکار کو مشورہ دیتا ہے کہ ایسے وقت میں سوں دفاع ([illegible]) کے لئے روپیہ زیادہ ضروری ہے — لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ جب موجودہ حکومت کا وجود ہی برطانوی صنعت کی حفاظت کا ضامن ہے تو مانچسٹر گارجین کو اس طرح پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی۔

بلاشبہ حکومت ہند نے اس اسکیم کے لئے سرمایہ کی منظوری دیدی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ایسی صورتیں بھی پیدا کر دی گئی ہیں کہ جنگ کے بعد بھی آسانی سے روپے حاصل نہ ہو سکیں۔ اسوقت تو سامان جنگ کی طیاری کے لئے ہندوستانی کارخانوں میں بے دریغ روپیہ بہایا جا رہا ہے، اس کے علاوہ دوران جنگ میں جبکہ انگلستان اور دوسرے ملکوں سے ہندوستان میں درآمد بند ہے، یہاں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ہندوستانی صنعتوں کو عارضی طور پر فروغ دینے کی کوشش بھی ضروری تھی لیکن حکومت کو اس بات کا ضرور خیال رہیگا کہ یہاں کے لئے جو بھی صنعتی اسکیم بنائی جائے اس میں برطانوی صنعتی و اقتصادی مفاد کا تحفظ کا کافی لحاظ رکھا جائے اور اسی لئے بمبئی انڈسٹریل پلان پر عمل درآمد کے لئے نیشنل گورنمنٹ کا قیام اولین شرط ہے کیونکہ یہاں جب تک کی درآمد و برآمد کے محصولات پر ہمارا پورا پورا کنٹرول نہ ہوگا ہم اپنی اسکیم کو کامیابی کے ساتھ عملی جامہ پہنا ہی نہیں سکیں گے۔

پلان پر اعتراضات اور اس کا جواب

بمبئی پلان پر کچھ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ہندوستان کے پیشہ وروں کے تناسب آبادی کو پیش نظر رکھ کر یہ اسکیم نہیں بنائی گئی ہے۔ یہاں کی زراعتی آبادی ستر فیصدی کے قریب ہے مگر اس اسکیم پر زراعتی ترقی کے لئے صرف ۱۲۴۰ کرور روپے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ جس سے پندرہ سال کے اندر زراعت پر ایکسو تیس فیصدی ترقی کی صورت پیدا کی جا سکے گی۔ اس کے مقابلہ میں صنعت و حرفت کیلئے جس میں حصہ لینے والوں کی تعداد صرف ایک فیصدی ہے، ۴۴۸۰ کرور روپے کا حساب رکھا گیا ہے اور پانچ سو فیصدی ترقی کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔ معترضین کہتے ہیں کہ یہاں کی زراعت کو زیادہ فروغ دینے کی ضرورت ہے اگر صنعت میں حصہ لینے والوں کی تعداد ایک فیصدی سے بڑھ کر پانچ فیصدی تک پہونچ بھی گئی تو کیا ہوا اکثریت تو سہمی کی رہ جائے گی یہ اعتراض جتنا لغو اور غلط ہے اسی قدر جہل اور مضحکہ خیز بھی ہے۔ پانچ فیصدی ترقی سے مراد صنعت کی ترقی ہے صنعت میں حصہ لینے والوں کی تعداد میں اضافہ نہیں ہے۔ یہ تو ریاضی کا معمولی حساب ہے اگر انھیں کی سمجھ کے مطابق جوڑا جائے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ

شاعر کے لئے خوشگو، بامزہ اور خوش فکر کے سے لفظوں کے استعمال میں "تلاشِ مضامین تازہ" سے زیادہ "جدتِ ادا" پر قدرت رکھنے کی جانب اشارہ ہوتا تھا۔

یہاں یہ بحث نہیں کہ صرف زبان کی لطافتوں میں کھو جانا ادب کے لئے اچھا ہوتا ہے یا نہیں بحث اسی کی ہے کہ تقریباً ایک طرح کی تاریخی جبریت یہی راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر رہی تھی، یا کوئی اور راستہ بھی تھا جاگیر دارانہ تمدن کے انحطاط کا ایک دائرہ تھا جس میں ایک نقطہ دوسرے سے بہت دور ہونے پر بھی اُس دائرہ کے اندر ہی ہو سکتا تھا۔ نقاد مضامین کی تحلیل یا مواد کا تجزیہ کرنا عبث جانتے تھے، زبان اور اسلوب پر قدرت حاصل کرنے کو فن کا کمال سمجھتے تھے، جو لوگ اُسی نظامِ اخلاق کے پابند اور پرستار اب بھی ہیں، اُسی ذوقِ سلیم کی رہنمائی میں اسلوب اور طرزِ ادا کو اصل فن قرار دیتے ہیں اور مضامین تازہ کی جدّت کو طرزِ بیان کا ایک کرشمہ سمجھ کر پسند کرتے ہیں۔ طرزِ اظہار اور قدرتِ بیان کو فن کی تکمیل میں یقیناً بہت بڑا مرتبہ حاصل ہے لیکن ہر عہد میں اُس کا تعلق اُس مواد سے رہتا ہے جس کے لئے طرزِ اظہار اختیار کیا جاتا ہے۔ انقلاب اور تغیر کے زمانے میں اسلوب مواد کا پابند ہوتا ہے۔ جمود اور انحطاط کے زمانے میں اظہار ہی کو سب کچھ سمجھا جاتا ہے۔ اظہار دونوں حالتوں میں ایک سماجی عمل ہے اور سماج کی خواہشات کا پابند۔ طرزِ اظہار ہر عہد میں یکساں نہیں رہ سکتا اس لئے نقاد جن عناصر پر کل زور دیا کرتے تھے آج نہیں دے سکتے کیونکہ سماج کی خواہشات بدل چکی ہیں اور تاریخ سماج کی تشکیل نئی طرح کر رہی ہے۔

کوئی نقاد اپنے عہد سے اتنا بلند نہیں ہو سکتا کہ وہ شعر و ادب کی تمام مروجہ روایتوں سے رشتہ توڑ لے اور بالکل نئی باتیں پیش کر دے۔ یہ کسی حد تک اُسی وقت ممکن ہے جب سماج کا کوئی اہم حصہ شعری روایات سے بیزار ہو جائے اور تاریخ اس بیزاری کے لئے وجہ جواز بھی مہیا کر دے۔ ضرورت یا ضرورت کا احساس مادّی حالات کی بنا پر پیدا ہوتا ہے اور وہی شعور رکھنے والے ادیبوں اور نقادوں کو نئی راہ پر چلنے اور نئی منزل کی جانب اشارہ کرنے کی طاقت بخشتا ہے۔ ادبی تنقید کی صلاحیت براہِ راست اُس عام شعور کا ایک عکس ہوتی ہے جو سماج میں پیدا ہو جاتی ہے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ ادبی تنقید تو ترقی یافتہ شکل میں پائی جائے اور زندگی کے دوسرے مظاہر کو جانچنے اور پرکھنے کے طریقے بالکل ناقص، یا ابتدائی صورت میں نظر آئیں سماج جتنا پیچیدہ ہوتا جائے گا تنقید کے آلے اُتنے ہی تیز ہوتے جائیں گے۔ شعر و ادب کے متعلق افلاطون کے خیالات اور ارسطو کی بوطیقا پر فکر و نظر کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے لیکن انھیں بزرگوں کے بنائے ہوئے پیمانوں سے آج کے ادب کو ناپنا تولنا ممکن نہیں ہے

جس طرح اُردو شاعری میں ایک اہم تغیر اُنیسویں صدی میں رونما ہوا اُسی طرح اُردو تنقید میں بھی ایک ایسا دور شروع ہو گیا جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تنقید کا یہ شعور زندگی کے ہر شعبے میں کارفرما تھا۔ معاشی و معاشرتی نظام تبدیل ہوا تھا اور اصلاح پسندی کے ساتھ ساتھ ترقی پسندی کا عام رواج ہو رہا تھا، مذہب، سیاسیات، تعلیم، طرزِ بود و ماند، شعر و ادب، ہر ایک میں عقل سے کام لے کر اصلاح کی کوشش۔ اس دور کا تجزیہ بارہا کیا جا چکا ہے اور اس کی تعمیری اور تخریبی دونوں حیثیتوں پر نگاہ ڈالی گئی ہے اُس کا دُہرانا ضروری نہیں ... صرف یہ سمجھنا چاہئے کہ ترقی پسندی کی قوتوں نے اصلاح کے کھیل میں فتح پائی۔ تنقید کا نیا تصور ... ایک موج ہے جس نے ایک طرف راجہ رام موہن رائے کشیب چندر سین، ایشور چندر ودیا ساگر، مہرشی دیو، بھارتیندو ہریشچندر پیدا کئے تو دوسری طرف سرسید اور اُن کے ساتھی

یہ تمام لوگ صرف ادب کے نہیں زندگی کے نقاد تھے، انھوں نے اس مادی معاشی معاشرتی تغیر کی روشنی میں اپنا راستہ بنایا جو مغربی اثرات کے پھیلنے، ہندوستان کے نیم صنعتی نیم جاگیردارانہ ہو جانے کی وجہ سے عمل میں آیا تھا۔ اس زمانہ میں بہت سی لڑائیاں لڑی گئیں جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے یہاں کی بہت سی بڑی بڑی لڑائیوں سے بڑی تھیں، قدیم اور جدید کی جنگ، روایات اور اصلاح کی جنگ ہر میدان میں جاری تھی اور میدان آہستہ آہستہ تاریخ کی نئی طاقتوں کے ہاتھ آتا جا رہا تھا۔ اسے کچھ لوگ سہل پسندی کی وجہ سے مشرق اور مغرب کا تصادم کہہ دیتے ہیں لیکن اگر حالات کا تجزیہ مادی نقطۂ نظر سے کیا جائے تو یہ بہت واضح تصورات کا تصادم نہ تھا بلکہ نئے متوسط طبقہ نے اپنی مادی اور روحانی ضروریات کے لحاظ سے اپنے ہی نظام حیات میں تھوڑی سی بہت پیوندکاری کر لی تھی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اگر ایک طرف نظریاتی حیثیت سے بعض باتیں بہت نمایاں ہیں تو دوسری طرف عمل کے موقعہ پر انھیں میں اُلجھاؤ نظر آتا ہے۔ مثال کے لئے حالی کو لینا چاہئے کیونکہ اُس دور نے حالی سے بڑا ادبی نقاد پیدا نہیں کیا۔ آزاد اور شبلی کی دقایق رسی اور تیز نگاہی کا اعتراف ہر اُردو داں کرے گا لیکن حالی نے اُس کشمکش کو بہت اچھی طرح سمجھا تھا جو غدر کے قریب وجود میں آئی تھی۔ حالی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ خیال بغیر مادہ کے نہیں پیدا ہوتا۔ یہ انقلابی تصور فلسفۂ علم و عمل کا سنگ بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پہلی دفعہ عینیت اور بے معنی تصور پرستی پر بھرپور وار کیا گیا ہے مگر وہی حالی جب غزل گوئی میں اصلاحات کے اُصول پیش کرتے ہیں تو پھر مادی تجزیہ سے ہٹ کر خیال کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ تاہم حالی اور اُس زمانے کے دوسرے نقادوں کے لئے ہمارے پاس تعریف و توصیف کے بہت سے کلمات ہیں کیونکہ اُنھوں نے نئے متوسط طبقہ کی مادی اور روحانی خواہشات کو سمجھا اور ادب و نقد میں نئے گوشے اس طرح پیدا کئے جو تاریخی تقاضوں سے پوری مطابقت رکھتے تھے حالی اور آزاد تو ادب کو ایک سماجی عمل سمجھتے تھے اور اگرچہ اُن کا یہ شعور کسی قدر دھندلا تھا اور کسی مادی فلسفہ کی پشت پناہی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے کسی قدر مبہم، لیکن جس طرح انھوں نے اس کی پٹریاں بدل دی تھیں اُس میں بہت جان تھی۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالی، سرسید اور دوسرے مفکرین صرف مغرب کی نقالی کر رہے تھے اُن پر مغربی اثرات نے اس طرح غلبہ پا لیا تھا کہ وہ مشرق کی کمتری کا اعتراف ہر قدم پر کرتے تھے، یہ احساس کسی قدر نفسیاتی تھا لیکن اس کی بنیادیں اُس تاریخی تغیر ہی میں ملیں گی جس کا تذکرہ ابھی تھا۔ حالی "پیرویِ مغربی" کا اعتراف کرنے کے باوجود ہندوستانی زندگی کے تقاضوں کو بھی پورا کر رہے تھے۔ محض نقالی بے جان اور ناپایدار ہوتی ہے، شعور اور ادراک کی شمولیت کے بعد نقالی بھی حقیقت بن جاتی ہے۔ جس معاشی معاشرتی دور سے مغرب پہلے گزرا تھا۔ اُس سے ہندوستان بعد میں گزرا اور کسی حد تک بالکل نئے عوامل یہاں کے شعور کی تشکیل و تعمیر کر رہے تھے اس لئے صرف نقالی کا سوال باقی نہیں رہ جاتا، یہاں کی سماجی کشمکش خود حقیقتیں فراہم کر رہی تھی۔ مختصر یہ کہ اس وقت مشرق اور مغرب دونوں کے اُصول نقد کا جائزہ لیا گیا اور جس طرح تقریباً ہر شعبہ میں مغرب کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی تھی اُسی صورت سے مغربی اُصول تنقید نے اہمیت حاصل کر لی۔

یہاں پہونچ کر ایک نہایت ہی اہم سوال یہ پیدا کیا جاتا ہے کہ مغربی اُصولِ نقد مشرقی ادب کے جانچنے اور پرکھنے میں کام آ سکتے ہیں یا نہیں۔ یہ سوال کبھی کبھی تو خلوص پر مبنی ہوتا ہے لیکن زیادہ تر بدنیتی کا پتہ دیتا ہے اور اس کے پیدا کرنے والے ہمیشہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو وقت کی بڑھتی اور بدلتی ہوئی سُبک مگر تیز رفتار کو نہیں سمجھتے، جو اُس پیچیدگی کا تصور نہیں کر سکتے جو آج سماج میں پیدا ہو گئی ہے، جو اُن گتھیوں کو سلجھانے کے لئے کوئی فلسفہ نہیں رکھتے جو زندگی لمحہ بہ لمحہ پیش کرتی رہتی ہے، ایسے

لوگ مغرب اور مشرق کا تذکرہ اس لئے نہیں کرتے کہ وہ دونوں کے مخصوص اختلافات یا اُن کی روح سے واقف ہیں بلکہ اُن کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ عام طور پر رجعت پسندی کی تائید حاصل کرنے کا اس سے آسان نسخہ اور کوئی نہیں۔ معاشی معاشرتی تفریق کی وجہ سے یقیناً مشرق و مغرب نے زندگی کے لئے مختلف روایتیں پیش کی ہیں جنھوں نے بہت حد تک شخصی اور قومی نفسیات پر بھی اثر ڈالا ہے، پسند و ناپسندیدگی کے معیار بھی جداگانہ قایم کئے ہیں، لیکن تنقید کے وہ اُصول جو ادب و شعر کے مواد کا تجزیہ کریں، ہر رجحان کی تحلیل کریں وہ اِن حقیقتوں کا جایزہ لینا بھی ضروری قرار دیتے ہیں، اُن سے اس نا انصافی کا اندیشہ اس لئے نہیں ہو سکتا کہ یہ تمام باتیں تجزیہ میں ضرور نمایاں ہوتی ہیں بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اگر تنقید ان عناصر کو واضح نہ کر سکے تو وہ تنقید ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ اُصولِ تنقید مغرب اور مشرق کے نہیں ہوتے، اُن میں عالمانہ اور حکیمانہ ہمہ گیری ہوتی ہے اُن سے کام لینے والے کا فرض یہ ہے کہ ہر دفعہ جب وہ اُن اُصولوں کو استعمال کر رہا ہو مکانکی طریقہ پر عمل پیدا نہ ہو بلکہ شعور سے کام لے کر اُصولوں کو تازہ زندگی بخش دے۔ ہر تخلیقی ادب ایک مخصوص شخصی اور سماجی مفہوم اور ماحول رکھتا ہے تنقید نگار اگر اس کا انکشاف نہ کرے تو تنقید تنقید باقی نہیں رہ سکتی۔

مشرقی اور مغربی اُصولِ تنقید کے سلسلہ میں ایک اور بات کا سمجھنا شاید مفید ہو۔ دنیا کی تمام مشہور اور اہم زبانوں کے پاس تھوڑا بہت ادبی سرمایہ ضرور ہے۔ اس ادبی سرمایہ میں اپنے موضوع اور اپنی شکل کے لحاظ سے مختلف اصناف ادب ہوتے ہیں۔ اگر کئی ملکوں کے ادب پر نگاہ ڈالی جائے تو ہر جگہ کے ادب میں بعض باتیں مشترک ملیں گی، ادب اور شعر کہہ کر کوئی ایسی چیز مراد لیجاتی ہے جو ساری دنیا کے ادب میں پائی جاتی ہے اس لئے اُن کی تحلیل اور تجزیہ کے لئے بھی کوئی ایسا اُصول نقد استعمال کیا جا سکتا ہے جو مواد اور رجحانات کا، ہیئت اور طرز ادا کا جایزہ لے اور جس جگہ کے ادب میں جو خصوصیات امتیازی حیثیت رکھتی ہوں اُن کا اظہار کر دے۔ ادبیات کے مشترک مواد کے لئے تحلیل کا ایک عام طریقہ فلسفیانہ طور پر بالکل مناسب معلوم ہوتا ہے، ہیئت اور اسلوب پر بھی مواد اور موضوع کی مناسبت سے نگاہ ڈالی جا سکتی ہے۔

اُردو ادب میں جس طرح کی تنقید نگاری عام طور پر رائج رہی ہے اُس میں خالص مغربی طرز کی ترجمانی بھی نہیں کی گئی ہے وہاں مکاتبِ نقد تخلیقی ادب کے معمولی سے معمولی تغیر کے ساتھ قایم ہوتے رہے ہیں اور بعض اوقات تو اُن کی حیثیت بہت ہی غیر واضح اور محدود رہی ہے، چند انفرادیت پسندوں نے ایک گوشہ ڈھونڈھ نکالا اور اُسی پر ایک نئی عمارت کھڑی کر دی اُس کی ترویج کے لئے رسائل نکال دیئے اور کتابیں شایع کر دیں۔ ہر دور کی معاشرت نے تنقید کے لب و لہجہ میں نئی جھنکار اور نیا اثر پیدا کیا، زندگی کی برق رفتاری اور ہر لحظہ نئے نظام میں ڈھلنے کی خواہش نقد میں نمایاں ہوتی رہی۔ نقد کے یہ اُصول اُن فلسفیانہ اُصولوں سے مطابقت رکھتے ہیں جو وقتاً فوقتاً زندگی کی ترجمانی کے سلسلہ میں وجود پذیر ہوتے رہے۔ ادب برائے ادب، ادب برائے زندگی، اخلاقی، مابعد الطبیعیاتی، منطقی، جمالیاتی اور نفسیاتی نقاط نظر پھر ان کے مختلف اظہار[لہ] امپرشنزم، پوسٹ امپرشنزم، سوررلیزم، ریلزم، دادا ازم، فیوچرزم، کریٹیو کرٹسزم، نیو ریلزم، سوشل ریلزم، رلیٹیوزم، فرائڈزم

[لہ] Impressionism – Post-Impressionism – Surrealism – Realism – Dadaism – Futurism – Creative Criticism – Neorealism – Social realism – Relativism – Freudism.

اور بہت سی دوسری شکلیں۔ کوئی ارسطو کا احیاء کرنے پر طیار، کوئی اُسے مٹانے پر آمادہ، کوئی ہیئت پر زور دینے والا، کوئی مواد پر، کوئی نقاد ہونے کے باوجود تنقید کی اہمیت کا منکر کوئی تنقید کو تخلیق کی حد میں لانے کا خواہش مند، کوئی اخلاق کو فن قربان کر دینے کا متمنی کوئی اخلاق کو ہر حالت میں بلند رکھنے کا مدعی، کوئی ادب کو چند افراد تک محدود رکھنے پر زور دیتا ہے کوئی اُسے عوام تک پہونچانا چاہتا ہے ۔ کوئی اسے وقت اور مقام کی پیداوار بتاتا ہے کوئی زمان و مکان کی گرفت سے بالاتر جانتا ہے اس طرح نہ جانے کتنے معروف اور بے نام مکاتبِ نقد نظر آتے ہیں جن میں تحقیق سے لیکر رسمی تعریف و توصیف تک بہت سے مدارج ملتے ہیں۔ لیکن اُردو ادب میں ان سب کا رواج نہ تو ہوسکا اور نہ ہونے کا امکان ہے کیونکہ ہندوستان اپنے مخصوص قسم کے سماجی نظام کی وجہ سے اُن حالات سے نہیں گزرا جن سے مغرب کو سابقہ پڑا تھا۔

اُردو تنقید کی پھر بھی تاریخ ہے جس میں مغربی طرز تنقید کی جھلک کہیں کہیں دکھائی دے جاتی ہے۔ کوئی طرز مکمل طور پر کسی مغربی طرز کے اُصولوں پر پورا نہیں اُتر سکتا لیکن قریب کئی ایک پہونچ جاتے ہیں۔ بعض شکلیں جو عام طور پر پائی جاتی ہیں اُن کا بیان بیجا نہ ہوگا۔

تحقیق اور تنقید میں جو فرق ہے وہ اتنا واضح ہے کہ اُسے ہر ادیب کو سمجھنا چاہئے لیکن بعض اوقات دونوں کو ایک سمجھا جاتا ہے، ہمارے محققین جن ضروری کاموں میں لگے ہوئے ہیں اُن میں تنقید سے زیادہ ایک دوسرے قسم کے منطقیانہ تجزیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ محقق عام طور پر اس بات کو نظر انداز کر جاتا ہے کہ وہ خام مواد جسے وہ نئے سر سے ترتیب دے کر ایک قطعی نتیجہ کی شکل میں پیش کرنا چاہتا ہے وہ کہاں سے پیدا ہوا، وہ لکھنے والے کی اُس سماجی شخصیت کو نظر انداز کر جاتا ہے جو کسی مخصوص خیال کی محرک ہوئی اس لئے اُس کے نتائج بال کی کھال نکالنے کے باوجود اُس سچائی کو پیش نہیں کرتے جو ادب اور شاعری جان ہے۔ تحقیق کی عظمت اور ضرورت سے کون انکار کرسکتا ہے لیکن اکثر اس کا وہ کمزور رخ ہمارے سامنے آتا ہے جو ماضی کی معمولی سے معمولی چیز کو مقدس صحایف کا مرتبہ عطا کرتا ہے اور حال کی عظیم الشان کوششوں سے نظر پھیر لیتا ہے، اگر انھیں کسی قلمی نسخہ میں کسی نامعلوم شاعر کے چار معمولی شعر مل جائیں تو وہ خوشی کے عالم میں تمام جدید ادبی سرمایہ دریا بُرد کر دینے پر آمادہ ہوجائے گا۔ اُس کے لئے دنیا ماضی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اُسے تخلیقی ادب سے بہت کم دلچسپی رہ جاتی ہے اور وہ اپنے لئے ایسی دنیا تعمیر کرلیتا ہے جہاں بہت تھوڑے سے لوگ داخل ہوسکتے ہیں۔ یہ کہدینا اس موقعہ پر ضروری ہے کہ ہمارے کئی صاحبِ قلم جنھیں خالص تحقیق سے دلچسپی ہے اس بات کا احساس بھی رکھتے ہیں کہ ادب زندگی کا مظہر ہے اور آج بھی جو ادیب خلوص کے ساتھ زندگی کی ترجمانی جذبات کی مدد سے کر رہے ہیں وہ اسی توجہ کے مستحق ہیں جیسے ماضی کے۔

کسی ملک کا قدیم ادب اُس کے جدید ادب سے صرف زبان کی تراش خراش میں مختلف نہیں ہوتا بلکہ ادب کی تخلیقی نوعیت سے متعلق اُسکا زاویۂ نگاہ بھی بالکل بدلا ہوا ہوتا ہے اس لئے سوائے تاریخی تجزیہ کے جو نقطۂ نظر بھی اُس کے مطالعہ کے لئے منتخب کیا جائے گا وہ محدود ہوگا۔ قدیم ادب کے جایزے کی ایک صورت تو یہی ہے، جو ہمارے محققین پیش کرتے ہیں لیکن کچھ ناقدین اس کے بھی قایل ہیں کہ ہر دور کے ادب کو اُسی زمانہ کے اُصولِ نقد سے جانچنا چاہئے۔ یہ بات نہ تو آسان ہے اور نہ مفید، اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ قدیم — ہمارے لئے صرف ایک مقدس ترکہ کی حیثیت سے قابلِ احترام نہیں ہے بلکہ اُس میں فطرت اور سماج کی رجعت پسند طاقتوں پر قابو پانے کی جس جد و جہد کا اظہار شعری یا غیر شعوری طور پر ہوتا ہے اُس سے انسانی شعور

تاریخ مرتب ہوتی ہے، یہی تاریخی مادیت کی مدد سے ادب کے جائزے کی صورت ہے۔ اس لئے الٰہی تحقیق جو قدیم ادب کو صرف قدیم ادب سمجھ کر زندگی کے دوسرے شعبوں سے علٰحدہ دیکھے وہ مفید نہیں، اور جو اصول نقد بعض اقدار کے کسی زمانے میں عزیز اور بعض کے ناپسندیدہ ہونے کی وجہ تک ہمیں نہ پہونچائے وہ بھی نامکمل اور غیر حکیمانہ ہے۔

نقادوں کا ایک اور گروہ ہے جو شاعری کو صرف مرصع کاری سمجھتا ہے۔ زبان و محاورہ کے استعمال، لفظوں کے انتخاب، صنایع کی دلکشی کا فریفتہ نظر آتا ہے۔ ایسے نقاد ہر شعر کو انفرادی طور پر اسلوب بیان کی کسوٹی پر کستے ہیں، کبھی کبھی معنویت پر بھی غور کر لیتے ہیں لیکن اس سے انھیں زیادہ تعلق نہیں ہوتا، وہ بندش اور حسنِ ادا پر نظر رکھتے ہیں۔ اُن کے لئے شاعری کی جان صرف وہ صوتی حسن، الفاظ کی جھنکار، قافیہ کا ترنم اور ردیف کی گونج بھی نہیں، دیکھنے اگر یہ شاعر میں لفظی خوبیوں کے پا جانے کو تنقید سمجھ لیتے ہیں۔ وہ عروض کی کتابوں کے بتائے ہوئے قواعد سے ایک [illegible] حرفوں کا گرنا اور دبنا، الفاظ اور محاورات کے استعمال میں سند، ان کے لئے وہ شاعری کی روح کی جانب نہیں مڑتے بلکہ قدیم اساتذہ کے یہاں اس کا جواز ڈھونڈھتے ہیں۔ ایسے نقاد شاعری کی سماجی اہمیت کا تو ذکر ہی کیا اُس کے مرکزی تاثر، اس کے معنوی حسن اور اس کی شاعرانہ خوبی سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔ تنقید کا یہ طریقہ تذکرہ نگاروں کے طرز سے ملتا ہوا ہے اور اُسی معاشی معاشرتی زندگی کی روایت کی حیثیت سے چلا جا رہا ہے جس میں مواد کی جانب سے توجہ ہٹ چکی تھی اور صرف اسلوب اور طرزِ ادا کو ادب سمجھ لیا گیا تھا۔ ایسے لوگ قدیم اقدار کی عزت رسمی طور پر کرتے چلے جا رہے ہیں، اب ان اقدار میں نئی زندگی پیدا کرنا ممکن نہیں ہے، صرف رسم پرستی کے زور پر نقادوں کا ایک مختصر سا گروہ اس حیثیت سے زندہ ہے ادب کی رفتار ترقی پر وہ کسی قسم کا اثر نہیں ڈال رہا ہے۔

اُردو ادب میں نثر کی کمی نے نقادوں کا رخ صرف شعر گوئی پر غور کرنے کی جانب موڑ دیا تھا اور شاعری میں سب سے زیادہ اہمیت غزل کو حاصل تھی۔ غزل کے اشعار کی سب سے بڑی خصوصیت یہ سمجھی جاتی تھی کہ ایک شعر میں مکمل اور اہم بات کہہ دی جاتی ہے چنانچہ اُن تنقید نگاروں نے جو شاعری میں معنویت کی بھی جستجو کرتے ہیں غزلوں کے اشعار کو ایک خاص انداز میں پیش کیا یعنی کسی شاعر پر تنقید کرتے وقت انھوں نے شاعری کے چند رسمی مضامین کا انتخاب کر کے اُسی کے ماتحت اچھے اور معنی خیز اشعار کا انتخاب کر لینا اور بعض اشعار کی معنوی اور لفظی خوبیوں کو ظاہر کر دینا کافی سمجھا۔ ان رسمی مضامین میں عشق اور اُس کے مختلف پہلو، تصوف اور اُس کے ذیلی عنوانات، اخلاقی مضامین وغیرہ کا خاص طور پر انتخاب کیا جاتا ہے۔ غزل کے اشعار میں جو انتشار اور پراگندگی ہوتی ہے اُس میں ایک طرح کا معنوی ربط اس طرح ڈھونڈھا جاتا ہے اور مختلف غزلوں سے خاص موضوعات پر اشعار تلاش کر کے سطحی طور پر ایک شاعر کے مواد کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ شاعری کو زندگی سے علٰحدہ دیکھنے کی عام غلطی کی وجہ سے ایسی تمام تنقیدیں کھوکھلی معلوم ہوتی ہیں اگرچہ مجموعی طور پر شاعر کی انفرادیت اور شخصیت کا ہلکا سا اندازہ ہو جاتا ہے لیکن شاعر کی سماجی شخصیت کا پتہ نہیں ہوتا، نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ اُس پر زندگی کی کون سی قدریں اثر انداز ہوئیں اور نہ یہ کہ اُس نے عام رفتارِ زندگی پر کیا اثر ڈالا۔

اِن تنقید نگاروں میں بعض غیر معمولی طباعی اور ذہانت کی وجہ سے شدت کے ساتھ انفرادیت پسند ہو جاتے ہیں۔ اردو کو اس طرح کے نقاد کم ملے لیکن بعض ایسے ضرور رہے جنھوں نے تنقید میں اپنے علم و فضل کا مظاہرہ کیا اور اپنی معلومات کے کانٹے پر شاعر کو تولنا چاہا۔ اس طرح کے نقاد عام طور پر اُسی شاعر کو لیتے ہیں جس نے اُن پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اُن کے اشعار اور خیالات

کی توضیح نہایت پرجوش انداز میں کرتے ہیں۔ اُن کے جمالیاتی نقطۂ نظر کی رنگینی شاعر کو عام انسانوں سے بہت بلند بنا کر دیکھتی ہے اور خالص وجدان کی یہ کیفیت شاعر کے گرد و پیش خواب و خیال کی ایک خوبصورت دنیا بسا دیتی ہے۔ حسین، پراثر اور پرجوش الفاظ میں کبھی معنویت کی تعریف کبھی الفاظ اور اسلوبِ بیان کی توصیف ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک غیر مرئی فضا طیار ہوگئی ہے جس کو مادیت سے کوئی تعلق نہیں۔ نقاد جو اثر کسی شعر یا شاعر سے لیتا ہے اُسے پرزور الفاظ میں دوسروں تک پہونچا دیتا ہے وہ کسی اُصولِ نقد کی فکر نہیں کرتا بلکہ صرف حُسن کی جستجو کرتا ہے اور یہ حُسن اُس کی اپنی نگاہ کی تخلیق کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس کی تلاش میں وہ دور دور تک چلا جاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ تمام لوگ اس کے ساتھ ہیں اگرچہ زیادہ تر ایسا نہیں ہوتا۔ وہ اپنی رنگینیٔ نگاہ میں دوسروں کو شریک کر لیتا ہے لیکن اس کا تجزیہ جذبات کی جس رنگ آمیزی پر مبنی ہوتا ہے اس میں مسلّمہ نقطۂ نظر کے فقدان کی وجہ سے پائداری نہیں ہوتی، وہ ادب کو مبہم طور سے سمجھنا اور سمجھانا چاہتا ہے۔ ایسا نقاد بہت آسانی سے ادب برائے ادب کے جال میں گرفتار ہو جاتا ہے کیونکہ اُس کے نقطۂ نظر کی ماورائیت ادب کے مادی وجود اور سماجی اظہار پر زور دینا پسند نہیں کرتی اور ادب کا رشتہ ابہام سے ملنے لگتا ہے۔ شاعری صرف انفرادی جذبات کی کشمکش کا نتیجہ معلوم ہونے لگتی ہو اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ انفرادی جذبات کے پس منظر میں کونسی سماجی حقیقتیں زندگی کی تشکیل کر رہی ہیں۔ خالص جمالیاتی نقطۂ نظر میں لطیف اور نازک اشارات کی کمی نہیں ہوتی، نقاد پڑھنے والوں کو ہر قدم پر خلافِ امید خوبصورت جملوں اور حسین کنایوں اور اشاروں کی مدد سے اپنے ساتھ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح کے نقادوں میں بعض اجتماعی شعور بھی رکھتے ہیں لیکن انکی توجہ کا مرکز عام طور سے شاعر یا ادیب کا انفرادی تجزیہ بن جاتا ہے، کہیں کہیں جماعتی احساس کی ہلکی سی آمیزش خالص جمالیاتی انداز نظر کو نقصان ہی پہونچاتی ہے۔ جمالیاتی نقاد کی پہونچ شعر و ادب کی خوبیوں تک ایک گہرے وجدان کے ذریعہ سے ہوتی ہے اور ایک قسم کا صوفیانہ شعور اُن کا رہنما ہوتا ہے۔ یہ تنقید بھی مکمل طور پر ادب کے اجتماعی اور سماجی محرکات کا پتہ نہیں دیتی اس طرح صرف اُن لوگوں کے لئے تسکین کا سامان فراہم کرتی ہے جو ادب کو کسی خلاق دماغ کی خود رو تحریک کا نتیجہ سمجھتے ہیں، اس تنقید سے ان کو آسودگی نہیں ہوتی جو ادب کو اجتماعی کشمکشِ حیات کا مظہر مانتے ہیں اور ادیب کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کشمکش کے کسی نہ کسی پہلو کا ترجمان خیال کرتے ہیں۔

یورپ اور امریکہ کی تنقید نگاری سے متاثر ہو کر اُردو کے نقادوں نے بھی ادب اور زندگی کے باہمی تعلق پر غور کرنا شروع کیا۔ میتھو آرنلڈ نے شاعری کی تعریف کرتے ہوئے اسے زندگی کی تنقید کہا تھا اور وہ خود بھی کسی حد تک ادب اور شعر کو زندگی سے قریب دیکھنے کی کوشش اپنی تنقیدوں میں کرتا رہا اگرچہ زندگی کی جدلیاتی پیچیدگی کا تصور نہ رکھنے کے باعث وہ واقعی اس میں خود کامیاب نہ ہو سکا اور ایک مذہبی اخلاقی نصب العین کے معیار پہ نظر جمائے رکھنے کی وجہ سے [illegible] تعصبات کا شکار ہوگیا تاہم اُس کی تنقید نگاری نے ایک نیا راستہ ضرور پیدا کر دیا اور اُردو کے بعض نقادوں نے شاعری اور زندگی میں مطابقت کی جستجو کی، لیکن جن نقادوں کے پیشِ نظر کوئی مخصوص نظریۂ حیات نہ تھا وہ مکمل طور پر دونوں کے تعلق کو نہ تو سمجھ سکے اور نہ زندگی کی پیچیدہ راہوں میں شاعر اور ادیب کے شعور یا وجدان کے ساتھ چل سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کہیں انھوں نے ادھورے طور پر ادب کو سمجھ لیا کہیں ناقص طور پر زندگی کو یا پھر دونوں میں تطابق پیدا کرنے کی سعی میں خالص میکانکی انداز اختیار کر لیا جس سے نہ تو جمالیاتی ذوق رکھنے والوں کو آسودگی حاصل ہو سکی اور نہ ادب کا مادی اور تاریخی تجزیہ کرنے والوں کو۔ ایسے نقادوں

نے بالعموم ایک مرکب اُصولِ نقد بنالیا اور ایک قسم کا انتخابی طریقِ کار اختیار کرلیا جس میں حسبِ موقع تشریحی، تاثراتی، جمالیاتی ہر طرح کے اُصولوں سے کام لیا، یہی نہیں بلکہ کہیں موضوعی عینیت، کہیں معروضی تصور پرستی اور کہیں حقیقت پسندی اور مادیت کو اونچی جگہ دی اور ایک ایسا معجون مرکب طیار کردیا جس سے سرسری مطالعہ کرنے والے تو متاثر ہوسکتے ہیں لیکن ادب کا حکیمانہ اور اصولی مطالعہ کرنے والے کوئی ہمہ گیر فلسفیانہ نقطۂ نظر نہ ہونے کی وجہ سے کوئی فایدہ نہیں اُٹھا سکتے۔

فرائڈ اور اُس کے ہم خیال ماہرینِ علم النفس نے انسانی اعمال اور افعال کی نئی تشریح پیش کی۔ شعور اور لاشعور کے محرکات کا پتہ لگایا، ادب اور دوسرے فنونِ لطیفہ کو جنسی میلانات کے بعض پوشیدہ، نامعلوم اور راستہ سے ہٹے ہوئے اثرات کا نتیجہ بتایا۔ انفرادی طور پر شاعر یا ادیب کی زندگی میں جنسیت کو جو جگہ حاصل ہوتی ہے اُس میں جنسی دباؤ، جنسی تھکن، تحتِ شعور اور لاشعور میں جنسی خواہشات کا عمل، علامات کی شکل میں اس خواہش کا ظاہر ہونے کی کوشش کرنا اور پھر اس خواہش کا ارتفاع، ان عنوانات کے ماتحت ادیب کے کارنامے کی تشریح اور تحلیل کی جاتی ہے۔ اُردو کے کسی نقاد نے ابھی مکمل طور پر یہ طرز اختیار نہیں کیا ہے لیکن اس سے مدد لی جارہی ہے۔ یقیناً ایک حد تک اس سے مدد لینے میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی کیونکہ محرکاتِ شعر کی پیدایش میں شاعر کی پوری شخصیت کام کرتی ہے اور اس کی جنسی زندگی کی گہرائیاں تعمیرِ شخصیت میں بہت بڑا درجہ رکھتی ہیں تاہم جب کوئی نقاد صرف لاشعور کو حقیقت مان کر ادب و شعر کے سارے سرمائے کو اسی پر ڈھالنے لگتا ہے تو انسانی شعور کی قوتِ تخلیق کی بڑی توہین ہوتی ہے اور مادی زندگی کے وہ محرکات جو افراد ہی کو نہیں قوموں اور جماعتوں کو جہدِ حیات کا سبق دیتے ہیں، غیر اہم معلوم ہوتے ہیں۔ گویا حقیقت کی جستجو شاہراہ سے ہٹ کر صرف اس راستے پر کی جاتی ہے جو کہیں کہیں شاہراہ کے قریب آجاتا ہے ورنہ کسی ایسی بھول بھلیاں میں پہنچا دیتا ہے جہاں ظن و گمان کی رہنمائی میں قدم آگے بڑھتے ہیں۔ تجزیۂ نفس کے اُصولوں پر تنقید کرنے میں مکمل حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہوجاتی ہے اور اہمیت ایک غیر اہم جزو کو حاصل ہوجاتی ہے

کچھ نقاد شعر و ادب میں حقیقت نگاری چاہتے ہیں اور ان کی تنقیدوں میں بھی یہی کسوٹی کام کرتی ہے لیکن حقیقت کا وہ لغوی یا مابعد الطبیعیاتی مفہوم جو عام ہے اُن کے پیشِ نظر نہیں ہوتا، حقیقت ایک پیچیدہ اور مرکب عمل ہے اس لئے کوئی بنا بنایا سانچہ ہر وقت اور ہر زمانے، ہر ماحول اور ہر سماج کی حقیقتوں کو جانچنے کے لئے نہیں ہوسکتا، یہی وجہ ہے کہ ایسے نقاد ذمہ داری کا بہت احساس رکھتے ہیں اور تجزیہ کا نازک حربہ بڑی چابکدستی سے استعمال کرتے ہیں۔ تنقید جب حقیقت کے عام اور سطحی مفہوم سے گزر کر حقیقت کے ہر شعبہ کو، اُس کے مثبت اور منفی اثرات کو، اُس کے مادی اور نفسیاتی وجود اور تعلق کو گھیر لیتی ہے تو اسے اشتمالی حقیقت نگاری کا نام دیا جاتا ہے اس میں فرد کا تجزیہ ایک باشعور سماجی انسان کی حقیقت سے کیا جاتا ہے اور شاعر یا ادیب الہام و القا کی اونچی سطح سے اُتر کر نقاد کے روبرو پیش ہوتا ہے۔ ایسے تنقیدی تجزیہ سے لوگ گھبراتے ہیں کیونکہ یہ طریقہ ادیب کو اُس کے سماجی روابط کی روشنی میں پیش کرتا ہے، اُس کے رجحانات، رجحانات کی پیدایش اور حقیقت کو واضح کردیتا ہے، رجعت پسند اور انحطاط پذیر تصورات کا پول کھولتا ہے، یہ ادب برائے ادب کے گول گنبد میں پناہ لینے والوں کی خالص جمالیاتی تخلیق سے پردہ ہٹا کر اُن کے معاشرتی رجحان کا تجزیہ کرتا ہے۔ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ادب سے دلچسپی لینے والے صرف صورت اور ہیئت کے حُسن میں اُلجھے رہیں، مواد اور مضمون کو نہ دیکھیں، ہر مواد اچھا ہے، ہر موضوع ادب کے لئے موزوں ہے وہ ایسی تنقید سے بہت گھبراتے ہیں کیونکہ عام طور پر ایسے لوگوں کا مواد انسانوں کی [illegible] خواہشات کا

نتیجہ نہیں ہوتا۔ وہ لوگ یہ نہیں چاہتے کہ ادب سے زیادہ سے زیادہ لوگ دلچسپی لے سکیں، ایسے ہی لوگ اس بات کو تو ضروری سمجھتے ہیں کہ قدیم اخلاق اور تصوف کے تمام مسایل سے واقف ہوں لیکن اس بات کو ضروری نہیں سمجھتے کہ آج انسانی زندگی کی تشکیل جن عناصر سے ہو رہی ہے اُن کا علم حاصل کیا جائے ـــــ ایسے تمام لوگ اُس تنقید نگاری کی مخالفت کریں گے جو رجحانات کا تجزیہ کرتی ہے جو ادیب کے شعور کو علوم کی کسوٹی پر پرکھتی ہے، جو ادیب سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے ســـــماجی فرائض کا احساس رکھے۔

ایسی تنقید جو حقیقت کو اُس کے ہر مادّی روپ میں تلاش کرے اور تجزیہ کی مدد سے شعر و ادب میں حُسن کی جستجو کرے اُردو میں ابھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ نقاد کے بعض فرائض کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ شاعر اور ادیب نقاد کی اُنگلی پکڑ کر نہیں چل سکتا اور نہ نقاد کا یہ کام ہے کہ وہ ادیب کی آزادی میں رکاوٹ ڈالے۔ فن کار کو زیادہ سے زیادہ آزادی ہے اسی لئے نقاد کو یہ دیکھنا چاہئے کہ ادیب نے اس آزادی کا استعمال کس طرح کیا ہے۔ اس نے آزادی کو اپنی انفرادی تفریح کے لئے، کسی انحطاط پذیر فلسفہ کے لئے، کسی رجعت پسند جذبہ کے لئے استعمال کیا ہے یا عام انسانی مسرت میں اضافہ کرنے کے لئے اور اُسے ترقی کی راہ پر لگانے کے لئے۔ اگر کسی ادیب نے آزادی کے نام پر بے راہ روی اختیار کی ہے اور بنی نوع انسان کے لئے زہر اور افیون فراہم کرنے کی کوشش شعوری یا غیر شعوری طور پر کی ہے تو نقاد کے لئے تریاق مہیا کرنا اور ادیب کی بے راہ روی کا پردہ فاش کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ نقاد صرف ہیئت اور صورت کے حسین لباس سے آسودہ نہیں ہو سکتا مواد اور مضمون کے صحت بخش عناصر کا تجزیہ بھی اُس کے فرائض میں داخل ہے۔

انسانوں کی معاشی معاشرتی زندگی ایک تصوراتی ڈھانچہ بھی طیار کر دیتی ہے اور طبقاتی کشمکش میں زندگی کے بنیادی عناصر اور ظاہری تمدنی ڈھانچہ کے درمیان خاص قسم کے تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں، نقاد کے لئے اس تعلق کا پتہ لگانا ضروری ہے کیونکہ انفرادی، طبقاتی یا اجتماعی نفسیات کی حقیقت دونوں کے تعلق اور تناسب کو سمجھے بغیر اچھی طرح سمجھی نہیں جا سکتی یہ تعلق طریق پیدا وار و تقسیم میں تغیر پیدا ہونے کی وجہ سے بدلتا رہتا ہے اس لئے کوئی بندھا ٹکا اُصول ہر موقع پر کام نہیں آسکتا، ہر دفعہ نئے سر سے اس بہتی ہوئی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں ایک حقیقت کی طرف خاص طور سے دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ ادب یا تنقید ادب کو معاشیات کا ایک شعبہ نہ بنا دینا چاہئے اور نہ اس تعلق کو جو معاشی عناصر اور تصوراتی ڈھانچے کے درمیان قائم ہو جاتا ہے ریاضیاتی تناسب سے بدلتا ہوا سمجھنا چاہئے کیونکہ جب ایک دفعہ ایک مخصوص نظام [illegible] کی وجہ سے ایک مخصوص ادبی نظریہ بن جاتا ہے تو وہ اپنے قوانین اور اُصول وضوابط آپ بنا لیتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا تعلق معاشی نظام سے بالکل نہیں ہے لیکن نقاد کو چاہئے کہ اس سے دھوکا نہ کھانا چاہئے اُسے ٹھہری ہوئی کیفیت اور بدلتی ہوئی حقیقت دونوں کے اثرات کا اندازہ لگانا اور اس کے لحاظ سے ادب کا تجزیہ کرنا چاہئے تاکہ زندگی کی پیچیدگی آسانی پسندی کا شکار نہ ہو جائے۔

ہر انسان جو فطرت یا سماج کے متعلق لکھتا ہے کسی نہ کسی اُصول کا پابند ہو جاتا ہے، وہ یا تو حالات سے اطمینان ظاہر کرتا ہے یا بے اطمینانی، اور دونوں حالتوں میں اپنے نقطۂ نظر سے مشکلات کا حل پیش کرنے لگتا ہے۔ یہاں نقاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ ادیب کے نقطۂ نظر کا جایزہ لے کر دیکھے کہ وہ زندگی کے مسایل کے متعلق کیا رائے رکھتا ہے، اُس میں تضاد یا ابہام پایا جاتا ہے

ں مخصوص فلسفۂ حیات کی مدد سے وہ زندگی کے ہر مسئلہ پر واضح رائے دیتا ہے، اُس کا فلسفہ حقیقت پر مبنی ہے یا ل آرائی پر، اُس کے یہاں مادیت ہے یا عینیت۔ کتاب کی عظمت، شاعری کا مفکرانہ عنصر، مضمون کی افادی قیمت ں فلسفہ کی صداقت اور عظمت پر منحصر ہے ورنہ یوں تو بہت کچھ لکھا جاتا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا لیکن نقاد زندہ رہنے لے عناصر کی جستجو کرتے وقت اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ پھر یہی نہیں یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ ادیب نے جس عہد کے متعلق ا ہے، جن لوگوں کا تذکرہ کیا ہے جن خیالات کی ترجمانی کی ہے اُن میں تاریخی سچائی پائی جاتی ہے یا نہیں، تفاصیل میں ادیب علم کی حقیقت معلوم ہوگی، کشمکش کا ذکر کرتے ہوئے کسی طرف ہو جانا پڑے گا کیونکہ کوئی باشعور ادیب ایک ہی وقت میں دو ستوں پر نہیں چل سکتا۔ نقاد ان کا تجزیہ کر کے یہ بتائے گا کہ ادیب نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے اُس کے متعلق اس کا مکمل یا کم سے کم کافی ہے یا نہیں۔ زندگی کی نشو و نما کا عمل بہت اُلجھے ہوئے طریقے سے ہوتا ہے انسانی زندگی میں اُس کا ہار جن جذبات کے ذریعہ سے ہوتا ہے وہ بھی پیچیدہ ہوتے ہیں اس لئے ادیب اگر صرف خیال آرائی کر رہا ہے تو اس کا ہ چل جائے گا اور اگر علم کی مدد سے اپنے مواد کو ترتیب دے رہا ہے تو وہ بھی ظاہر ہو جائے گا لیکن یہ ایک کھلی ہوئی یقت ہے کہ خود نقاد کو علم کے بغیر قلم نہ اُٹھانا چاہئے ورنہ وہ تصنیف کے ساتھ ناانصافی کا مرتکب ہوگا۔

مواد کی حقیقت کا جائزہ لینے کے بعد تخلیقی ادب کے سماجی طریقِ اظہار کا دیکھنا بھی ضروری ہے۔ مواد اور ہیئت میں تعلق ہے اُسی کی آمیزش سے ادب ادب بنتا ہے اور ساری دنیا کے تخلیقی ادب کی یہ خصوصیت ہے کہ اُس میں مواد ر ہیئت کا وہ ساحرانہ امتزاج موجود ہے جو تاریخی سچائیوں میں حُسن اور زندگی پیدا کر دیتا ہے، نقاد کو اس پر نظر رکھنے کی رورت ہے کہ وہ مواد کے پیش کرنے کے طریقے کو بھی دیکھے۔ ہیئت اور اظہار کی بھی ایک سماجی حیثیت ہے کیونکہ وہ دیب اور پڑھنے والے کے درمیان ایک رابطے کی حیثیت رکھتی ہے، اسی کی مدد سے ادیب پڑھنے والوں تک پہونچتا ہے، ونکہ یہ طریقِ اظہار بھی بدلتا رہتا ہے اس لئے اس کا مطالعہ بھی کسی بنے بنائے اُصول کی مدد سے درست نہ ہوگا۔

بہر حال تنقید کا وجود علمی دنیا میں ایک فن کی حیثیت سے بہت قدیم ہے جو سماجی ضرورتوں اور تقاضوں کے لحاظ سے بدلتا ہے، اُس کی تاریخ انسانی شعور میں اسباب و علل تلاش کرنے، حکیمانہ اندازِ نظر پیدا کرنے کی ام تاریخ کا ایک حصّہ ہے۔ آج کے تقاضوں کی روشنی میں تنقید کے ایک جدید نقطۂ نظر کی ضرورت ہے جس کے بادیات اس مضمون میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک بات اتنی واضح ہے کہ اُسے دُہرانے کی ضرورت نہیں یکن اتنی اہم ہے کہ یاد دلا دینا بے موقع بھی نہ ہوگا وہ یہ کہ نقاد کو تمام فطری اور سماجی علوم، انسانی تمدن کی تاریخ بان کی پیدائش و نشو و نما کی تاریخ کا مطالعہ کئے بغیر تنقید کے میدان میں قدم نہ رکھنا چاہئے ورنہ وہ اس دشوار گزار نزل سے گزر نہ سکے گا۔

(پروفیسر) سید احتشام حسین (ایم۔ اے)

بیچین روح

ناہید کا گناہ ایک سنگین گناہ تھا۔ اُس نے محبت کی تھی۔ بے لوث محبت، خدا سے زیادہ خدا کے ایک بندہ سے
جب اُس کی دنیا آباد تھی وہ تھی اور اُس کا محبوب جمال۔ داستانِ محبت کے ابتدائی باب تھے۔ ہنگامی دنیا کی نگاہوں
سے دور ایک نرم و نازک معصوم دل کی سرزمین میں عشق و محبت کا سدا بہار پودا تیزی سے پھیل رہا تھا۔ چاہ اور پیار
کی گھنگھور گھٹائیں سر پہ چھائی ہوئی دنیا میں رنگینی تھی۔ بہار تھی۔ چاروں طرف لہلہاتا ہوا سبزہ۔ نوجوان پودوں کا آپس
اختلاط۔ سرد ہواؤں کے تھپیڑے۔ آبشاروں کے بربط۔ پرندوں کے نغمے۔ ناہید کی دنیا آباد تھی، ہر چیز میں روح
آوازیں شیرینی اور ہر نگاہ میں گرمی تھی۔ دن تیزی سے گزر رہے تھے اور عیش و عشرت کی گھڑیاں، بات کرتے کٹ رہی تھیں
ایک بھیگی رات بالاخانے کے اوپر ڈرائنگ روم میں ناہید بے صبری سے جمال کا انتظار کر رہی تھی۔ انتظار
کٹھن گھڑیاں بیت رہی تھیں۔ ہر طرف رات کا سناٹا۔ خاموش فضا۔ ناہید کا اضطراب لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا تا تھا۔ دیوار
پر لگی ہوئی گھڑی اور قلب کی تیز تیز حرکت کی آوازوں کے سوا اور کچھ سنائی نہ پڑتا تھا وہ بار بار ہاتھ میں کتاب اُٹھاتی
رکھ دیتی۔ میز سے میگزین اُٹھا کر تصویریں دیکھتی اور انھیں بھی رکھ دیتی دور سے جنگلی کتوں کی آوازیں، پہرہ دار
کی آوازوں کے ساتھ مل کر سنائی دینے لگیں۔ ایک بجا۔ ناہید اُٹھ کر کھڑی ہوگئی، کمرہ میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگی۔ ٹہلتی
دو بجے۔ وہ مضطربانہ باہر نکل آئی۔ کمرہ اور صحن کے چکر لگانے میں ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ ایک طویل گھنٹہ۔ ایک گھنٹہ
ساٹھ منٹ۔ ہر منٹ کے ساٹھ سکنڈ۔ گھڑی کی رفتار میں کوئی فرق نہ آیا۔ ناہید کی بیچینی بڑھتی رہی۔ بیچینی میں درد
درد میں کسک۔ سونے والے بستروں پر کروٹیں بدل رہے تھے۔ لیکن ناہید، جمال کا انتظار کر رہی تھی۔ تین بجے ہواؤں
نے تیزی اختیار کی۔ روشن چاند نے بھی رُخ پھیر لیا۔ فضا میں اُداسی چھانے لگی۔ امید کی کڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں
جسم میں ایک ارتعاشی کیفیت۔ اعضاء میں سنسنی۔ اُنگلیوں میں اینٹھن، چہرہ پر ہوائیاں، غریب ناہید کو اب بھی جمال کا
انتظار تھا۔ ٹانگیں چلتے چلتے جواب دے چکی تھیں۔ وہ باہر برآمدہ کے کھمبے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔ وقت و ماحول
سے بے خبر آنکھیں آنے والے کے راستے پر لگی ہوئیں۔ رات، وہ قیامت کی رات۔ جواب تک ایک انتظارِ محض کو اپنے
دامن میں پناہ دیئے ہوئے تھی۔ عازم سفر تھی۔ پر وہ آنے والا نہ آیا۔ رخصت ہونے والے رخصت ہو رہے ہیں۔
رات کے بعد دن، ہر دن کے بعد رات آتی ہے اور آتی رہے گی، مگر یہ گزری ہوئی آج کی رات اب پلٹ کر پھر واپس نہ آئے گی
ستارے بہر حال جھلملائیں گے۔ چاند کی گردشیں یونہی کی یونہی رہیں گی، انتظار کرنے والے انتظار کریں گے اور آنے والے
آتے رہیں گے۔ مگر محبت۔ محبت کی ایک رنگین داستان۔ ناتمام۔ ادھوری۔ کوئی ایسا نہیں جو اُسے پورا کر سکے

اُردو کی انقلابی شاعری

موجودہ جنگ سے پہلے

آج دنیا ایک نراجی دور سے گزر رہی ہے۔ جمہور کی بڑھتی ہوئی بیداری، مزدوروں اور کسانوں کی روزافزوں تحریک، ملوکیت اور اشتراکیت کا تصادم اور سرمایہ داری کے مٹتے ہوئے نظام کو فسطائیت کا سنبھالا، ایسی باتیں نہیں جو ایک صحیح دماغ رکھنے والے کو متاثر کئے بغیر رہ سکیں۔ ہر طرف ایک بےچینی، ایک گھبراہٹ، ایک کشمکش کا سامنا ہے، ہماری اکثریت کی مفلوک الحالی، مزدوروں، کسانوں اور منچلے درمیانی طبقہ کی قابل رحم حالت، بےروزگاروں کا بڑھتا ہوا مسئلہ، یونیورسٹیوں سے نکلنے والے طلبار کا تاریک مستقبل اور ان سب کے بڑھتے ہوئے احساس نے ہم میں موجودہ اقتصادی نظام سے بیزاری پیدا کردی اور ہم کسی ایسے نظام حکومت کے خواب دیکھنے لگے جو دولت کی اس غیر مساوی تقسیم کا علاج کر کے ہماری بدحالی دور کرے اور ہماری اکثریت کو فارغ البالی زندگی بسر کرنے کا موقع دے۔

سرمایہ دارانہ نظام کے علاوہ ہندوستان پر ایک بیرونی حکومت کا عذاب بھی نازل ہے جس نے اپنے سینے پر جاگیر داری کی سڑی لاش چمٹا رکھی ہے اور جسے ایک حد تک ہم اپنی غریبی کا ذمہ دار بھی سمجھتے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ سنہ ۱۴-۱۹۱۸ء کی جنگ عظیم اور سنہ ۱۹۲۱ء و سنہ ۱۹۳۱ء کی تحریکوں نے ہندی نوجوان کے دل میں موجودہ نظام سے بیزاری کی سلگتی ہوئی چنگاری کو بھڑکا کر انقلاب کے شعلوں کی صورت دے دی جن کی متحرک روشنیاں اُردو کے نگارخانے میں نمایاں ہیں۔ فسطائیت و بربریت کے خلاف چین اور ہسپانیہ کی جدوجہد اور امن وتہذیب عالم پر نازی درندگی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے خطرے اور دوسرے تلخ حقایق کا ہمارے جو شعرا آسانی سے سامنا نہ کرسکے اپنے پیشروؤں کی راہ پر آگ اور خون کے اس دہکتے ہوئے طوفان کی طرف سے آنکھیں بند کر کے رومان کے دلفریب قلعہ میں محصور ہو گئے قوس قزح کی سی رنگین وادیوں میں جوانی کے نشاط انگیز نغمے گانے لگے۔ بعض دوسرے جن پر مذہب کا رنگ غالب ہے کی ساری برائیوں کی بنا اسلام اور اس کے پیش کردہ اُصول وضوابط سے انحراف کو سمجھتے ہیں اور اُنھیں یقین ہے کہ موجودہ بدحالی وافراتفری پیغمبر اسلام کے بتائے ہوئے طرز زندگی اختیار نہ کرنے کا نتیجہ ہے اور اگر ہم پھر ان اُصولوں پر لوٹ جائیں تو فارغ البالی، خوشی اور مسرت ہمارے قدم چومنے کو مہیا ہوگی۔ ان شعرا کا تخاطب زیادہ تر مسلمانوں سے ہے لیکن جگہ جگہ ہم ان کا مخاطب ساری دنیا کے مظلوم طبقے کو سمجھتے ہیں۔

بندۂ مزدور کو جاکر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر — شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی — اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے — مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے
کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو — اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو (اقبالؔ)

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان اشعار کے بعد اقبالؔ "انقلاب زندہ باد" کا فلک شگاف نعرہ لگانے ہی والے ہیں جس سے سرمایہ داری اور اسی قسم کی تمام چیزوں کے خلاف بغاوت کے شعلے بھڑک اُٹھیں گے جن کی لپکتی ہوئی زبانیں مہاجنوں، رئیسوں اور جاگیرداروں کو چاٹ کر فنا کر ڈالیں گی۔ یہاں تو خیر اس کا خیال ہی آتا ہے لیکن روشؔ اُدھر صاف صاف لفظوں میں پکار اُٹھتا ہے:- انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

لیکن ہمارے بیشتر شعراء ایسے ہیں جنھوں نے موجودہ مفلوک الحالی، پریشانی اور سرمایہ داری کے دور کرنے کے لئے اشتراکیت کے سرخ چہرے پر اپنی نظریں جما رکھی ہیں اور جنھیں اس ملک کی آیندہ زندگی میں یہاں کی اکثریت کے پارٹ کا احساس ہے۔ یہ شعراء ہندوستان کے نچلے طبقے کی فلاکت زدہ اور قابلِ رحم حالت کا نقشہ اُتارتے ہیں۔ انھیں اسکا احساس ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام ان کی اس غریبی کا ذمہ دار ہے

اک ضعیفہ سو رہی ہے راستہ میں خاک پر — مردنی چھائی ہوئی ہے چہرۂ غمناک پر
عبرت و دہشت کا خنجر ہے دلِ غمناک پر — ہائے یہ بے دم پڑا ہے کون ٹھنڈی خاک پر
آہ اے بیکس ضعیفہ غم کی تڑپائی ہوئی،
اے زمانے کی جھنجھوڑی زر کی ٹھکرائی ہوئی (جوشؔ)

ایک دوسری جگہ وہ کسان کی طرف ہماری توجہ دلاتا ہے:

جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ — جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ
جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار — جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہریار
اپنی دولت کو جگر پر تیرِ غم کھاتے ہوئے — دیکھتا ہے ملک دشمن کی طرف جاتے ہوئے
دھوپ سے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں — کھیت سے پھیرے ہوئے منھ گھر کی جانب ہے رواں
قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیِ حرماں سے راہ — فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پر ہے نگاہ
سیم و زر نان و نمک آب و غذا کچھ بھی نہیں — گھر میں ایک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں

"ایک تقابل" میں وہ سرمایہ دار اور مزدور طبقہ کو آمنے سامنے لاکر کھڑا کر دیتا ہے اور اس نظام کی خرابی کی طرف توجہ دلاتا ہے جس کی وجہ سے ان دو طبقہ کے آدمیوں میں زمین و آسمان کا فرق نمایاں ہے۔ وہ دنیا میں ہماری معاشرت کے ان دو گروہوں میں ایک کو بغیر کسی محنت و تکلیف کے عیش و تنعم کی زندگی گزارتے دیکھتا ہے اور دوسرے کو سر کا پسینہ پیر وں تک پہونچانے کے باوجود جانوروں کی سی زندگی بسر کرتے پاتا ہے اس کا دل شدتِ احساس سے بھڑک اُٹھتا ہے اور وہ بیچارگی کے عالم میں "ماورائے فہمِ ہستی" پر نکتہ چینی کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔

احسان زیادہ تر اپنی نظموں میں ہماری مزدور پیشہ جماعت کے مصائب کا خاکہ اتارتا ہے۔ ایک "مظلوم بچہ" جو "جھکا میداں میں جھاڑو دے رہا ہے یکہ و تنہا"۔ اس کی ہمدردی حاصل کر لیتا ہے اور وہ اس کے طفلانہ جذبات کا اندازہ کر کے تڑپ اٹھتا ہے ۔

دمادم جب گلی سے گیند کی آواز آتی ہے　　رخ طفلی پہ اک بیچارگی سی دوڑ جاتی ہے

غرض ہماری انقلابی شاعری بنی نوع انسان سے محبت و ہمدردی کا آئینہ ہے۔ ہمارا شاعر تنگ و تاریک کوچوں، متعفن گلیوں، ٹوٹے پھوٹے مکانوں، جھلسی ہوئی جھونپڑیوں حتیٰ کہ جسم فروشی کی مکروہ دوکانوں کا گہری ہمدردی سے مشاہدہ کرتا ہو وہ پیٹ کے بل رینگنے والے محتاجوں، سڑکوں پر گھسٹنے والے بھک منگوں، روٹی کے ایک ٹکڑے پر لڑنے والے انسانی درندوں کا نقشہ کھینچ کر ہمارے دلوں کو احساس کی آگ سے پگھلاتا ہے۔ وہ سر کا پسینہ پیر تک پہونچانے والے مزدوروں، پتھر کوٹنے والی "شہزادیوں" قحط زدہ کسانوں، بھوکے ننگے کارخانہ داروں کی عکاسی ایسے خلوص ایسی ہمدردی اور اس شدت احساس سے کرتا ہے کہ ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں وہ اس فاقہ کشی، فلاکت اور تہیدستی کا ذمہ دار بڑے پیٹ اور چھوٹے سر رکھنے والے سرمایہ داروں کو ٹھیراتا ہے۔ وہ ان کی ہڈیاں چچوڑنے سے بپھرا ہوا ہے۔ صنعت و تجارت کے ان اجارہ داروں کو نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا ہے ۔

وہ سمجھتا ہے کہ ابھی تک ہندوستان میں بیداری کی لہر نہیں دوڑی۔ یہاں کے غلام سرمایہ داری کی میٹھی لوریوں اور سم آمیز تھپکیوں کے زیر اثر محو خواب ہیں۔ وہ انھیں جاگنے کو پکارتا ہے، ہوش میں آنے کو کہتا ہے اور بدلے ہوئے زمانہ کی طرف متوجہ کرتا ہے :

بیدار ہے پھر فتنۂ چنگیز جہاں میں،　　اور تو ہے کہ ابتک اثر خواب گراں میں
صیاد کمیں میں ہے تو ناوک ہے کماں میں　　پیشانی دوراں پہ ہیں شب خون کے آثار
بیدار ہو بیدار ہو بیدار ہو بیدار　　(جوش)

لیکن اس پر بھی جب اس کی آواز کا کوئی اثر ہوتا دکھائی نہیں دیتا تو وہ شدت احساس سے دیوانہ ہو جاتا ہے۔ اپنے سوئے ہوئے ساتھیوں کو جگانے کے بجائے جھنجھوڑتا ہے اور ان کی بے حسی پر فریاد کرتا ہے اور بے حس مظلوموں اور برسر اقتدار ظالموں کے ہجوم میں اپنے آپ کو بے بس پا کر "دعوت جنگ" دے اٹھتا ہے :

دیکھ وہ مزدور اٹھے ہیں برائے انتقام
ہاں الٹتا ہے تجھے سرمایہ داری کا نظام
کیوں نہیں ہوتی تری تلوار آخر بے نیام
اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ
جن کے آگے ہاتھ کانپیں ان حسینوں کو نہ دیکھ
تو ہے جلاد فلک زہرہ جبینوں کو نہ دیکھ
آسماں پر وار کر بڑھ کر زمینوں کو نہ دیکھ
اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ　　(جذبی)

وہ دولت کی اس غیر مساوی تقسیم سماج کی سرمایہ دارانہ تنظیم اور ذرائع پیداوار کی ذاتی ملکیت کو ان سب جھگڑوں کا بانی سمجھتا ہے اور "سرمایہ داری کے خلاف" علانیہ طور پر کہہ اُٹھتا ہے:

تا کجا یہ زر کی چوکھٹ کا طواف ، جنگ کر سرمایہ داری کے خلاف
خون ہے سلطاں کا بھوکوں کو معاف
چھنک رہا ہے ہر طرف سونے کا جال تیز بجلی کی طرح خنجر نکال
کر خدائی کے خداؤں کو حلال (جاں نثار اختر)

وہ اس نظام کے دشمن ہیں اور ہر ممکن طریقہ سے ہمیں سرمایہ داری کے خلاف اکسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ الطاف مشہدی کے یہاں ایک ماں اپنے بچوں کو وصیت کرتی ہے:

زور بازو سے بدل دو گردش ایام کو نوچ لو زربفت میں لپٹے ہوئے اجسام کو
کھینچ لو ان معصیت کاروں کی بینائی کا نور توڑ کر رکھ دو زر و دولت کے بندوں کا غرور
ٹھوکروں سے سیم و زر کے بت ملا دو خاک میں تب مسرت کی چمک ہو دیدۂ غمناک میں

لیکن بغاوت پر ہمارے مختلف شعراء کی نظریں مختلف زاویوں سے پڑتی ہیں۔ مجاز کی نظریں اس سوئے ہوئے سمندر میں بغاوت کی لہریں بیدار ہوتے دیکھ رہی ہیں۔ وہ قیدیوں کی گھبرا کر زنجیر توڑنے کی آواز سن رہا ہے:

آ رہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے آگ دامن میں چھپائے خون برساتے ہوئے
بڑھ رہے ہیں دیکھ وہ مزدور دراتے ہوئے اک جنوں انگیز لے میں جانے کیا گاتے ہوئے
بھوک کے مارے ہوئے انساں کی فریادوں کے ساتھ فاقہ مستوں کے جلو میں خانہ بربادوں کے ساتھ
گر پڑیں گے خوف سے ایوانِ عشرت کے ستوں خون بن جائے گی شیشوں میں شراب لالہ گوں
حشر در آغوش ہو جائے گی دنیا کی فضا دوڑتا ہوگا ہر اک جانب فرشتہ موت کا
اس طرح لیگا زمانہ موت کا خونی سبق آسماں پر خاک ہوگی فرش پر رنگ شفق
اور اس رنگ شفق میں باہزاراں آب و تاب جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

اور شباب "انقلاب کی پکار" میں جوش کے اس شعر کی تشریح کرتے نظر آتے ہیں:

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

لیکن علی سردار جعفری صرف سیاسی انقلاب کا قایل نہیں وہ ایک مکمل انقلاب کا قایل ہے اور ایک ایسی بغاوت چاہتا ہے جو ذہنی، اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی اور مذہبی فضا کو بدل دے:

بغاوت میری منزل ہے بغاوت راستہ میرا بغاوت میرا مذہب ہے بغاوت دیوتا میرا
بغاوت رسم چنگیزی سے تہذیبی تتاری ہے بغاوت جبر و استبداد سے سرمایہ داری ہے
بغاوت اپنی آزادی کی نعمت کھونے والوں سے بغاوت عظمت رفتہ کے اوپر رونے والوں سے
بغاوت مفلسی کی عاجزانہ بددعاؤں سے بغاوت سخت پتھر کی طرح بے حس خداؤں سے

مکتوبات نیاز

ایک صاحب نے یہ مصرعہ پڑھا: "تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی"۔ دوسرے صاحب نے جو نہایت ہی متین قسم کے مسخرے واقع ہوئے ہیں، بہت آہستگی سے کہا ۔ "جی ہاں، جیسی ہوئی صورت سے ظاہر ہے" یہ گویا نثر میں مزاحیانہ تبصرہ یا جواب تھا اس مصرعہ کا ۔

بالکل اسی طرح میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ اگر تم احباب کے مشورہ بغیر وہاں پہونچ بھی گئے تو کیا؟ جیسے پہونچے ہو وہ خود تمھاری تحریر سے ظاہر ہے ۔

برادر عزیز ۔ ارادہ کی پختگی اور عزم کی استواری بہت معقول بات ہے، لیکن غور و تامل اور عاقبت اندیشی بھی کوئی چیز ہے یا نہیں ۔ فوراً کسی بات کو عمل میں لے آنا اور عجلت ان دونوں میں بڑا فرق ہے ۔

بہرحال اب کہ تم وہاں پہونچ گئے ہو، یہ دوسری حماقت ہوگی اگر گھبرا کر جلد واپس آگئے ۔ بمبئی جانا اپنے آپ کو دریا میں ڈال دینا ہے ۔ اگر ہاتھ پاؤں ہلاکر کوئی شخص ساحل تک پہونچ گیا تو اس میں شک نہیں وہ "جنّت عدن" تک پہونچ گیا، لیکن اگر ہاتھ پاؤں جواب دے گئے تو پھر تحت الثریٰ کے سوا کہیں ٹھکانا نہیں ۔

غنیمت جانو کہ اس زمانہ میں وہاں تمھیں سر چھپانے کی جگہ تو مل گئی ہے کچھ دن صبر و استقلال سے کام لیکر وہیں قیام کرو ۔ میں اپنے بعض احباب کو لکھ رہا ہوں، ان کا جواب آنے پر تمھیں اطلاع دوں گا ۔

خط ملا ۔ حیرت ہے کہ تم اُن کی شکایت کرتے ہو اور صرف اس لئے کہ تم ان کی محبّت کی تاب نہیں لا سکتے ۔ بیوقوف ـــــ "ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را نہ دہند" ۔

اقبالؔ کا مشہور مصرعہ ہے:

"محبّت کے لئے دل ڈھونڈھ کوئی ٹوٹنے والا"

لیکن بیدل اس سے زیادہ لطیف و دلکش انداز میں یوں کہتا ہے:

"جو لانکدۂ پرتو ماہ اندکّ نہا"

اس لئے اگر کسی کی نگاہ نے تمہارا انتخاب کر لیا ہے، تو تم کو فخر کرنا چاہیئے، نہ کہ شکایت!
تمھیں نہیں معلوم کہ "دامان تار تار" کیا چیز ہے اور اس کے اندر سے آفتاب کی جو شعاعیں گزرتی ہیں، وہ کائنات کو اپنے ساتھ لیکر گزرتی ہیں!

خرمن دل را ہماں شمعِ وفا باید، نہ برق
خاطرِ پروانہ از سہرآتشے خورسند نیست

جی ہاں، میں واپس آگیا، لیکن اس حال میں کہ
شیشۂ طاقت بہ سنداں می زنم
غالب اپنی ایک مثنوی میں خدا سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:
یا مجالِ گفتن دہ، یا نہ گفتہ باور کن
میں آپ سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا، کیونکہ میں کہوں بھی تو آپ سنتے کب ہیں۔
بہر حال، آپ باور کریں یا نہ کریں، فی الحال میں قطعاً اس قابل نہیں کہ تعمیل ارشاد کر سکوں۔ میں نے پہلے بھی یونہی ضعیف سا وعدہ کیا تھا، آپ نے اسے اگر نصوح کا سا عہد و پیمان سمجھا تو یہ آپ کا حسنِ ظن تھا
دس بارہ دن کی غیر حاضری کی وجہ سے خود میرا کام اتنا پچھڑ گیا ہے کہ اس کا بر وقت لانا مشکل ہے۔ خطوں کا انبار سامنے ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرف سے شروع کروں۔ دیکھیئے، اگر ہفتہ عشرہ کے بعد اطمینان نصیب ہوا، تو ممکن ہے آپ کی برہمی کو دور کر سکوں۔ اس وقت تو میں خود اپنے آپ سے بیزار ہوں اور اُلجھ رہا ہوں۔

بندہ نواز — کس قدر شرمندہ ہوں کہ گرامی نامہ کا جواب غیر معمولی تاخیر سے بھیج رہا ہوں۔ ممکن ہے آپ کچھ خیال نہ فرمائیں، لیکن میں خود اس کوتاہی کو محسوس کرتا ہوں اور نادم ہوں —— آپ کو شاید علم نہیں کہ میں اس زمانہ میں اکثر و بیشتر باہر رہا اور جب لوٹا تو حال یہ تھا کہ جسم کے ساتھ دل و دماغ بھی بیکار تھے۔ دو دن تو صرف اس سوچ میں بسر ہوگئے کہ کیا واقعی میں حیدر آباد گیا تھا اور گیا تھا تو زندہ کیونکر واپس آسکا۔ خود میں نے سفر بہت آرام سے کیا، لیکن دوسروں کی حالت دیکھ دیکھ کر میرے اعصاب میں بار بار ایسا تشنج پیدا ہوا کہ اب کیا عرض کروں — اس میں شک نہیں کہ آجکل سفر کرنا جہاد ہے، لیکن جہاد بھی وہ جس میں انسان صرف شہید ہو سکتا ہے، غازی نہیں بن سکتا۔ مشکل سے ایک ہفتہ کے بعد اس قابل ہوا ہوں کہ ڈاک دیکھ سکوں اور ڈاک دیکھنے کے بعد سب سے پہلے آپ ہی کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔ خیر، یہ معذرت معقول ہو یا نامعقول، مجھے کرنا ہی تھی، اب میں اصل مدعا کی طرف آتا ہوں۔

دُنیا وما فیہا

اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ لانبے آدمی بہ نسبت پستہ قد لوگوں کے، دُبلے پتلے بہ نسبت موٹے آدمیوں کے، شادی شدہ بہ نسبت کنواروں کے اور ترکاری کھانے والے بہ نسبت گوشت کھانے والوں کے زیادہ عمر پاتے ہیں۔

امریکہ کے ایک حصہ میں لاریوں کے پنکچر کا بھی بیمہ کیا جاتا ہے اور نقصان سے بچنے کی تدبیر یہ اختیار کی گئی ہے کہ ایک بڑا مقناطیس لاریوں کے آگے پہیے کے پاس لٹکا دیا جاتا ہے جو راستہ کی تمام کیلوں وغیرہ کو کھینچ لیتا ہے۔

چنانچہ ایکبار کسی لاری کے مقناطیس نے ایک چکر میں ۶۰۳ پونڈ وزن کی کیلیں وغیرہ کھینچکر راستہ صاف کر دیا۔

کولمبیا (امریکہ) میں دو کپڑا بنانے کی ملیں ایسی ہیں، جو صرف انسانی بالوں سے کپڑا طیار کرتی ہیں۔ یہ کپڑا ان ہولوں سے تیل نکالنے کے کام آتا ہے۔

جہاں ربڑ کی کاشت ہوتی ہے وہاں اکثر بندوقوں کے چھٹنے کی سی آواز آتی رہتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ربڑ کی پھلیوں میں اندر گیس بھری رہتی ہے اور جب پکی پھلی پھٹتی ہے تو اس میں سے آواز پیدا ہوتی ہے اور اس کے بیج سو سو فیٹ تک دور جا کر گرتے ہیں اور اُگ آتے ہیں۔

انگلستان میں ہر صبح اخباروں کی ایک کرور ۳۰ لاکھ کاپیاں ایک کرور ۲۰ لاکھ خاندانوں تک پہونچ جاتی ہیں اور شام کو ۷۰ لاکھ کاپیاں۔ اتوار کی اشاعتوں کی ایک کرور ۵۰ لاکھ کاپیاں، اور ۱۹۲۱ مختلف رسالوں کی کاپیاں ان کے علاوہ ہیں

جاپان میں اونچے اور متوسط طبقہ کی عورتوں کے جسم پر ایک وقت میں کم از کم نو لباس ہوتے ہیں اور ان کے پہننے میں کم از کم ایک گھنٹہ صرف ہوتا ہے۔

جعلی دستخط بنانے والے زیادہ تر بلاٹنگ پیپر کی مدد سے کام لیتے ہیں، یعنی بلاٹنگ پر جو نشان دستخط کے رہ جاتے ہیں اُس کو سامنے رکھکر جعلی دستخط بناتے ہیں۔ امریکہ کے بنکوں نے اس سے محفوظ رہنے کے لئے ایک نئے قسم کا بلاٹنگ طیار کرایا ہے جو روشنائی کو جذب تو کر لیتا ہے لیکن کسی تحریر کا نشان اس پر قایم نہیں رہتا۔

جس شیشے سے مصنوعی آنکھیں طیار ہوتی ہیں، وہ شیشہ جرمنی سے آتا ہے اور صرف ایک ہی خاندان کو اس شیشے کی طیاری کا راز معلوم ہے جو سنہ ۱۸۳۶ء میں اسے کسی طرح معلوم ہو گیا تھا۔

برما میں قاعدہ تھا کہ قبایلی عداوت کے سلسلہ میں جب دشمن کو ہلاک کر دیتے تھے تو اس کا سر ازراہ تفاخر اس کے خاندان والوں کے پاس ڈاک خانہ کے پارسلوں کے ذریعہ بھیجدیتے تھے، لیکن جنگ سے قبل ہی وہاں کے محکمۂ ڈاک نے ایسے پارسلوں کی روانگی منسوخ کر دی۔ اب ممکن ہے پھر یہ وحشی رسم جاری ہو گئی ہو۔

غالب کا ایک غیر مطبوعہ قطعۂ تاریخ

ڈاکٹر نصیر الدین صاحب علوی نے میرٹھ سے ہمیں غالب کا ایک غیر مطبوعہ قطعۂ تاریخ بھیجا ہے جو طب کی کتاب پر تحریر ہے۔

قطعۂ تاریخ اختتام کتاب از نتائج افکار سر آمد فارسی دانان ایران سلطان الشعراء ہندوستان اعنی نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ المشہور مرزا نوشہ دہلوی متخلص باسدؔ و غالبؔ۔

سلیم خاں کہ وہی نور چشم واصل خاں　　حکیم حاذق و دانا ہے ...[1]
تمام دہر میں اسکے مطب کا چرچا ہے　　کسی کو یاد بھی لقمان کا نہیں ہے نام
اسے فضائل علم و ہنر کی افزائش　　ہوئی ہے مبدع عالم سے اسقدر انعام
کہ بحث علم میں اطفال ابجدی اس کے　　ہزار بار فلاطوں کو دے چکے الزام
عجیب نسخۂ نادر لکھا ہے اک اس نے　　کہ جس میں حکمت طب ہی کی مسئلے ہیں تمام
نہیں کتاب ہے ایک منبع نکاتِ بدیع　　نہیں کتاب ہے ایک معدنِ جواہر کام
کل اس کتاب کے سال تمام میں جو مجھے　　کمال فکر میں دیکھا خرد نے بے آرام
کہا یہ جلد کہ تو اس میں سوچتا کیا ہے　　لکھا ہے "نسخۂ تحفہ" یہی ہے سال تمام

---

[1] اس کے بعد کے کچھ الفاظ شاید نقل کرنے سے رہ گئے

صنعت میں حصہ لینے والوں ([illegible]) کی تعداد میں پانچ فیصدی اور کاشتکاروں کی تعداد میں جس کا تناسب اس وقت ستر فیصدی کے قریب ہے ایکسوتیس فیصدی کے حساب سے بانوے یا ترانوے فیصدی کا اضافہ ہو جائے گا اس حساب سے ہندوستان کی آبادی میں بھی اٹھانوے فیصدی اضافہ کی ضرورت ہے، پتہ نہیں اس پلان میں تضعیف نسل کی بھی کوئی اسکیم شامل ہے یا نہیں، معترضین کے خیال میں چونکہ ہندوستان زراعتی ملک ہے اس لئے یہاں کی زراعت کی طرف زیادہ توجہ کی ضرورت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ہندوستان آج خالص زراعتی ملک بن گیا ہے۔ پہلے یہ ایسا نہ تھا یہاں کی آبادی بہت کم تھی اور غلہ صرف یہیں کی ضرورت کے مطابق پیدا کیا جاتا تھا زیادہ تر لوگ صنعت و حرفت میں لگے رہتے تھے یہاں کی تجارت کا مال دور دور تک ممالک میں پہونچتا تھا اور نفاست میں یہاں کی مصنوعات کا کوئی ملک مقابلہ نہیں کر سکتا تھا دو سو سال قبل جب انگلستان خالص زرعی ملک تھا اور سوائے یارک شائر اور نارفک کی فلالینوں کے وہاں کوئی خاص طور پر قابل ذکر چیز نہ بنتی تھی، ہندوستان ان کی ساری ضروریات پوری کرتا تھا لوہا تک یہاں سے جاتا تھا اور ان کے جہاز ہندوستان کی بندرگاہوں میں بنتے تھے پچاس سال قبل بھی ہندوستان کی صنعت یہاں کی زراعت سے زیادہ اہم سمجھی جاتی تھی، لیکن آج انگلستان، جاپان اور جرمنی نے جو پہلے خالص زرعی ممالک تھے صنعت و حرفت میں اتنی ترقی کی ہے کہ وہ اس لحاظ سے دنیا کے ممالک کی صف اول میں جگہ پاتے ہیں ان میں اکثر و بیشتر ممالک ہماری دولت، ہمارے وسایل اور ہمارے یہاں کی خام پیداوار سے متمتع ہوتے رہے ہیں۔ لہذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اپنے وسایل و دولت کی حفاظت کی غرض اپنے صنعت کے احیاء کی کوشش کریں اس کے لئے محصولات کی پالیسی (Tariff Policy) کا ہمارے ہاتھ میں ہونا ضروری ہے کتنی حیرت کی بات ہے کہ جنگ سے قبل جاپانی ہمارے یہاں سے کپاس لے جاتے تھے اسے کات کر کپڑے بنتے، پھر اسے ہندوستان میں لاکر بیچتے اور ہمیں اپنے یہاں کے کارخانوں میں بنے ہوئے کپڑوں سے زیادہ ارزاں قیمت پر ملتے، سمجھ میں نہیں آتا کہ بیچ (middle man) کو کیا ملتا تھا۔ آج سے چھ سال قبل کشمیر سے ایک ٹن سیب کا محصول کلکتہ تک تیس روپے دینا پڑتا تھا، اور امریکہ سے اتنے ہی سیب اس شہر تک صرف اُنیس روپے میں پہونچ جاتے تھے، گویا یہاں کے مال کی کھپت محصول کی زیادتی کے سبب اپنے ہی ملک میں نہیں ہو سکتی، باہر کا کیا ذکر!

اس پلان کی حمایت میں تیسری بات ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ آج افراط زر (Inflation) کی وجہ سے روپیہ کی قیمت کم ہوگئی ہے اور اشیاء کی قیمت میں بہت اضافہ کیا گیا ہے لیکن کاشتکار غلوں کی قیمت پر کنٹرول ہو جانے اور بکنگ (Booking) بند ہو جانے اور غلہ کا نقل و حمل ممنوع قرار دینے کے باعث کاروبار کرنے والوں کے مقابلہ میں بہت کم فایدہ اُٹھا سکے ہیں پھر جب اختتام جنگ کے بعد تفریط زر (Deflation) کے سبب سے قیمت میں کمی شروع ہو جائے گی تو مزدوروں اور ملازمت پیشہ لوگوں سے بھی زیادہ کاشتکاروں ہی کا نقصان ہوگا ایک تو اس سبب سے کہ مصنوعات کی قیمت میں بتدریج کمی ہوگی اور غلہ کا دام یکایک گرنا شروع ہوگا اور بیچارے کاشتکاروں کو زندگی کی ضروری اشیاء کے ساتھ کاشتکاری کے لوازم سے مہنگے داموں خریدنا پڑیں گے اور نفع کم ہوگا، علاوہ اس کے جلد جلد قیمت کے کم ہونے کے سبب ایسا بھی ہوگا کہ فصل بوئی جائے گی گرانی کے زمانہ میں اور وہ طیار ہوگی ارزانی کے وقت اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روپے اور محنت صرف کرنے کے باوجود اس میں خاطر خواہ ترقی نہ ہو سکے گی۔

[redacted]

پوسٹ وار تعمیری کمیٹی

مارچ سنہ ۱۹۴۳ء میں ہز اکسلنسی جناب گورنر جنرل نے پوسٹ وار تعمیری کمیٹی قایم کی ہے جسکے وہ خود صدر ہیں اور مسٹر جوالا پرشاد سریواستوا سکریٹری، یہ کمیٹی ایک جنرل پالیسی کمیٹی اور چھ دوسری مالی کمیٹیوں کے تعاون سے کام کر رہی تھی ان کی معاونت و مشورہ کے لئے کئی مجالس شوریٰ بھی ہیں مثلاً انڈسٹریل اینڈ سائنٹفک ریسرچ پالیسی کمیٹی (Industrial & Scientific Research Policy Com.) ویمن سوشیل سروس کمیٹی (Women Social Service Com.) اور جائزۂ صحت کمیٹی (Health Survey Comm.) وغیرہ۔

پوسٹ وار تعمیری کمیٹی کے پہلے اجلاس میں سر جوالا نے فرمایا تھا کہ جنگ کے بعد کے تعمیری پروگرام میں ان باتوں کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہندوستان کا معیار زندگی بلند کیا جائے، اس کے ساتھ ساتھ زرعی و صنعتی پیداوار میں معتد بہ اضافہ ہو، ہندوستان کی بیرونجات میں قوت خریداری بڑھے اور ایسی اشیاء کی پیداوار بڑھائی جائے جس کی طلب بیرونجات میں زیادہ ہو کمیٹی کے پروگرام میں جنگ سے واپس آئے ہوئے فوجیوں کی ملازمت، فضائی پرواز کی تعلیم، برقی ترقی اور اشیاء کے اسباب نقل و حمل میں سہولتیں پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ چند ماہ ہوئے کمیٹی نے ایک رپورٹ بھی شایع کی تھی۔

سر اردشیر دلال کا تقرر

اسی زمانہ میں جب انگلستان میں بمبئی پلان پر اقتصادی و صنعتی حلقوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں، دہلی سے ایک سرکاری اعلان کے ذریعہ اطلاع ملی کہ تعمیری کمیٹی جو ایک سال سے کام کر رہی تھی اب اس منزل پر پہونچ چکی ہے کہ اس کا ایک الگ محکمہ قایم کر دیا جائے، چنانچہ ہز اکسلنسی وائسرائے نے فیصلہ کیا کہ ان کی مجلس عاملہ میں ایک نئے رکن کا اضافہ کیا جائے، چنانچہ اس کے لئے سر اردشیر دلال کا اس جگہ پر تقرر کیا گیا۔

سر اردشیر دلال، انڈین سول سروس کے ریٹائرڈ ممبر ہیں اور بڑے ذمہ دار عہدوں پر رہ کر حکومت بمبئی اور حکومت ہند کے ماتحت پبلک خدمات انجام دے چکے ہیں اس کے علاوہ مجالس مقننہ کے رکن کی حیثیت سے بھی کئی سال تک قوم کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ آپ ٹاٹا کمپنی جمشید پور کے حصہ دار اور ڈائرکٹر رہے ہیں اور ہندوستان میں ماہر صنعت و ماہر اقتصادیات کی حیثیت سے خاص پوزیشن رکھتے ہیں، بمبئی پلان کے بنانے میں آپ بھی شریک تھے۔

سر اردشیر کے تقرر پر اظہار خیال

سر اردشیر کے تقرر سے ہندوستانی سیاسی حلقوں میں خیال کیا جا رہا ہے کہ موجودہ سیاسی تکدر شاید غیر معین مدت تک جاری رہے گا اور حکومت و کانگرس کے درمیان کوئی مصالحت کی صورت مستقبل قریب میں پیدا نہ ہوسکے گی لیکن سر اردشیر نے ایک اخباری نمایندہ سے دوران ملاقات میں اس خیال کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ جہاں تک اقتصادی امور کا تعلق ہے حکومت وسعتِ نظر و وسعتِ خیال کا ثبوت دے رہی ہے۔ بمبئی انڈسٹریل پلان کے متعلق فرمایا کہ حکومت اس کے مقاصد سے اتفاق کلی کا اظہار کر چکی ہے۔

اخبار "پروڈیگل" (Prodigal) ان کے تقرر پر اظہار رائے کرتے ہوئے لکھتا ہے "ہندوستان کی تجارتی تنظیمی جماعتوں نے عرصہ سے سیاسی تنظیمی جماعتوں کے مقابلہ میں بہتر تعمیری ذہن کے مالک ہونے کا ثبوت دیا ہے چنانچہ اردشیر دلال کا وائسرائے کونسل میں تقرر مفید ثابت ہوگا" مگر سوال یہ ہے کہ کس کے لئے؟ ہندوستان کے لئے

ہفتہ وار جریدہ "نیویارک ٹائمز" لکھتا ہے "اب تک ہندوستان کے تجار اور ماہرین صنعت کی جماعت کانگریس کی ہمدردی کرتی رہی ہے لیکن اب جبکہ ہندوستان میں نیشنل کانگرس کے اثر میں انحطاط شروع ہوگیا ہے تو نہایت ضروری ہے کہ حکومت سے تعاون کیا جائے، چنانچہ سرار دشیر کا یہ تقریر اسی بات کا ثبوت ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ جنگ نے بہت زیادہ امید افزا صورت پیدا کردی ہے اس لئے ہندوستانی انڈسٹرلیسٹ نے مصلحت اسی میں سمجھی ہے کہ برطانیہ اور حکومت سے تعاون کیا جائے۔ لیکن ہماری سمجھ میں تو یہ بات آتی ہے کہ غیر ملکی سرمایہ داروں کو خوف ہونے لگا ہے کہ ہندوستان کی تجارت، صنعت اور معدنیات میں ان کے جو روپے لگے ہوئے ہیں، معرض خطر میں پڑ جائیں گے چنانچہ ان کے مفاد کے پیش نظر یہ پالیسی اختیار کی گئی ہے کہ حکومت کے بست و کشاد میں تجار و ماہرین صنعت کا ہاتھ بھی رہے تاکہ "مشترک مفاد" ہندوستان میں بیرونی سرمایہ کے تحفظ کا ضامن رہے۔

لیکن جیسا کہ ۲۷ جون ۱۹۴۴ء کو رخصتی پارٹی کے موقع پر ٹاٹانگر میں مسٹر گنڈی جنرل منیجر ٹاٹا کمپنی کے ایڈریس کے جواب میں سرار دشیر نے یہ فرماتے ہوئے کہ قوم و ملک کی خدمت کا ایک دیرینہ خواب تھا جس کی تعبیریں ان کے لئے مہیا ہو رہی ہیں یقین دلایا ہے کہ اس سن و سال میں وہ قوم کے مفاد کے لئے جا رہے ہیں اور اپنی ذمہ داری کا انھیں پورا پورا خیال رہے گا اور نیشنل گورنمنٹ کے قیام کی جب صورت پیدا ہو جائے گی تو وہ خوشی سے اپنی جگہ سے علٰحدہ ہو جائیں گے، ہم امید کرتے ہیں کہ وہ اپنی اُن ذمہ داریوں کا خیال رکھیں گے جو ان پر قوم و ملک کی طرف سے عاید ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمارا ہر اقدام جو انگلستان کے مفاد کے خلاف ہوگا اس میں رکاوٹیں پیدا کی جائیں گی لیکن یقین ہے کہ سرار دشیر اس کا پامردی سے مقابلہ کریں گے۔

عالمگیر افراط زر اور اقوام عالم کے لئے اقتصادی خطرہ

آج تمام ممالک میں جو شریک جنگ ہیں افراط زر[1] کے سبب زر کی قیمت گھٹ گئی ہے اور اشیاء کی قیمت میں اضافہ ہوگیا ہے جس کے سبب عوام کا معیار زندگی پست ہوگیا ہے اور ہر چند آلات اور دوسری

---

[1] "افراط زر" (Inflation) اور "تفریط زر" (Deflation) کی صورت "زر رائج" کی کمیت سے متعلق ہے اور اصطلاحات "اقتدار زر" (appreciation) و "انحطاط قیمت زر" (depreciation) کا واسطہ زر کی کیفیت سے رہتا ہے۔ افراط زر کی صورت اسوقت پیدا ہو جاتی ہے جب زر کی سپلائی اسکی طلب سے زیادہ ہو جاتی ہے، اسکی قیمت خریداری کم ہو جاتی ہے اور اشیاء کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے اسی طرح جب اس کے برعکس صورت پیدا ہو جاتی ہے یعنی زر کی سپلائی اپنی طلب کے مقابلہ میں غیر متناسب درجہ میں گھٹ جاتی ہے اور اجناس کی قیمت بھی گر جاتی ہے تو اسے تفریط زر کہتے ہیں اسے اور واضح طور پر یوں سمجھا یا جا سکتا ہے کہ زر کی پیداوار اسکی ضرورت سے زیادہ عمداً بڑھا دیجاتی ہے تو اسے ہم افراط زر کہتے ہیں — یا اگر عمداً اشیاء کی پیداوار کم کردیجائے اور زر کی ضخامت میں کمی نہ ہو تو بھی افراط کی صورت پیدا ہو جاتی ہے لیکن تجارت کی ضخامت یا آبادی کے اضافہ سے افراط نہیں ہوتا اسی طرح جب تیس چالیس سال قبل جنوبی افریقہ میں سونے کی نئی کانیں نکل آئی تھیں اسوقت بھی سونے کی قیمت میں کمی ہوگئی تھی اور اس کا اثر عام زر پر پڑا تھا لیکن افراط زر کی صورت نہیں پیدا ہوئی تھی، اس کے قدرتی اسباب نہیں ہوتے ہیں بلکہ اس میں مصنوعی ہاتھ کام کرتا ہے — یہ صورت ہمیشہ بڑی جنگوں کے زمانہ میں پیدا ہوتی ہے۔ حکومت کو جنگی جد و جہد یا دفاع کے لئے روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے مصنوعات کی برآمد بند ہو جانے کے سبب باہر سے روپے آنا بھی بند ہو جاتے ہیں اس صورت میں گورنمنٹ دو صورتیں اختیار کرتی ہے یا تو نئے نئے ٹیکس لگاتی ہے یا پھر قرض لینا شروع کردیتی ہے مگر سب سے زیادہ آسانی کی صورت یہی ہوتی ہے کہ حکومت غیر بدل پذیر زر کاغذی (جو سمی زر کاغذی بھی کہلاتا ہے اور غیر معتبر ہوتا ہے) چھاپ کر نکال دیتی ہے اور پھر جنگ ختم ہو جانے پر اسے منسوخ کر دیتی ہے۔

اشیاء کی مانگ بڑھ جانے کے سبب مصنوعات کے عوض کچھ روپے ملکوں کے اندر پہونچ گئے ہیں تاہم ملک کے مالیہ پر اس کا کافی اثر پڑا ہے لیکن اس سے زیادہ خطرہ کی صورت اسوقت پیدا ہوجائے گی جب تنزیل زر شروع ہوگا اور اشیاء کی قیمت بہت کم ہوجائیگی اسوقت ملک کے اندر زر کی بڑھی ہوئی ضخامت کو کم کرنے کے لئے زر کاغذی اور ایسے زر جن کی اصلی قیمت قانونی قیمت سے بہت کم ہے منسوخ کردئے جائیں گے تو ملک کے اندر خلفشار مچیگا مگر اس کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی تجارت ومبادلہ کے میدان میں بھی ملک کی اقتصادی حالت نازک ہوجائے گی، یہی سبب ہے کہ اقوام عالم "معاملات زر" کے "حال" سے زیادہ اس کے "مستقبل" کو سوچ رہی ہے -

بین الاقوامی مانیٹری کانفرنس

آنے والے اقتصادی خطرات کی روک تھام کی غرض سے بریٹن ووڈ (امریکہ) میں ایک بین الاقوامی کانفرنس یکم جولائی سے منعقد ہے جس میں ریاستہائے متحدہ اقوام متحدہ نوآبادیات کے علاوہ اقوام یورپ، مصر، چین اور ہندوستان کو مدعو کیا گیا ہے - ہندوستان کا وفد سر جرمی رائیسمین رکن مالیات، حکومت ہند کی سرداری میں شرکت کے لئے گیا ہوا ہے امیر وفد کے علاوہ وفد میں سر چنتامن دیشمکھ گورنر ریزرو بنک، ڈاکٹر تھیوڈور گرگیوری (اقتصادی مشیر) اور سر شنمکھ چیٹی سرکاری اور مسٹر اے - ڈی شراف غیر سرکاری ممبر شامل ہیں، کانفرنس کے مقاصد میں ایک مستقل ادارہ کے تحت اقوام عالم کے مابین معاملات زر میں تعاون واشتراک عمل پیدا کرنا بین الاقوامی تجارت کی توسیع اور متوازن ترقی کی کوشش کرنا، ممالک شریک کانفرنس کے اطمینان کے لئے معقول تحفظات کے ماتحت فنڈ کے لئے وسائل قائم کرنا جس سے جنگ کے قرضہ کی ادائگی کے توازن میں ان بدعنوانیوں کی اصلاح کی صورت پیدا ہوجائے جو قومی اور بین الاقوامی ترقی کے لئے مخرب ثابت ہوں، بین الاقوامی مبادلہ میں سہولت اور استحکام پیدا کرنا، آیندہ کے تجارتی معاملات کے سلسلہ میں قرضہ اور قیمت اشیاء کی ادائگی میں سہولتیں پیدا کرنا اور رکن کی حیثیت سے شریک کانفرنس ممالک کے بین الاقوامی قرضوں کی ادائگی کی مدت اور اس میں عدم توازن کی بدعنوانیوں کو امکانی حد تک کم کرنے کی کوشش کرنا وغیرہ شامل ہیں - ان مقاصد کی تکمیل کے لئے ایک فنڈ کے قیام کی رائے ٹھیری ہے - اس ضمن کے سارے معاملات پر ممالک شریک فنڈ کے سنٹرل بنک کے ذریعہ عمل درآمد ہوا کرے گا۔

ہندوستان کے نام دعوت نامہ آنے سے قبل، بین الاقوامی مانیٹری کانفرنس میں شرکت اور اس کی صورت پر غور وبحث کرنے کی غرض سے ہندوستان کے ماہرین اقتصادیات سرکاری وغیر سرکاری نشستوں میں سر جوڑکر بیٹھے تھے اور لائحہ عمل تیار کیا گیا تھا - ان کے سامنے دو مسئلے بہت اہم تھے ایک تو اسٹرلنگ میں پھنسے ہوئے جنگی قرضہ کی برطانیہ سے وصولی دوم بین الاقوامی فنڈ میں ہندوستانی حق رائے دہندگی کے معقول تناسب کا مطالبہ - رائٹر کی ۵ جولائی کی ایک اطلاع مظہر ہے کہ اسٹرلنگ میں پھنسے ہوئے قرضہ کی وصولی کے متعلق ہندوستانی وفد کی تجویز کانفرنس نے نامنظور کردی - سر شنمکھ چیٹی نے کانفرنس کے سامنے تجویز پیش کی تھی کہ آلات حرب جو ہندوستان نے جنگی ضرورتوں کے لئے امریکہ کو سپلائی کئے ہیں ان کی قیمت ڈالر سے شرح مبادلہ نہ ہونے کے سبب براہ راست ادا نہ ہوسکی اس لئے ہندوستان کے روپے جو برطانیہ کے یہاں پھنسے ہوئے ہیں ان کی ادائگی کی صورت پیدا کردی جائے۔ کہا جاتا ہے کہ بہت سے ممالک کے وفود نے ہندوستان کی حمایت کی لیکن اکثریت نے باوجود ساری ہمدردیوں کے اس تجویز کی مخالفت کی - مخالفت کی وجہ بجز اس کے اور کوئی نہ تھی کہ فنڈ میں ابھی اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسئلہ کے حل کے لئے اس کی مزید توسیع کی جائے۔

حق رائے دہندگی اور فنڈ میں ہندوستان کے حصۂ رسدی کے متعلق یہاں فیصلہ کیا گیا تھا کہ ہماری آبادی کا تناسب، ہماری موجودہ سیاسی اہمیت اور جنگ کے بعد ہماری اقتصادی پوزیشن کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کرنے کا مطالبہ کیا جائے، دو مہینے قبل سر راما سوامی مدالیر نے دوران تقریر میں اس بات میں خصوصیت کے ساتھ زور دیا تھا کہ کانفرنس کی مجلس عاملہ میں ہماری پوزیشن چین کے بعد نہ رہے ہم اسے کسی طرح منظور نہیں کر سکتے ہیں۔

رائٹر کی ۸ رجولائی کی ایک اطلاع کے مطابق میزان کل آٹھ ارب اسّی کرور ڈالر ہوگی اور بڑے چھ ممالک کے حصّے حسب ذیل ہوں گے ؛

ریاستہائے متحدہ : دو ارب پچھتر کرور ڈالر — حکومت متحدہ (برطانیہ) : ایک ارب تیس کرور ڈالر —

روس : ایک ارب بیس کرور ڈالر — چین : پچپن کرور ڈالر — فرانس : بنیتالیس کرور ڈالر —

ہندوستان : صرف چالیس کرور ڈالر — کناڈا : تیس کرور ڈالر — نیدرلینڈ : ستائیس کرور پچاس لاکھ ڈالر —

بلجیم : بائیس کرور پچاس لاکھ ڈالر — اسٹریلیا : بیس کرور ڈالر — برازیل : پندرہ کرور ڈالر —

چیکوسلاویکیا : بارہ کرور پچاس لاکھ ڈالر — جنوبی افریقہ : دس کرور ڈالر۔

فرانس اپنے حصہ میں مزید اضافہ تو چاہتا ہی ہے اور ہندوستان، مصر، ایران، نیدرلینڈ، نیوزی لینڈ اور یونان بھی اس تقسیم سے مطمئن نہیں ہیں۔ ایک تو یوں ہی ہندوستان کو شکایت تھی کہ اسے چین کے برابر جگہ نہیں دی گئی ہے اور اب تو اسے فرانس سے بھی پیچھے چھٹے نمبر پر جگہ دی گئی ہے مجلس عاملہ میں صرف پانچ ممالک کی آواز وقیع سمجھی جائے گی چھٹا تو محض نمائشی ہے

(باقی) حسرت نعمانی

تنقید[1] کے ایک نئے نقطۂ نظر کی ضرورت

جب بعض لکھنے والے یہ فیصلہ کریں کہ اُردو میں تنقید کا وجود فرضی اور موہوم ہے اُس وقت تنقیدی مواد کا جایزہ لینا یا کوئی نیا نقطۂ نظر پیش کرنا عبث معلوم ہوتا ہے لیکن اس بدلتی ہوئی دنیا میں چھوٹی بڑی جو چیز بھی ہے تغیر کی چکی میں پسی جا رہی ہے، نئے سانچوں میں ڈھل رہی ہے، ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف بڑھ رہی ہے، مقدار میں بدل کر نئی خصوصیتیں پیدا کر رہی ہے اور نئی خصوصیتیں حاصل کر کے عمرانی مفہوم میں نئی کہے جانے کی مستحق بن رہی ہے۔ تنقید کا وجود تقریباً ادب کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ ادب بغیر ایک سماجی اظہار کے ادب نہیں ہوتا اور جب سماج اس ادب کا جایزہ اپنی زندگی، اپنی خواہشوں اور اپنی ضرورتوں کی روشنی میں لیتا ہے اُسی وقت تنقید کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ اُردو ادب کی پیدایش اُس وقت ہوئی جب بہت سی زبانوں کے ادب موجود تھے، اچھے بُرے تنقیدی سانچے طیار تھے، خود وہ لوگ جنھوں نے اُردو ادب کو پروان چڑھایا بعض ترقی یافتہ زبانوں سے واقف تھے، شعر و ادب کے جانچنے کے جو معیار اُن زبانوں میں رائج تھے اُن سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ بہت سی مثنویوں اور نظموں میں شعر و سخن کے متعلق شعرا نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس وقت اُن کی قدر و قیمت کی بحث نہیں ہے ہر ادیب کے پاس اعلیٰ یا ادنیٰ تنقید کا کوئی نہ کوئی معیار ضرور ہوتا ہے جو تخلیق کے عمل کے ساتھ ساتھ جاری رہتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو اچھا تخلیقی عمل وجود میں نہیں آسکتا۔ اچھی تخلیقی قوت اچھی تنقیدی قوت کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے اس لئے ادبی تغیرات کے ساتھ تنقیدی نقطۂ نظر میں بھی تغیر ہوتا رہتا ہے اور اسی لئے اُس کا جایزہ لینا اور اُس کی راہ متعین کرنا کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔

اُردو تنقید سے متعلق ماضی قریب میں کلیم الدین احمد صاحب کی کتاب اُردو تنقید پر ایک نظر شایع ہوئی ہے جو ان سطروں سے شروع ہوتی ہے۔

> "اُردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے یہ تنقید کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر،
>
> صنم سنتے ہیں تیرے بھی کمر ہے　　　　کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے
>
> جغرافیہ وجود سارا　　　　ہر چند کہ ہم نے چھان مارا
>
> کی سیر بھی گرچہ بحر و بر کی　　　　لیکن نہ خبر ملی کمر کی،
>
> اس طرح نگاہِ جستجو جغرافیہ اُردو کی سیر کر کے مایوس واپس آتی ہے لیکن تنقید کے جلوہ سے مسرور نہیں ہوتی —"

[1] مجھے علم ہے کہ تنقید کی جگہ نقد یا انتقاد استعمال کرنا بہتر ہے لیکن میں تنقید کو اسی مفہوم میں اُردو زبان کا لفظ تصور کرتے ہوئے استعمال کرتا ہوں۔

ان سطروں میں طعن و طنز ہے، بے کیف ظرافت ہے، خیال آرائی ہے لیکن حقیقت نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک ایسی موہوم اور خیالی چیز کے لئے، جس کا وجود ہی نہیں، ڈھائی سو صفحوں کی ایک کتاب لکھ کر معشوق کی موہوم کمر کی طرح اُسے تلاش کرنا کہاں کی دانائی ہے! یہ صرف کلیم الدین احمد کی بات نہیں ہے ایسے تمام لوگ خیال پرست ہوتے ہیں اور ایسی چیز کی جستجو کرتے ہیں جس کی خود انھیں خبر نہیں ہوتی، یہ لوگ ماضی سے نالاں، حال سے بیزار اور مستقبل سے مایوس ہوتے ہیں کیونکہ وہ سارے ادبی سرمایہ کو کھینچ کر اپنی انفرادی پسندی کے اُس نقطہ پر لانا چاہتے ہیں جہاں سب کچھ اُن کی خواہش کے مطابق ہو ماضی میں یہ ممکن نہ تھا، حال پر اُن کا اثر نہیں اور مستقبل اُن کی رہنمائی کے بغیر شکل پذیر ہوگا اس لئے انھیں آسودگی کبھی نصیب نہیں ہوسکتی۔

اُردو میں تنقید کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن جس طرح شاعری بہت دنوں تک ایک بنے بنائے راستہ پر چلتی رہی اور معاشی و معاشرتی حالات نے زندگی کے پانی میں کوئی طوفان نہیں اُٹھایا اُسی طرح طرزِ تنقید پر بھی ایک جمود سا طاری رہا اور اُس کی حیثیت بالکل میکانکی ہو کر رہ گئی۔ قوتِ نقد کا اظہار انھیں مقررہ اُصولوں کے مطابق ہوتا تھا جو صدیوں سے چلے آتے تھے، جو اُردو شاعری یا ادب کی پیدائش سے پہلے بن چکے تھے اور چونکہ یہ اُصول خود اُردو ادب کی جانچ اور پرکھ کے لئے خاص طور پر پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ شاعری کے بنے بنائے سانچوں کی طرح مل گئے تھے اس لئے اُن میں طاقت اظہار کی کمی بھی تھی۔ یہ ایک علٰحدہ بحث ہے کہ اُردو میں ایک مدت تک اعلیٰ درجے کی تنقید کی کمی کیوں رہی اور کیوں جیسے ہی نئے معاشی معاشرتی نظام، نئے صنعتی دور کے اثرات ہندوستانی تمدن پر اثر انداز ہوئے تنقید نگاری نے بھی ایک نیا راستہ اختیار کرلیا؟ اب یہ بات کچھ نہ کچھ ہر شخص نے سمجھ لی ہے کہ ہمارے اقتصادی اور سماجی ادارے ہمارے شعور پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اگر ہم شعوری طور پر انھیں بدلنے کی کوشش نہ کریں تو اثر کا یہ عمل یک طرفہ ہوتا ہے یعنی ہم حالات کے غلام رہتے ہیں اور عملی جدوجہد میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے خیال کی دنیا میں معمولی بغاوتوں سے آگے نہیں بڑھتے۔ صدیوں تک زندگی نے اپنی ڈگر نہیں بدلی اور چند جدید ادبی عقاید کے ساتھ ادب و شاعری سے لذت اندوز ہوتی رہی۔ جاگیردارانہ نظام کے معاشی و معاشرتی اداروں کی فرسودگی اور یکسانیت کا عکس زندگی کے اُن تمام مظاہر پر پڑتا رہا جن سے تمدن کا اوپری ڈھانچہ طیار ہوتا ہے ہر دور کے اپنے کچھ عقیدے ہوتے ہیں جن کے معیار سے تہذیب کو پرکھا جاتا ہے۔ اُس دور کے گزرنے کے بعد یہ عقیدے روایت کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں جن کے بعض عناصر حالات کے بدلتے ہی ختم ہو جاتے ہیں، بعض زندہ رہتے ہیں۔ یہ عقیدے سیاسی، معاشرتی، ادبی زندگی کے ہر رخ کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں، ان سب میں اندرونی طور پر ایک فلسفیانہ ربط ہوتا ہے اور گہری نظر سے تجزیہ کرنے والے اُس بنیادی انداز فکر کی تلاش کر سکتے ہیں جو ہر عقیدہ کے ساتھ کام کر رہا ہے اور اگر اُسے عمرانیات کے تحلیلی نقطۂ نظر کی مدد سے دیکھیں تو یہی معلوم ہوگا کہ معاشی و معاشرتی ادارے جن طبقات میں انسانوں کو تقسیم کرتے ہیں انھیں کے مفاد اور قیام کی آرائش کے سلسلہ میں جو فلسفہ کام آسکتا ہے وہی رائج ہوتا ہے۔ شعر و ادب سے دلچسپی لینے والے طبقہ کو زندگی کی جو قدریں عزیز ہوتی ہیں اور جس طرح عزیز ہوتی ہیں تنقید انھیں کو اہمیت دیتی ہے، وقت گزر جانے پر وہ قدریں بھی اپنی اہمیت کھو دیتی ہیں اور تنقید کے وہ اُصول بھی جو اُن کی پوشیدہ لطافتوں کو اُجاگر کرتے ہیں۔ چنانچہ اگر اسی نقطۂ نظر سے اُردو کی تنقید کو دیکھا جائے تو بعض باتیں بہت واضح طور پر سامنے آئیں گی اسی سے اس بات کا پتہ بھی

چلے گا کہ تنقید نگاری کے اچھے نمونے کیوں مفقود ہیں۔

ایک ایسے سماجی نظام میں جو ایک روبہ انحطاط فرسودہ معاشی نظام سے وابستہ ہو بڑھنے اور نئی خصوصیتیں پیدا کرنے کی طاقت نہیں ہوتی، اُسے سکون اور خاموشی کی جستجو ہوتی ہے اور ایک ایسا فلسفہ وجود میں آجاتا ہے جو معنی کے مقابلہ میں صورت کو، مواد کے مقابلہ میں ہیئت کو زیادہ اہمیت دیتا ہے، وہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسایل میں خوشی کے پہلو دیکھ کر مبالغہ، تصنع اور آرائش پر جان دیتا ہے، سطحی باتوں کو لطائف سے آراستہ کرکے لذّت اندوز ہوتا ہے اپنے مادّی انحطاط اور زوال کو روحانیت اور تصوف کے تسکین بخش فلسفہ میں غرق کرکے اس دنیا کی حقیقت کا منکر ہو جاتا ہے۔ اور اخلاق کے ایک ایسے کمزور نظام کی اشاعت میں منہمک رہتا ہے جو ایک زمانہ میں سماج کے عناصر کو متحرک رکھنے کی کافی طاقت رکھتا تھا لیکن اب وہ طاقت باقی نہیں رہی۔ یہ سب کچھ معاشی نظام کے فرسودہ اور جامد ہو جانے کی وجہ سے ہوتا ہے، طبقات ترقی کے راستوں سے ناواقف ہوتے ہیں اور جب تک کوئی ایسی آویزش پیدا نہ ہو جائے جو برسر اقتدار طبقہ کو اپنی طاقت کے قایم رکھنے کی جدوجہد کی طرف مایل کرے اور کچلے ہوئے طبقہ کو اُبھرنے کی ترغیب دلائے حالات اس طرح نہیں بدلتے کہ شعور میں ان تغیرات کا اظہار ہو۔ ایسے نظام میں شعر و ادب، تخلیق و تنقید کے مواد اور اسلوب کا سمجھنا کچھ ایسا مشکل نہیں رہ جاتا۔

شعر و ادب نے رہنمائی کے فرایض ترک کرکے تفریح کی صورت اختیار کرلی تھی اور کشمکش سے خالی زندگی میں شاعری زیادہ سے زیادہ زندگی کی مصور بن کر رہ گئی تھی۔ اُس وقت کی پامال اور پسپا داخلیت اور سطحی خارجیت کے انکشاف میں اُس کا سارا زور ختم ہو رہا تھا، جدوجہد کی روح عملی زندگی میں مفقود تھی اور شاعری انسانوں کو اُس سے اور زیادہ دور رہنے کی تلقین کرتی رہتی تھی اس لئے شاعر غم و غصہ سے نجات دلانے والے پیغمبر کی حیثیت سے قابل پرستش تھا، وہ ملہم غیب تھا اور تلمیذ رحمانی کے درجہ پر فایز، اس لئے اُس کے خیالات میں عام طور پر غلطی نکالنا آسان نہ تھا۔ جس کے قلب پر الہام و وحی کا پرتو پڑ رہا ہو، جس کی تخئیل زمین سے سروکار ہی نہ رکھتی ہو، ہر دفعہ نگاہ اُٹھاکر آسمان سے تارے توڑ لاتی ہو، زندگی کی مادّی کثافتوں کا کم سے کم اظہار کرتی ہو، اُس کے خیالات پر نقد و تبصرہ کی گنجایش کہاں، پھر جس دور معاشرت کا تذکرہ ہے اُس میں معنی اور مواد نے اسلوب بیان اور رنگینی ادا کے سامنے ہتھیار ڈال دئے تھے۔ زندگی سست رفتار موجوں کے ساتھ بہی جا رہی تھی اور ایک ایسی مہلک آسودگی کا دور تھا جس کی زوال آمادگی علم و عمل کے ہر شعبے سے نمایاں تھی۔ تنقید سے دلچسپی لینے والوں کے لئے کم و بیش خیالات کی دنیا پر پہرے تھے۔ ایک بڑی بات یہ بھی تھی کہ جہاں تک بنیادی تصور حیات یا خیالات کی دنیا کا تعلق ہے بہت کچھ متعین اور معلوم تھا، اُسی مخصوص دائرہ کے اندر "نئے رخ" پیدا کئے جاسکتے تھے۔ خیالات نئے اسلوب سے "باندھے" جاسکتے تھے۔ اس لئے نقاد کے لئے لے دے کر اسلوب اور طرز ادا سے دلچسپی لینے کا سوال باقی رہ جاتا تھا۔ اس دور کے شعراء اور تنقید نگار دونوں عروض اور صنایع و بدایع کے نازک ترین اور دقیق ترین پہلوؤں سے اُلجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہمیں یہ بات پسند نہ آئے لیکن جب مواد کو توڑ مروڑ کر نئے سانچے میں ڈھالنے ہی پر اکتفا کرنے کا زمانہ ہو اُس وقت نیا مواد پیدا کرنا آسان نہیں رہ جاتا، نیا مواد تخئیل کی بلند پروازیاں نہیں پیدا کرتیں وہ معاشی و معاشرتی روابط پیدا کرتے ہیں جن سے کوئی فن کار یا شاعر گزرتا ہے یا جن کا احساس کرتا ہے۔ نظیر اکبرآبادی اور اس دور کے دوسرے شعراء میں یہی فرق ہے بہرحال فن کار اور نقاد دونوں اسلوب اور طرز ادا کے دیوانے تھے، جہاں تک تخئیل کا تعلق ہے اُس پر کم سے کم زور دیا جاتا تھا اور

امیدوں کی شام - وہ مرادوں کی رات - وہ حوصلے اور ولولے - وہ اُمنگیں، وہ ترنگیں، وہ لہریں مارتا جذبات کا طوفان
رات اپنا دم توڑ رہی تھی کہ چار بجے قریب کے محلے سے مرغ نے اذان دی - اللہ اکبر - بے شک وہ بزرگ و برتر ہے - اُسی نے
ب کو پیدا کیا ہے اور وہی سب کو اپنے پاس بلائے گا - عین اُسوقت - اُس قیامت خیز رات کے اختتام پر اُسی بزرگ و برتر
رات کے فرشتے جس کی عبودیت و بزرگی کا ہر چہار طرف مسجد و مندر سے شور بلند ہو رہا تھا - وہ ناہید - خوبصورت ناہید - ناامید
روم ناہید کو اس موہومی دنیا - اس بے ثبات منزل سے اُٹھا کر لے گئے -

---

ناہید کی داستان بڑی غمگین و دلخراش ہے - میرے اعراف میں داخل ہونے سے پہلے وہ عذاب کی سختیوں کو جھیل
ہی تھی - یوں تو وہاں کا ہر متنفس اپنے کئے کی سزا بھگت رہا تھا - ہر طرف کرب و آہ، چیخ و پکار، نالہ و شیون - دل کو
ہلا دینے اور برمادینے والی درد میں ڈوبی آوازیں، ہر شخص اپنے حال میں پریشان، کوئی کسی کا پرسان حال نہیں -
نفسی نفسی - کس کو مدد کے لئے بلائیں - کسے اعانت کے لئے آواز دیں - اِن مناظر کو دیکھ کر یہ پہلے پہل معلوم ہوا کہ فرشتے بھی
تنے بیرحم ہوتے ہیں - میرے ہاتھوں کو آگ کی زنجیروں سے باندھکر اور گلے میں ایک خاردار طوق ڈالکر ایک کوٹھری میں
ھکیل دیا گیا، یہ میرے ایک یادگار واقعہ کی سزا تھی -

اُسوقت جبکہ مارلیم اپنا صور پھونکتا تھا اور ساری روحوں کو تھوڑی دیر کے لئے امن و سکون ہوتا تھا پورے اعراف
ں صرف ایک روح تھی جس کے عذاب و اذیت میں کچھ کمی نہ ہوتی تھی - وہ تھی ناہید - اُس کی اذیت و تکلیف ہی کچھ
ور تھی - جس روز سے مجھے اُس کی داستانِ غم معلوم ہوئی میں اپنے غم و تکلیف کو بالکل بھول گیا -

مجھے یاد ہے کہ میں دن دن بھر اُس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتا تھا - وہ جوان و خوبصورت ناہید - بیچاری
ر کوئی رحم کھانے والا نہیں - کوئی ایسا نہیں جو اُسے تسکین دے - اُس کے غم میں شریک ہو - یہ کیسے فرشتے ہیں جن میں رحم
اپاس اور مروت کا نام نہیں - اُس کی ایک - اور محض ایک خواہش تھی - ایک تمنا - کاش میں اس قابل ہوتا کہ اُسکی مصیبت
ں اُس کا شریک ہو سکتا اُس کی تھوڑی سی خدمت کر سکتا اور اُس کے نام دُکھ درد کو خود برداشت کر کے اُس کو ہمیشہ کے
لئے آزاد کرا دیتا - اُف ! وہ کمسن اور خوبصورت لڑکی - میرے سینہ میں ایک نئی آگ بھڑک رہی تھی - میں اعراف میں ایک
ئی روح محسوس کر رہا تھا - میں تھا اور وہ خوبصورت ناہید - اُس کا تمتما ہوا کندنی چہرہ - کمھلائی ہوئی گلاب کی پنکھڑیوں
سے لب - نیم خواب آنکھوں میں مایوسی اور حسرت کے ڈھلکتے ہوئے آنسو - سیاہ سیاہ اُجڑے ہوئے پریشان بال - پتلی پتلی
ازک انگلیوں میں لرزش - حسین و سڈول جسم میں کپکپاہٹ - آنکھیں ایک سمت لگی ہوئیں - صرف ایک تصور - ایک خیال -

مارلیم کا صور ایک زمانے سے بجتا چلا آ رہا ہے اور معلوم نہیں کب تک بجتا رہے گا یہ پہلا روز تھا کہ جب اعراف میں
ایک بدنصیب و بےچین روح کو اُس سے کسی طرح کی تسکین نہیں ہوئی یہ ایک معمولی بات نہ تھی - فرشتے اپنی ناکامی پر
چڑھ جاتے ہیں - صدہا سال گزر گئے - مارلیم کو تعجب تھا کہ اُس کا ہمہ گیر راگ کیوں ایک ادنیٰ روح کے واسطے بےاثر ثابت
ہو رہا تھا - اس کے بعد پیہم کئی بار مارلیم کے ساتھ اور بہت سے فرشتے اپنا اپنا قرنا لیکر آئے - سب نے ملکر سُریلے راگ
بجائے - گنہگار روحیں آرام و سکون محسوس کرنے لگیں، مگر ناہید کی بےچین روح جلتی تھی، مضطرب و بےقرار تھی،

سب فرشتے ناامید واپس چلے گئے۔

ایک رات جب عذاب کے فرشتے ذرا یونہی سا اونگ گئے تھے اور مجھے یک گونہ فرصت سی تھی، میں نے دبی آواز سے ناہید کو پکارا۔ اُس نے شاید نہ سُنا یا مصلحتاً جواب نہ دیا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح اُس کے غم کو کم کر سکوں۔ یہ ایک اچھا موقع تھا اور غالباً دوسری آواز میں وہ میری طرف پلٹ کر دیکھتی کہ پاس سے کچھ آہٹ سی معلوم ہوئی کچھ دیر تک لوگوں کے پیروں کی آواز سُنائی دیتی رہی۔ یکایک پہلو کے راستے سے کچھ لوگ نمودار ہوئے۔ چار تھے یا پانچ قریب قریب سب ضعیف۔ ہاتھوں میں زمرد کی عصائیں، رنگین پوشاک زیب تن کئے کوئی سبز، کوئی سُرخ۔ سب کی داڑھیاں سفید۔ چہروں پر متانت و سنجیدگی کا نور۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ لوگ جنت سے اعراف کی سیر کو نکلے ہیں۔ مگر وہ چلتے چلتے ناہید کے حجرے کے پاس ٹھہر گئے۔ اُن میں سے ایک بزرگ آگے بڑھے۔ میں سرک کر اپنے کونے میں پلٹ آیا۔

یہ میری رہائی کا دن تھا۔ جو سچ پوچھئے تو قید و بند کی یہ طویل مدت میرے لئے چشم زدن میں کٹ گئی۔ میرے جسم کے چھالے اور آنکھوں میں چبھتی ہوئی سوئیوں کی روحانی اذیت خود بخود کم معلوم ہونے لگی۔ میں ابھی عالمِ خواب میں تھا کہ میری ناک میں ایک ایسی خوشبو آئی جس سے میرا مشام اُسوقت تک بالکل ناآشنا تھا۔ نیکی کے فرشتے مجھے جنت میں لیجانے کو آئے تھے۔ مجھے اپنی رہائی پر خوش ہونا چاہئے تھا مگر دل نامعلوم طریقے پر آپ ہی سے آپ بیٹھا جا رہا تھا جوں جوں وہ خوشبو قریب سے قریب تر ہوتی جاتی تھی میری گھبراہٹ اور پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ پہلا دن تھا کہ میرا دل چاہتا تھا کہ ہمیشہ کے لئے اس عذاب کی جگہ مقید رہوں۔ مجھے عذاب و اذیت سے نجات حاصل ہو جانے کے خیال میں بھی کوئی دلچسپی باقی نہ رہ گئی تھی۔ میرا جی بار بار چاہتا تھا کہ میں فرشتوں سے کہدوں کہ میں جہاں ہوں وہیں رہنے دیا جائے۔ میں اپنی خوشی سے اجازت دیتا ہوں کہ میرے عذاب کی مدت بڑھا دیجائے مگر یہ وہ مقام ہے جہاں فرشتوں کی حکومت ہے خدا کے قانون جاری ہیں انسان اپنی خوشی سے کچھ نہیں کر سکتا۔

دو فرشتے آگے، دو پیچھے، بیچ میں میں۔ اس صورت سے میں روحوں کی وادی کو پار کر رہا تھا۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی دور دور ہرے بھرے کھیت اور لہلہاتے ہوئے مرغزار تھے۔ مختلف جگہوں پر مختلف رنگوں کے پھول۔ کہیں سُرخ۔ کہیں کاہی۔ کسی جا زرد اور کسی مقام پر تپیئی۔ ایک جگہ اودے اودے گلدستے تو دوسری جگہ پر نقرئی روشیں۔ بیک نگاہ دیکھنے میں قوس قزح کا لطف آتا تھا۔ سامنے اونچی نیچی، چھوٹی بڑی پہاڑیاں، تمام کی تمام بنفشئی رنگ میں نہائی ہوئی۔ اُن کے دامن میں ایک لمبا چوڑا تالاب جس میں خون موجیں مار رہا تھا۔ کنول کی طرح صاف و شفاف سفید گلاب کے پھول تیر رہے تھے۔ مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ متحیر کیا وہ اُس تالاب کا طوفانی مد و جزر تھا۔ لہریں اُٹھ اُٹھ کر پہاڑیوں کے دامن دار بنا رہی تھیں۔ مجھے تاب نہ ہو سکی۔ میں نے نیکی کے فرشتوں سے پوچھا یہ کیا ہے اور اس مقام کا کیا نام ہے معلوم ہوا کہ وادیٔ حیات ہے اور یہ وہ تالاب ہے جس میں بے گناہ مقتولین کا خون ہے۔ دنیا میں ظالم لوگ دولت و لالچ بغض حسد جھوٹی محبت اور رقابت میں ایک دوسرے کو قتل کر ڈالتے ہیں اس تالاب میں اُن بے گناہوں کا خون جمع ہوتا ہے۔ یہ خون [illegible] ایک قطرہ [illegible] میں ایک ہزار [illegible] زیادہ ہے جب دوسری دنیا کی تخلیق ہو گی اور آسمان و زمین

پھر سے قایم کئے جائیں گے اس خون کو خدائے ایزدی ہاتھوں میں مل کر آسمانوں کی سمت اشارہ کرے گا۔ ساتوں آسمان ستاروں سے جگمگا اُٹھیں گے۔ جب میں نے دریافت کیا کہ یہ محض رگوں کا خون ہے یا آنکھوں سے نکلے ہوئے آنسو بھی۔ تو مجھے کوئی جواب نہ دیا گیا۔

ہم مختلف منزلوں سے گزرتے ہوئے "باب الہوا" تک پہونچے زمردی پھاٹک آپ ہی سے آپ کھل گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی میرے نگہبان فرشتوں نے مجھ کو قصر بلند میں پہونچا دیا۔ یہ فردوس میں میرے رہنے کی جگہ تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ فردوس میں داخلے کے چار پھاٹک ہیں۔ اعراف سے آزاد کی ہوئی روحیں "باب الہوا" سے اندر داخل ہوتی ہیں۔ ایک دروازہ جہنم کی سمت ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جہنم سے بھی روحیں آزاد ہوتی ہیں وہ اُس دروازہ سے اندر آتی ہیں۔

یہ دربار ایزدی میں ملاقات کی رات تھی۔ مقربین بارگاہ مؤدبانہ ہاتھوں کو جوڑے گردنوں کو خم کئے کھڑے تھے۔ نور کی بارش ہو رہی تھی۔ انعام و اکرام کی تقسیم جاری تھی۔ مارلیم اور اُس کے ساتھ کے فرشتے عود و قرنا بجا کر سجدۂ ایزدی میں گر پڑے۔ ندائے ہاتف آئی "مانگ اے اچھے فرشتے جو مانگنا چاہتا ہے، قدرت نے تیرے راگ کو بہت پسند کیا"

مارلیم (زمین سے بلند ہوتے ہوئے) "جہانوں کے مالک، عرش تا فرش تیرا ہی فیض جاری ہے۔ ایک حقیر درخواست ہے، اعراف کی ایک روح سے ملنے کی اجازت حاصل ہو تاکہ میں اُس کے دکھ درد میں کچھ کمی کر سکوں"۔

—— "جا قدرت کی اجازت ہے" مارلیم ایک ہی پرواز میں برزخ کی منزلوں کو طے کرتا ہوا اُس مصیبت زدہ لڑکی کے پاس پہونچ گیا" اے لڑکی! تیری جو حاجت ہو بیان کر۔ آج فیضانِ الٰہی کا دن ہے۔ خداوند نعمت ہر روح کی حاجت کو بر لائے گا۔ تیرا دُکھ درد میں سنوں گا۔ آخر وہ کونسی اذیت ہے جس کو میرا راگ بھی دور نہیں کر سکتا؟"

—— "اچھے فرشتے! میں ایک مصیبت زدہ غم کی ماری ہوں۔ جس کا گناہ محبت ہے۔ میری صرف ایک تمنا ہے کہ میں چند ساعتوں کے لئے زمین پر جا کر اپنے پیارے جمال کو تسکین دے سکوں کہ وہ میرے بغیر تڑپتا ہوگا۔ میں اپنی حالت کو اُس سے چھپاؤں گی۔ وہ مجھے نہ پا کر لوٹ گیا ہوگا۔ اُسے میرا انتظار ہوگا" مارلیم نے مڑ کر آستین سے آنسو پونچھے کیونکہ فرشتے شاذ و نادر ہی روتے ہیں۔ "اے کم عقل لڑکی! دنیا کے لوگ دوستوں کے مرنے کے بعد اُن کو بھول جاتے ہیں۔ محبت اور سچی محبت کا وہاں فقدان ہے۔ تو کیسے سمجھتی ہے کہ تیرا محبوب تیرے بغیر مضطرب و پریشان ہوگا؟"

—— "اے فرشتے اس کا مجھے یقین ہے بالکل اُسی طرح جیسے میں اُس کے خیال میں یہاں تڑپ رہی ہوں"

مارلیم: "اے بھولی لڑکی۔ فردوس کی مقدس روحیں تیرے غم سے متاثر ہیں۔ اُن کی تسکین و تشفی ہی کیا تیرے لئے کافی نہیں۔ اگر تو جنت میں جانے کو کہتی تو میں خدائے ایزدی سے سفارش کر کے اُس مقام پر پہونچا دیتا جہاں وہ بلند و مقتدر ہستیاں آباد ہیں جن پر خدائے ایزدی خود ناز فرماتا ہے۔ لیکن تو ایک ایسی چیز کا طالب ہے جس میں خود تیرا ہی نقصان ہے۔ اعراف کی روحیں پلٹ کر زمین کی طرف کبھی نہیں جاتیں"۔

ناہید: "مجھے جنت کی ہوس نہیں۔ تو اگر مجھے جنت میں دیکھنا چاہتا ہے تو ایک گھنٹہ کے واسطے دنیا میں پہونچا دے جنت کی مقدس روحیں تو میرے پاس آتی ہوں رہتی ہیں لیکن میرا اُن سے کیا واسطہ۔ کاش میرے انتظار کی کوئی حد

ہوتی۔ کاش میں دنیا میں پلٹ کر ایک بار پھر جا سکتی!"

—— "تجھے اُس ایک گھنٹہ کی قیمت معلوم ہے؟ عذاب کے ایک ہزار سال!"

—— "صرف ایک ہزار سال؟ اچھے فرشتے مجھے منظور ہے"

دنیا میں آفتاب قریب طلوع تھا۔ سڑکوں کی دو رویہ روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ ادھ کٹا چاند نقاب اوڑھکر اُفق میں روپوش ہو چکا تھا۔ جمال کے خوابگاہ کا کمرا بالکل سونا پڑا تھا۔ ایک صاف و شفاف بستر جس پر سلوٹیں پڑی تھیں اِدھر اُدھر سے سمٹا ہوا اور جا بجا ملگجے سے پھول۔ باہر سے بھرے ہوئے دروازے کی درازوں سے آنے والی ہوائیں دیوار پر ٹنگی ہوئی گھڑی کے پاس والی تصویر کو زور زور سے ہلا رہی تھی۔ ایک خوبصورت وسنہرا چوکھٹا جس میں کسی حسین دوشیزہ کی تصویر مزین تھی۔ عین اُس وقت جبکہ جمال نے اندر آنے کو دروازہ کھولا تو اُس نے یکایک ایک مہیب تڑاقے کی آواز سنی۔ آواز کے ساتھ وہ خوبصورت تصویر اور وہ دن و رات چلنے والی گھڑی نیچے کے پکے فرش پر گر کر چکنا چور ہو گئیں جمال نے ایک گہرا تیز دھواں اور آگ کا ایک بھڑکتا ہوا شعلہ دروازے کے باہر جاتے دیکھا۔

—— "اے مالک فرشتوں کو حکم دے کہ وہ اپنا عذاب نازل کریں۔ اتنا سخت جتنا کہ اُن سے ہو سکے، وہ میرے واسطے اُس اذیت و تکلیف سے کہیں کم ہے جو میں نے زمین پر ایک گھنٹہ میں برداشت کی اور جس کا تصور ہی ایک مستقل عذاب ہے"

مجھے وہ داستان غم اب بھی یاد ہے۔ ایک ہزار سال عذاب کے! کاش میرے اوپر بھی فرشتوں کو رحم آتا کہ میں اپنی جگہ ناہید سے بدل لیتا۔ اس لئے کہ میں اس سے زیادہ گناہگار ہوں۔ کیا وہ وقت بھلایا جا سکتا ہے کہ جب میں جنت کی طرف قہراً و جبراً لایا جا رہا تھا اُس نے مجھے پہلی بار دیکھا۔ اُس کی نگاہوں میں پہلے سے زیادہ فتح و کامرانی کا نور ٹپک رہا تھا میرا کتنا جی چاہتا ہے کہ میں اُڑ کر اُس کے پاس پہونچ جاؤں لیکن حیف کہ میں فردوس میں ہوں۔

آخر یہ کیسی جنت ہے جس میں کوئی اپنے ذاتی خواہش دارادے سے کچھ کر ہی نہیں سکتا۔

ش۔ م۔ مائیلی۔ بی۔ اے۔ لکھنؤ

بغاوت ہاں بجز انسان کے سارے زمانے سے بغاوت درد سہنے سے بغاوت غم اُٹھانے سے

دراس انقلاب کی دنیا میں ہمارے باغی نوجوانوں کو جن مشکلات کا سامنا کرنا ہے اس کو مجاز "اندھیری رات کا مسافر" میں بیان کرکے ہمیں استقلال کا سبق دیتا ہے ۔

ان نظموں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے شعرا اپنا نظریہ خود نہیں سمجھے وہ انقلاب کے اصل وجوہ، انقلابی تحریکوں کی ابتدا و ترقی کے اسباب، واقعات کے باہمی تعلق اور سوسائٹی کے دن بدن تبدیلیوں کے وجوہ سے ناواقف نظر آتے ہیں۔ وہ انقلاب پر فریفتہ ہیں۔ جوش و خروش اور انقلاب کے نعروں سے ان کا کلام گونج رہا ہے لیکن انقلاب کیا ہے۔ نظام جدید سے کیا مطلب ہے۔ اس سے اُنھیں مطلب نہیں۔ اُنھیں تو غارت گری سے مطلب ہے ۔

انقلاب دراصل ان اُصولوں، معیاروں اور قدروں کی تبدیلی کا نام ہے جو تاریخی حیثیت سے ضروری ہیں۔ موجودہ حالات کے تحت ہم انقلاب اُس تبدیلی کو کہیں گے جو سرمایہ داری کا خاتمہ کردے اور جو ذرایع پیداوار کو افراد کی ملکیت سے نکال کر سماج کے مشترکہ ملکیت میں لے آئے، اسی طرح انقلابی ادب وہ ادب ہوا جو موجودہ نظام کے نقائص کی طرف ہماری توجہ دلائے اس کی برائیوں کو بے نقاب کرے اور انسانی زندگی کے لئے ایک نئے اور بہتر معاشرتی ڈھانچے کی اہمیت جتلائے اور موجودہ نظام کی بنیادوں کو ڈھانے کی تخریبی عمل کے ساتھ ہی ساتھ آنے والے نظام کی جھلکیاں دکھا کر تعمیری خدمت بھی انجام دیتا چلے ۔

اُردو کی ساری انقلابی شاعری پر اس سرے سے اُس سرے تک نظر دوڑا جائیے "انقلاب زندہ باد" کے نعروں اور "سامراج شاہی کا ناس ہو" قسم کی صداؤں کے علاوہ اس میں کچھ بھی نہ ملے گا۔ شاعری خطبوں، نعروں اور تقریروں کا مجموعہ نہیں ہوا کرتی ادب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمارے جذبۂ حسن کو متحرک، جذبات کو متاثر، اور دماغ کے بجائے دل کو مخاطب کرے ۔ جس میں مقصد کو قاری کے اوپر ڈھیلے کی طرح نہ مارا جائے بلکہ غیر محسوس طور پر اس کے ذہن و شعور پر اثر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہو۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی زبان و بیان کی لطافتوں اور ترکیب و اسلوب کی پابندیوں کا لحاظ بھی رکھا گیا ہو۔ ہمارے شعراء انقلاب کی تباہ کاریوں اور اس کے تخریبی پہلو پر اس قدر زور دیتے ہیں کہ ہم اسکو سمجھ کر اس سے ہمدردی کرنے کے بجائے خود ہی اس سے خوف کھانے لگتے ہیں۔ قتل، خون، غارتگری، بغاوت اور موت کے ایک ایسے طوفان کے علاوہ اور کچھ نہیں دکھائی دیتا جو اس زمانہ کی ساری بھلی اور بری چیزوں کو جاہل اور غضبناک مزدوروں کے ہاتھوں فنا کے گھاٹ اُتار دے گا اور جس کی بلائی ہوئی آندھیاں اور جہنم کی ہوائیں اس سارے کرۂ ہی کو بھسم کر دم لیں گی ۔

ظاہر ہے کہ ہر وہ امن پسند جو بربادی اور غارتگری کے اس حامی ادب کا مطالعہ کرے گا کبھی اس کی حمایت کرنے پر طیار نہیں ہو سکتا۔ اس کے برخلاف وہ اس طرح کے کسی اُٹھتے ہوئے ہنگامے کو دبانے ہی کی کوشش کرے گا لیکن یہ بات کچھ یوں دکھائی دیتی ہے کہ یہ شاعر اگرچہ انقلابی ہیں مگر ہیں تو اُردو کے شاعر، اور اُردو کی ساری شاعری مبالغے سے اس بری طرح چمٹی ہوئی ہے کہ خیال ہونے لگا ہے کہ یہ اس کے خمیر کا جزو تو نہیں۔ ہمارے شاعر جب عاشق بنے تو فرہاد و مجنوں سے بڑھ گئے بیچارے خضر کو اگلے زمانے والا کہکر راہیں بتانے لگے ۔ لاغر ہوئے تو اتنا کہ نہیں دیکھنے کے لئے

عینک کی ضرورت ہو اور کہیں بستر کی شکن سمجھے جائیں۔ رشک کرنے پر آئے تو اپنی قوتِ دیدار سے کیا خود اپنے سے رشک کرنے لگے۔ مرنے پر آمادہ ہوئے تو خنجر کی کند دھار سے بقرعید کے بکرے کی طرح ذبح ہونے میں لذت محسوس کرنے لگے۔ اور اب جو ہمارے شاعر بغاوت پر آمادہ ہوئے تو خون، سفاکی، گرج، طوفان، بربادی، قتال، کا ایسا بازار گرم کر دیا کہ دنیا کے کسی متنفس کو اس سے بچانا کجا اس کرۂ ناپاک ہی کو بھسم کرنے پر طیار ہو گئے۔ بنتے تو تھے بڑے جدت پسند اور نئی روشنی والے لیکن مبالغہ اور مثالیت سے اپنا دامن نہ بچا سکے اور آخر بچپن بھی تو کیسے یہ تو ہماری تہذیب، ہماری فطرت، بلکہ زندگی کا جزو بن چکا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ادب ایک جماعتی حربہ ہے جس کا مقصد آج کل اجتماعی زندگی کی توسیع و ترقی اور اس کی تہذیب و تکمیل میں مدد دینا ہے۔ آج ادب سے جو مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اسے آلۂ نشر و اشاعت ہونا چاہئے وہ ایک حد تک درست ہے لیکن ادب ان معنوں میں آلۂ نشر و اشاعت نہیں جن معنوں میں اخبار ہوتے ہیں یا مارکس کا اشتراکی اعلان (Communist Manifesto) تھا اور نہ ہر آلۂ نشر و اشاعت ہی ادب ہوتا ہے اگر ایسا ہوتا تو ادبیات میں سب سے پہلے اخباروں کو جگہ دیجاتی اور ان سیاسی تقریروں کو ادبی شہ پاروں میں شمار کیا جاتا جو کسی خاص جماعت یا کسی خاص فرقہ کی حمایت اور تائید میں آئے دن ہوا کرتی ہیں۔ ادب ڈھنڈھورے کی چیز نہیں ہوتی اور ادیب کوئی ڈھنڈورچی ہوتا ہے نہ مبلغ، لیکن اس اعتبار سے ادب یقیناً ایک طرح کی تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ ہے کہ اس کے اندر ایک چھپا ہوا اور غیر محسوس غایتی میلان ہوتا ہے۔ ہم اگرچہ خالص جمالیت (Aesthetes) یا ادب برائے ادب کے قایل نہیں۔ یہ دنیائے اسباب ہے۔ یہاں کوئی چیز اپنا سبب آپ نہیں ہو سکتی، ادب کا کام زندگی کی نمایندگی کرنا اور اس کو فروغ دینا ہے لیکن اس گروہ کی ہاں میں ہاں بھی نہیں ملا سکتے جو ادب کو سیاسیات کی طرح صرف عصری حالات کا آئینہ تصور کرلے۔

ہمارے شاعر عام طور سے پہلے ہمارے سماج کے کسی داغدار پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن قبل اس کے کہ ہم اس سے اثر لیکر خود کسی نتیجہ پر پہونچیں یکبارگی انقلاب زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگا کے کبھی تو ختم کر دیتے ہیں اور کبھی اپنی جرأت کے مطابق سرمایہ دار حکومت اور خدا پر حملے کرکے اپنے اشتراکی ہونے کا ثبوت دیتے ہیں جس میں اپنے کو خواہ مخواہ اہمیت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مانا کہ تعلی اُردو شاعری میں کوئی نئی چیز نہیں لیکن پھر بھی یہ زبردستی کا خواہ مخواہ کا ڈھونگ اور پھر خصوصاً اپنے کو اشتراکی کہنے والے شاعروں۔ کے منہ سے جو ادب کو "ہم تم اور ہیں" کے قبضہ سے نکال کر اسے اجتماعی اور جمہوری بنانے کا دعویٰ کرتے ہیں اور بزعم خود روس کی تقلید کرتے ہیں جہاں خود سنہ ۱۹۳۲ء تک ایک محکمۂ احتساب قایم تھا جو ایسی کتاب یا تقریر کو شایع ہونے سے روک دیتا تھا جس میں انفرادی عنصر ذرا نمایاں ہو۔ اب ضرورت ہے کہ ہمارے شعراء ادب کے صحیح مفہوم کو سمجھیں۔ انقلاب کے وجوہ اسباب اور علل پر غور کریں۔ زبان و بیان کی لطافتوں کو غیر ضروری نہ قرار دیں اور فطرت انسانی و معاشرتی حالات کے غایر مطالعے و مشاہدے کے بعد لکھنے کی کوشش کریں۔

جمہور کی طرف موجودہ ادب کا رجحان اس نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے جس کی گرمی اور روشنی میں دنیا کے عظیم ترین ادب کی مثالوں کی نشو و نما کے امکانات پوشیدہ ہیں۔

سید مسیح الزماں جائسی ایم۔ اے

باب الاستفسار

کبیر تاریخی نقطۂ نظر سے

(جناب عبداللہ صاحب ۔ بردوان)

کبیر کی پیدایش کے متعلق عجیب و غریب روایتیں پائی جاتی ہیں مہربانی فرماکر تاریخی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالئے

(نگار) کبیر کی پیدایش سے لیکر وفات تک، اس کے سوانح جو عام طور پر مشہور ہیں، ان میں اعتمادی روایات کا حسن ظن اور مبالغہ اس قدر شامل ہے کہ ایک انسان کی حیثیت سے اس کے صحیح حالات کا علم اُن سے حاصل ہونا بہت دشوار ہے۔

کہا جاتا ہے کہ کبیر سنہ ۱۳۹۸ء میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۵۱۸ء میں وفات پائی، گویا اس حساب سے انھوں نے ۱۲۰ سال کی عمر پائی۔ ان کا سن وفات تو غالباً درست ہے، لیکن سن ولادت کو ماضی کی طرف زیادہ کھینچکر بتایا جاتا ہے اور غالباً اس لئے کہ انھیں رامانند کا ہمعصر ثابت کیا جائے (جن کی وفات سنہ ۱۴۱۰ء میں ہوئی اور اسوقت کبیر کی عمر دس بارہ سال کی رہی ہوگی)

رامانند سنہ ۱۴۰۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور سنہ ۱۴۳۰ء سے سنہ ۱۴۴۰ء تک ایک مذہبی راہنما و مصلح کی حیثیت سے ان کی شہرت قایم رہی، اس لئے کبیر کی ولادت سنہ ۱۴۴۰ء کے لگ بھگ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کیونکہ اسوقت کبیر کی عمر ۱۵ سال کی ہوگی اور وہ اسی زمانہ میں رامانند کے چیلے بنے ہوں گے۔

نانک سنہ ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۵۳۸ء میں ان کا انتقال ہوا اور اس حساب سے وہ کبیر سے ۲۹ سال چھوٹے ثابت ہوتے ہیں جو واقعات و حالات کے بالکل مطابق ہے۔

سکندر لودی کی حکومت سنہ ۱۴۸۹ء سے سنہ ۱۵۱۲ء تک رہی اور سنہ ۱۴۹۵ء میں وہ جونپور آیا۔ ان تاریخوں سے بھی کبیر کا سن ولادت سنہ ۱۴۴۰ء کے قریب قریب زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ جائے ولادت کے متعلق روایت یہ ہے کہ وہ بنارس میں پیدا ہوئے، حالانکہ بنارس گزیٹیر سے معلوم ہوتا ہے کہ موضع بلہرا ضلع اعظم گڑھ میں ان کی ولادت ہوئی۔

تمام کبیر پنتھی جماعت اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ کبیر کی پرورش ایک مسلمان شخص نورو یا نور علی کے گھر میں ہوئی ہوئی جس کی بیوی کا نام نیما یا نعیمہ تھا، لیکن وہ ان کا حقیقی بیٹا تسلیم نہیں کرتے، کیونکہ ایسا ماننے کے بعد ان کی ولادت ایک مسلمان گھرانے کی تسلیم کرنا پڑے گی اور وہ بھی ایک جولاہا گھرانا جو عام طور پر ادنی درجہ کا سمجھا جاتا

ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ کبیر کی ماں ایک برہمن عورت تھی[1]

بہرحال یہ سب کو مسلم ہے کہ مسلمان گھرانے میں اس کی پرورش ہوئی اور اگر روایات کو تسلیم نہ کریں، جن کے تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ نورو ہی کا بیٹا تھا۔ کبیر خالص مسلمانوں کا نام ہے لیکن ہندو کہتے ہیں کہ اس کی اصل کربیر ہے، کر بمعنی ہاتھ اور بیر بمعنی بہادر یا سورما۔ چونکہ یہ ہاتھ سے پیدا ہوا تھا اسلئے اس کا نام کربیر رکھا گیا جو بعد کو کبیر ہو گیا، لیکن یہ محض قیاس آرائی ہے۔

اس سلسلہ میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ مسلمان گھرانے کا لڑکا تھا تو ہندوؤں کے سے خیالات اس کے کیوں ہوئے اس کا ایک سبب تو یہ بتایا جاتا ہے کہ گو شایئں آشٹانند چونکہ اُس کو ہندو نسل کا لڑکا سمجھتے تھے، اس لئے انھوں نے اسکو تعلیم بھی ویسی ہی دی، لیکن صحیح سبب غالباً یہ ہے کہ اس وقت غریب مسلمان گھرانوں میں تعلیم کا رواج بالکل نہ تھا اور چونکہ کبیر فطرتاً روحانیت کی طرف زیادہ مایل تھا اور بنارس میں زیادہ تر ہندوؤں کی صحبت اسے نصیب ہو سکتی تھی اس لئے بچپن ہی سے ہندو خیالات و اطوار اسے متاثر کرنے لگے۔

یہ وہ وقت تھا جب رامانند کی روحانیت کا ہر طرف چرچا تھا اور وہ خالص تصوف کا پرچار کر رہے تھے جو عام ہندو مسلمانوں کے مذہبی خیالات سے بالکل جدا چیز تھی، یہ کبیر کے عنفوان شباب یا طفلی کا زمانہ تھا اور وہ ان کی صحبت میں بیٹھکر اُن کی تعلیمات سے متاثر ہو رہا تھا۔ لیکن جب پختگی عقل کے بعد اسے اپنے گرو رامانند کی تعلیمات میں بھی کچھ کمی نظر آنے لگی تو اس نے اپنی راہ الگ پیدا کی۔

اسلام اور کنیزیں

(جناب وحید بخش صاحب بی۔ اے۔ مضافپور۔ بدایوں)

کیا اسلام مالِ غنیمت میں ہاتھ آئی ہوئی کنیزوں کے ساتھ بغیر نکاح ہم بستری کی اجازت دیتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو کیا یہ فعل اسلام

---

[1] روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک برہمن اپنی لڑکی کو جو بہت کمسنی میں بیوہ ہو چکی تھی رامانند کے پاس لایا۔ رامانند کو معلوم نہ تھا کہ یہ بیوہ ہے، اسلئے اسکو بیٹا ہونے کی دعا دی۔ جب رامانند کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے کہا کہ بیٹا تو بہرحال اسکے ہوگا لیکن معجزہ کی صورت سے، چنانچہ اس لڑکی کے ہاتھ سے لڑکا پیدا ہوا اور اس کی ماں نے اس کو ایک تالاب میں کنول کے پھول پر رکھدیا اور نورو جولاہے نے اُٹھا کر اس کی پرورش کی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ گوشایئں اشٹانند نے جو رامانند کا چیلا تھا، لہرتلاؤ پر ایک عجیب قسم کی روشنی پڑتی دیکھی، رامانند سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ یہ روشنی ایک بچہ کی صورت اختیار کرے گی اور وہ بچہ بھی کبیر تھا۔ اسی وقت نیرو جولاہا معہ اپنی بیوی نیما یا نعیمہ کے اپنے گھر بنارس آرہا تھا کہ اس نے تالاب میں کنول کے پھول پر اس بچہ کو دیکھ کر اُٹھا لیا اور اس کی پرورش کی۔

جیسے مذہب کے شایانِ شان ہے۔ میرے نزدیک یہ حرکت مذہبی نقطۂ نظر کے علاوہ انسانیت کے نزدیک بھی انتہائی مذموم شمار کئے جانے کے قابل ہے۔

(نگار) آپ کی طرح اور بہت سے حضرات اسی غلطی میں مبتلا ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسلام نے مالِ غنیمت میں ہاتھ آئی ہوئی کنیزوں کے ساتھ نکاح کئے بغیر ہم بستری کی اجازت نہیں دی۔ اگر آپ کلام مجید کی سورۂ نساء ملاحظہ فرمائیں گے تو آپ کو اس کی تصدیق ہو سکے گی۔

کلام مجید میں تمام جنگی قیدیوں کو "ماملکت ایمانہم" سے ظاہر کیا ہے یعنی "وہ لوگ جن کو تم نے قوت سے حاصل کیا ہے" ان میں مرد و عورت دونوں شامل ہیں لیکن زیادہ تر ان سے مراد عورتیں ہی ہیں۔

جب جنگ احد میں مسلمانوں کی کافی تعداد شہید ہو گئی اور بہت سے بچے یتیم ہو گئے تو سوال پیدا ہوا کہ ان کی تربیت و پرورش کا کیا انتظام کیا جائے اگر یہ بچے لوگوں کو محض پرورش کے لئے تقسیم کر دئے جاتے تو خیال تھا کہ شاید وہ بے غرضانہ اس فرض کو اچھی طرح انجام نہ دے سکیں گے، اس لئے یہ آیت نازل ہوئی:

وان خفتم الا تقسطوا فی الیتامیٰ فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ و ثلث و رُباع، فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ او ماملکت ایمانکم۔

اگر تم ڈرتے ہو کہ یتیموں کے باب میں (تم اپنی اولاد کی طرح) مساوات نہ برت سکو گے تو تم اپنی پسند کی ہوئی عورتوں (یعنی ان یتیموں کی ماؤں اور شہداء کی بیواؤں) میں سے دو دو تین تین چار چار تک شادی کر لو۔ لیکن اگر تم ان کے درمیان عدل نہ قایم رکھ سکو تو پھر ایک ہی عورت سے شادی کرو۔

آپ نے دیکھا کہ اس آیت میں مالِ غنیمت کی حیثیت سے حاصل کی ہوئی کنیزوں کے ساتھ نکاح کا حکم دیا گیا ہے۔
اسی سورۂ نساء میں آگے چل کر بتایا گیا ہے کہ کن کن عورتوں سے نکاح ناجایز ہے اور یہ فہرست اس آیت پر ختم ہوتی ہے

والمحصنات من النساء الا ماملکت ایمانکم

یعنی فلاں فلاں عورتوں کے سلسلہ میں شادی شدہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں مگر وہ عورتیں جن کو تم نے مالِ غنیمت کے طور پر حاصل کیا ہے۔

اس حکم کے نازل ہونے کا سبب یہ تھا کہ جنگ میں بہت سی ایسی عورتیں بھی ہاتھ آتی تھیں جو شادی شدہ ہوتی تھیں اور بعد کو مسلمان ہو جاتی تھیں، چونکہ شادی شدہ عورتوں سے عام طور پر نکاح کی اجازت نہ تھی اس لئے خیال ہوا کہ غنیمت میں آئی ہوئی منکوحہ عورتوں سے بھی نکاح نہ کرنا چاہئے، لیکن اس آیت سے ان کو محصنات کے زمرہ سے خارج کر دیا گیا اور اُن سے شادی کی اجازت دیدی گئی۔

آپ نے دیکھا کہ یہاں بھی جنگ میں حاصل کی ہوئی عورتوں سے نکاح کا ذکر پایا جاتا ہے۔
سورۂ نور میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے: "وانکحوا الایامیٰ منکم والصالحین من عبادکم و امائکم"۔

(جہاں تک ممکن ہو) ان سے نکاح کرو جو تنہا ہیں (یعنی جن کی شادی نہیں ہوئی ہے یا جن کے بیوی یا شوہر موجود نہیں ہیں) اور اُن لونڈی غلاموں سے نکاح کرو جو موزوں ہوں۔

اس آیت میں عام لونڈی غلاموں سے بھی نکاح کی اجازت دی گئی ہے چہ جائیکہ قیدی عورتیں جو ان سے مرتبہ میں کہیں بلند ہیں۔

سورۂ مومنون کی بعض ابتدائی آیتیں ایسی ہیں جن سے ممکن ہے بعض کو یہ خیال پیدا ہو کہ قیدی عورتوں سے بغیر نکاح کے مقاربت جائز ہے۔ آیات یہ ہیں:

قد افلح المومنون - الذین ہم فی صلاتہم خاشعون - والذین ہم عن اللغو معرضون - والذین ہم للزکوۃ فاعلون - وہم لفروجہم حافظون - الا علیٰ ازواجہم او ماملکت ایمانہم -

یعنی وہ لوگ واقعی اچھے مسلمان ہیں، جو خشوع وخضوع کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں، جو لغو باتوں سے بچتے ہیں، جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے علاوہ غیر عورتوں سے حفاظت کرتے ہیں۔

یہ آیتیں مکہ میں نازل ہوئی تھیں اور ان میں لونڈیوں سے مقاربت کی اجازت دی گئی ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ جو سورۂ نساء کی مدنی آیتوں میں مذکور ہے۔ اور اگر سورۂ نساء اور سورۂ مومنون کی آیتوں کو ایک دوسرے سے علٰحدہ سمجھا جائے تو بھی سورۂ مومنون کی موخرالذکر آیتوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ لونڈیوں سے بغیر نکاح کے مقاربت کی اجازت دی گئی ہے۔

بہرحال میری رائے میں اسلام نے کبھی کنیزوں کے ساتھ بغیر نکاح کے ہمبستری کی اجازت نہیں دی۔

اصنام دبستاں

بام و درگلگوں، صبا کی چال اٹھلائی ہوئی
ظلمتیں آغوشِ میں، تنویر کا ساماں لئے
نبضِ خار و خس میں رقصاں زندگانی کے شرار
پرتوِ گلشن زمیں پر، کل فضا نکھری ہوئی
اللہ اللہ! یہ بہارِ جاودانِ رنگ و بو
سامنے آتا ہوا گلرنگ خوباں کا ہجوم
چند پیکر کچھ سُبک سے، چند پیکر کچھ گداز
چند چہروں پر تبسم، چند رخ پر تمکنت
چند آنکھیں غرقِ صہبا، چند عارض شعلہ رنگ
چند مژگاں کے جھپکنے میں ترانوں کی پھوار
چند شعلے سے فروزاں آتشیں رخسار ہیں
چند بالا قد نمونے قامتِ شمشاد کے
چند تیغوں کی لچک موجِ خرامِ ناز میں
کفر ساماں بتکدوں کے نو تراشیدہ صنم
جن کے قدموں سے زمیں پر پھول سے کھلتے ہوئے
جن کے جلوے چارۂ اندوہ تنہائی لئے
جن کی آنکھوں میں سرورِ کوثر و تسنیم ہے
جن کی باتوں میں سلیقہ، جن کی ہر جنبش ادا
جن کے ہر عشوہ میں اِک صبحِ قیامت کی جھلک
اِک قلوپطرہ کی ثانی، اِک زلیخا کا جواب
اِس کے خال و خد جمالِ ماہ کنعانی لئے
اِس میں سلمیٰ کی لطافت، اُس میں عذرا کا نکھار
خلد سامانِ نظر گلرنگ شانوں کا گداز

اِک فضائے وجد ساماں روح پر چھائی ہوئی
خامشی دامن میں شیریں زمزمے پنہاں لئے
ذرہ ذرہ سے اُبلتے کامرانی کے شرار
دامنِ موجِ ہوا میں سرخوشی بکھری ہوئی
دیدنی ہے رہگذر میں کاروانِ رنگ و بو!
مہ جبیں، گلنار اصنامِ دبستاں کا ہجوم
چند آنکھوں میں تغافل، چند نظریں دلنواز
چند مکھڑے آئینہ رو، چند لب لالہ صفت
چند افسوں خیز ماتھے، چند نظریں شوخ و شنگ
چند ہونٹوں کے تبسم سے رواں کوثر کی دھار
چند تلواروں کی تیزی ابروئے خم دار میں
چند قاتل رخ مرقعے مانی و بہزاد کے
چند نغموں کے خزانے شعلۂ آواز میں،
کچھ کلیساؤں کے آہو، کچھ غزالانِ حرم
جن کے چہرے مریمِ معصوم سے ملتے ہوئے
جن کے انفاسِ کرم گسترِ مسیحائی لئے
جن کی ٹھوکر میں کلاہ و افسر و دیہیم ہے
جن کی ہر سعی، ایک غمزہ، جن کی ہر کوشش ادا
جن کے ہر انداز میں علم و فراست کی جھلک
ایک رشکِ ماہ و پرویں، ایک زہرہ کا جواب
اُس کے چہرہ کی نزاکت حسنِ یونانی لئے
اِس میں نورِ موجِ زمزم، اُس میں گنگا کا نکھار
نرگس[illegible]ں میں عریاں "قصۂ ناز و نیاز"

فرقِ نازک سے وہ آنچل کا ڈھلکنا بار بار — وہ حیا کا رنگ عارض میں جھلکنا بار بار
دیدۂ مے گوں علاجِ گردشِ دوراں لئے — شوق کی نازک حکایت جنبشِ مژگاں لئے
نشۂ نازِ جوانی پیکرِ شاداب میں — دلربائی گنگناتی گیسوئے شب تاب میں
شبہِ خورشیدِ درخشاں کا جبینِ ناز پر — نغمۂ رنگینِ بلبل کا گماں آواز پر
مست آنکھوں میں پرافشاں دلستانی کا سرور — لغزشِ پا میں نمایاں کامرانی کا سرور

گریۂ غم وجہِ تسکینِ دلِ خوباں رہے
میرے زخمِ دل پہ خنداں محفلِ خوباں رہے!!

حسن یحیٰ عندلیب میرٹھی ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی

میں

گردشِ شمس و قمر، گردشِ شام و سحر — وقت ہے گرمِ سفر، وقت ہے گرمِ سفر
میرے نفس نے دیا وقت کو درسِ خرام — رینگتے رہتے یونہی ورنہ یہ شام و سحر
مری نظر نے لیا جائزۂ کائنات — مجھ کو نظر آگیا اپنا ہی حُسنِ نظر
نالہ بھی میری نوا، نغمہ بھی میری نوا — وہ بھی مرا چارہ گر، یہ بھی مرا چارہ گر
عشق میں بےچارگی، حسن میں زعمِ غلط — عشق رہا سرنگوں، حُسن رہا خودنگر
میرے تبسم کی لہر، میری جبیں کی شکن — یعنے بہار و خزاں میری ہی طرزِ نظر
میری رہِ شوق میں طور بھی تھا اک مقام — طور سے بڑھنے لگا اور بھی ذوقِ سفر
جرأتِ پرواز نے عرش کو بھی چھو لیا — عرش بھی نکلا مگر میری ہی حدِ نظر
اوجِ فلک سے بلند اپنی نظر ہوگئی — اپنی نظر میں مگر اب بھی ہوں میں کم نظر
شام کی افسردگی، میرے ہی خوابوں میں گم — صبح کی رنگیں شفق میرا ہی خونِ جگر
ہر نفس اک انقلاب، ہر قدم اک ارتقا — جدلِ مسلسل کا نام زندگیِ مختصر

میرا سکون اضطراب، میری جدائی حیات
یعنے ہر شبنم کی بوند رکھتی ہے رقصِ شرر

میکش حیدرآبادی

انقلاب زندہ باد

اُٹھ گئے راحت و سکوں کے حجاب
اب کہاں دورِ اطلس و کمخواب

منتشر ہے بساطِ رنگ و بو
خار و خس میں اُلجھ رہے ہیں گلاب

رہ گئے ٹھوکروں میں پس پس کر
لعلِ شب تاب و گوہرِ نایاب

جام و مینا کے ہو گئے ٹکڑے
خاک بر سر ہیں بادہ ہائے ناب

ہو گئیں راکھ چلمنیں خس کی
بن گئی آگ خنکیٔ برفاب

پُرزے پُرزے ہیں سازہائے نشاط
پارہ پارہ ہیں زخمہ و مضراب

ہو کے خاموش ٹوٹ ٹوٹ گئے
چنگ و بربط، نفیر و عود و رباب

قصر و ایواں کی ہل گئی بُنیاد
زد میں طوفاں کی آ گئے ہیں حباب

کشتیٔ زر، سفینۂ دولت
آ کے ساحل پہ ہو گئے غرقاب

دستِ مزدور میں ہے دامنِ شاہ
جیسے سچ مچ ہے گرم روزِ حساب

کس مپرسی کی کشمکش میں ہیں
صاحبِ امتیاز و اہلِ خطاب

رہ گئی مٹ کے سطوت نمرود
تھی جو روزِ ازل سے نقش برآب

جس میں رقصاں تھے مال و زر کے جہاز
وہ سمندر ہی ہو گیا پایاب

آنے والا ہے عہدِ جمہوری
اور شاہنشہی ہے پا بر کاب

مٹ گیا فرقِ حاکم و محکوم
اب کوئی بھی نہیں "حضور" و "جناب"

کر دیا ہر غلام کو آزاد
زندہ باد انقلاب زندہ باد

ماہر القادری

"پیدا کریں"

زہد کی مردہ دلی میں سرخوشی پیدا کریں
آ، گناہوں سے ثبوتِ زندگی پیدا کریں

جس کی روشن خنکیوں میں ڈھل سکیں رنگینیاں
ہر شبِ تاریک سے وہ چاندنی پیدا کریں

آفتابِ علم سے ذہنوں کو دیکر آب و تاب
جہل کی تاریکیوں میں روشنی پیدا کریں

عزم میں جس کے ہو جہدِ مستقل کا بانکپن
[illegible] آدمی پیدا کریں

آغا سرخوش قزلباش

غزل : حزیں دہلوی

ہو چکے ہیں اس قدر ہم تلخکامِ آرزو
ہم نے خونِ آرزو رکھا ہے نامِ آرزو

جا چکے وہ، ہو چکا برہم نظامِ آرزو
اب تو آنکھیں کھول محوِ اہتمامِ آرزو

اتنی بے دردی سے وہ دامن جھٹک کر چل دئے
دیکھتے ہی رہ گئے ہم تشنہ کامِ آرزو

میری ضد پہ آخر اتنی بے نیازی کیا ضرور
دل کی خاطر کچھ تو کیجے احترامِ آرزو

ہمنشیں! یہ ہے تری رودادِ عشرت کا اثر
رہ گیا دل تھام کر اک خستہ کامِ آرزو

دل کے ہاتھوں یہ تری دیوانگی کب تک حزیں
اے تمناؤں کے بندے، اے غلامِ آرزو

غزل : فکر ندوی

سکوتِ غم ہے، باقی ہے، مگر رسمِ پیام اب بھی
شبِ تاریک میں ہوں مہر و مہ سے ہم کلام اب بھی

پہونچکر منزلِ مقصد پہ یہ محسوس کرتا ہوں
نگاہوں سے ہیں اوجھل عشق کے اکثر مقام اب بھی

یہ ایں بیچارگیِ عشق اس دل کا وہ عالم ہے
اشاروں سے بدل سکتا ہے نظمِ صبح و شام اب بھی

بھلا دینے کی پیہم کوششوں کے بعد بھی ناصح
بڑھا دیتا ہے دل کی دھڑکنیں کافر کا نام اب بھی

وفورِ غم میں بھی وہ شوخیِ اُلفت نہیں جاتی
زبانِ بے ادب پر آ ہی جاتا ہے سلام اب بھی

کبھی اے فکر جو برہم زنِ عہدِ محبت تھی
مسلط ہے ارادوں پر وہ فکرِ ناتمام اب بھی

غزل : تمکین سرمست

اُف رے جذبِ رنگ و بو اللہ رے جوشِ بہار
پھر پلٹ آئی خزاں سیرِ گلستاں کے لئے

کیا خبر تھی اُس پہ بھی آخر کو آنچ آ جائے گی
آشیانہ پھونک ڈالا جس گلستاں کے لئے

ہوں یہی بربادیاں جس کی بہاروں کا مآل
کون صحرا چھوڑ دے ایسے گلستاں کے لئے

دیدنی ہوتی ہیں دردِ عشق کی مایوسیاں
حسن جب مجبور ہو جاتا ہے درماں کے لئے

مطبوعات موصولہ

دکن کی سیاسی تاریخ کسی ملک کی تہذیب اور اس کے تدریجی ارتقاء یا انحطاط کے سمجھنے کے لئے وہاں کی نہ صرف عام تاریخ بلکہ سیاسی تاریخ کا مطالعہ ضروری ہوا کرتا ہے اور خالص سیاسی نقطۂ نظر سے کسی قوم و ملک کی تاریخ کو پیش کرنا آسان نہیں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت تک دکن کی جتنی تاریخیں لکھی گئی ہیں، ان میں اس کتاب کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہونا چاہئے۔

اس کے مصنف سید ابوالاعلیٰ مودودی چونکہ خود عرصہ تک دکن میں رہ چکے ہیں اور انھوں نے یہاں کی تاریخ کا غایر مطالعہ کیا ہے، اس لئے انھوں نے اس کتاب کی جمع و ترتیب میں ہر اس پہلو کو لے لیا ہے جسے یہاں کی سیاسیات سے کچھ بھی لگاؤ ہے۔ یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں نظام الملک اور اُن کے خاندان کے حالات سے بحث کی گئی ہے، دوسرے باب میں وفات عالمگیر کے بعد سے دولت آصفیہ کی خود مختاری تک کے حالات کو پیش کیا گیا ہے اور تیسرے میں نادر شاہی حملہ تک کے واقعات پیش کئے گئے ہیں۔

انداز بیان اور اسلوب ترتیب کے متعلق زیادہ لکھنے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ اس کے مصنف اپنی سلجھی ہوئی تحریر کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتے ہیں۔ یہ کتاب دارالاشاعت سیاسیہ حیدرآباد دکن نے شایع کی ہے اور قیمت قسم اول ۸؍ ہے اور قسم دوم ۶؍ ہے۔

ہندوستان کی فیصلہ کن جنگیں اس کتاب میں اُن آٹھ لڑائیوں کا حال درج ہے جو فاضل مولف محمود خاں محمود کی رائے میں تاریخ ہندوستان میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی تھیں۔ سب سے پہلے تھانیسر کی لڑائی کا ذکر ہے۔ یہ وہ جنگ تھی جو سنہ ۱۱۹۳ء میں شہاب الدین محمد غوری اور پرتھوی راج کے درمیان ہوئی۔ دوسری لڑائی پانی پت کی ہے۔ جو سنہ ۱۵۲۶ء میں بابر اور ابراہیم لودی کے بین ہوئی۔ اس کے بعد جنگ قنوج کا ذکر ہے جو سنہ ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ اور ہمایوں کے درمیان ہوئی۔ چوتھے باب میں پانی پت کی دوسری لڑائی کا حال بیان کیا گیا ہے جو ہیمو اور اکبر کے درمیان سنہ ۱۵۵۶ء میں ہوئی، پانچویں باب میں جنگ تالی کوٹا کا ذکر ہے جو سنہ ۱۵۶۴ء میں رام راج اور دکن کی مسلم حکومتوں کے درمیان ہوئی تھی۔ چھٹی لڑائی جنگ پلاسی کی ہے، ساتویں باب میں پانی پت کی تیسری لڑائی کا ذکر ہے اور آٹھویں میں سرنگاپٹم کی جنگ کا۔

زبان اور اسلوب بیان دونوں شگفتہ ہیں۔ یہ کتاب ملک بک ڈپو ۔ گنے زینان اسٹریٹ لاہور سے ۶؍ میں مل سکتی ہے۔

افکار جناب سید حسین فکر بدایونی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ جناب فکر بہ سلسلۂ ملازمت پولیس عرصہ تک لکھنؤ میں رہے اور یہیں کی صحبت شعر و سخن نے ان میں یہ ذوق پیدا کیا۔ کلام دنائت و سخافت سے پاک ہے۔

شعاع نور مختصر سا مجموعہ ہے امیر احمد خاں قدس اکبرآبادی کی چند نظموں اور غزلوں کا۔ کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ حیرت ہے کہ اس زمانہ میں جب شعرگوئی کا معیار اس قدر بلند ہوگیا ہے، اس مجموعہ کے شایع کرنے کی کیا ضرورت لاحق ہوئی اور کون ہے جو ۸ر صرف کرکے اس کو مول لیگا۔

سوویٹ روس ۱۶ صفحات کا مختصر رسالہ ہے جس میں سوویٹ روس اور وہاں کے مسئلۂ قومیت پر روشنی ڈالی گئی ہے یہ رسالہ ترجمہ ہے ایک روسی اہل قلم کے مقالہ کا جو وہاں وائس چیرمین کی حیثیت رکھتا ہے۔ ترجمہ تمنائی صاحب نے کیا ہے اور بہت صاف و شگفتہ ہے۔ نیا سنسار بانکی پور پٹنہ سے تین آنہ میں ملسکتا ہے۔

لینن یہ رسالہ بھی جناب تمنائی کا ترجمہ کیا ہوا ہے اور نیا سنسار نے اسے شایع کیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اسٹالین کی نگاہ میں لینن کا کیا مرتبہ تھا۔ قیمت ۵ر

اُجرتی محنت اور سرمایہ کارل مارکس نے عوام کی سیاسی تربیت کے مضامین اور تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا اور انھیں میں ایک مقالہ اس موضوع پر بھی تھا کہ سرمایہ اور اُجرت کا باہمی تعلق کیا ہے۔ اس وقت جبکہ سرمایہ داری اور مزدوری کا تصادم دنیا کے ہر گوشہ میں پایا جاتا ہے، اس مسئلہ کا اصولی مطالعہ ضروری ہے، اور عابد علی خاں بی۔ اے نے اس کا ترجمہ کرکے یقیناً ایک مفید چیز ملک کے سامنے پیش کی ہے۔ قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ اشاعت گھر، حیدرآباد دکن۔

شاہ ولی اللہ اور انکا فلسفہ یہ تصنیف مولانا عبیداللہ سندھی کی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، تاریخ اسلامی کے اس دور میں جب قوت فکر و اجتہاد ختم ہوکر صرف کورانہ تقلید باقی رہ گئی تھی، انھوں نے ہمارے فکر و ذہن میں نئی روح پیدا کی اور ایک ایسے علم کلام کی بنا ڈالی جو ماحول و مقتضائے وقت کی پیداوار تھا۔

مولانا عبیداللہ سندھی اس وقت تنہا ایسے شخص ہیں جنھوں نے اپنی زندگی "تعلیمات ولی اللہ" کے سمجھنے اور ان کی نشر و اشاعت کے لئے وقف کردی ہے۔ یہ تصنیف جو درحقیقت ان کے ایک مقالہ کی کتابی صورت ہے شاہ ولی اللہ کے فلسفہ پر اک آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے اور ہر اُس شخص کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے، جو تعلیمات اسلامی سے دلچسپی رکھتا ہے۔ ہرچند شاہ ولی اللہ کا فلسفہ موجودہ رجحانات کے لئے پوری طرح تشفی بخش نہیں، تاہم جس زمانہ میں یہ پیش کیا گیا تھا اس وقت یہ ضرور چونکا دینے والا تھا، اس کتاب کو محمد سرور صاحب نے مرتب کیا ہے اور سندھ ساگر اکاڈمی لاہور سے ۸ر میں ملسکتی ہے۔

اشارہ صوبۂ بہار کی تاریخ میں ہم کو بہت ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اُردو ادب اور شاعری کی ترقی میں کتنا حصہ لیا اور تذکروں کے مطالعہ کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں کہ یہاں کتنے اچھے

شاعر پیدا ہوئے اور جاکر بس گئے۔ لیکن افسوس ہے کہ صوبۂ بہار کی اس حیثیت کا علم کم لوگوں کو ہے اور اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ اس موضوع پر کوئی مستقل تصنیف اس وقت تک شایع نہیں ہوئی۔

موجودہ دور شاعری میں بھی بہار کی سرزمین نے اچھے اچھے شاعر پیدا کئے ہیں اور انھیں میں سے ۲۳ شعراء کا کلام اس مجموعہ میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ تمام نظمیں شاعرانہ ٹکنک کے لحاظ سے قدیم لیکن معنی وخیال کے لحاظ سے جدید ہیں اور ان میں سے اکثر مختلف رسایل میں شایع ہو چکی ہیں۔ تمنائی صاحب نے یہ مجموعہ شایع کرکے قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ: نیا سنسار۔ بانکی پور پٹنہ۔

نقش ناہید جناب مجنوں گورکھپوری کے چھ افسانوں کا مجموعہ ہے جو اس سے قبل ملک کے رسایل میں شایع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں۔ مجنوں صاحب ایک خاص رنگ کے افسانہ نگار ہیں، جو لطف و تفریح کے ساتھ ہمیں غور وفکر پر بھی مجبور کرتے ہیں۔ قیمت سے ر۔ ملنے کا پتہ: دیوان اشاعت، گورکھپور

عہد حاضر کے بڑے لوگ یہ کتاب محمد مرزا صاحب دہلوی کی تالیف ہے۔ اس کے چار حصے ہیں، پہلے حصہ میں ہندوستان کے چار اکابر (گاندھی۔ جینا۔ چترنجن داس اور مولانا محمد علی) کے حالات درج ہیں، دوسرے حصہ میں چین و ایران کے چیانگ کائی شک اور رضا شاہ پہلوی کے سوانح پیش کئے گئے ہیں۔ تیسرے حصہ میں عراق و عرب کے امیر فیصل اور سلطان عبدالعزیز کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور چوتھے حصہ میں مصر و مراکش کے زغلول پاشا اور غازی محمد بن عبدالکریم کے زندگی سے بحث کی ہے۔ کتاب کی ضخامت ۴۲۲ صفحات ہے اور دارالاشاعت سیاسیہ حیدرآباد دکن سے چار روپیہ میں مل سکتی ہے۔

کمپنی کی حکومت یہ دوسرا اڈیشن ہے۔ نگار میں اس سے پہلے بھی اس پر تبصرہ ہو چکا ہے۔ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے نہایت جامع چیز ہے کمپنی کی حکومت کی تاریخ بڑے جھگڑے کی چیز ہے اور اس پر قلم اٹھانے کی ہمت کم لوگوں نے کی ہے، اس لئے جناب باری کی یہ محنت بہت زیادہ قابل داد ہے۔ انداز بیان نہایت شگفتہ و دلچسپ ہے۔ قیمت چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ اردو لاہور

سوشلزم آج سوشلزم یا اشتراکیت کا لفظ ہر زبان پر نظر آتا ہے، لیکن اس کے سمجھنے والے بہت کم ہیں اس لئے جناب سبط حسن صاحب نے اس موضوع پر فریڈرک اینگلس کی مشہور کتاب کا ترجمہ کرکے واقعی برمحل خدمت انجام دی ہے۔ سبط حسن صاحب چونکہ صحافت کا کافی تجربہ رکھتے ہیں، اس لئے ترجمہ بہت صاف ہے۔

قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ قومی دارالاشاعت بمبئی (۴)

یہ امرت ہے خواجہ احمد عباس کا لکھا ہوا مختصر سا ڈرامہ ہے جو پیپلز تھیٹر اسوسی ایشن بمبئی کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس ڈرامہ میں مزدور و سرمایہ دار کے مستقبل کو نہایت خوبی سے پیش کیا گیا ہے اور پلاٹ و زبان کے لحاظ سے مطالعہ کے قابل ہے۔ قیمت ۶ر۔ ملنے کا پتہ: اشاعت گھر حیدرآباد۔

نجات کا راستہ سی، راج گوپال چاری، اس وقت ہندوستان کی سیاست میں ایک نشان راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کانگرس جماعت کے غالباً یہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے گاندھی جی کو بھی متاثر کئے بغیر

نہ چھوڑا۔ انھوں نے اس رسالہ میں بتایا ہے کہ ہندوستان کی سیاسی گتھیاں کیونکر سلجھ سکتی ہیں اور ہندو مسلم نزاع دور کرنے کی کیا تدبیر ہے۔ اس وقت جبکہ گاندھی جی اور مسٹر جناح کی ملاقات سے ہندوستان کے نئے نظام کی بنیاد پڑنے کی توقع کی جاتی ہے۔ اس مقالہ کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ قیمت ۱ار۔ ملنے کا پتہ۔ اشاعت گھر، حیدرآباد دکن۔

سوویٹ روس کی عورتیں

سوویٹ روس نے جو کامیابیاں ہٹلر کے مقابلہ میں حاصل کی ہیں، وہ واقعی معجزہ کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن اس معجزہ میں وہاں کی عورتوں کا کتنا حصہ ہے اس سے کم لوگ واقف ہیں۔ رضیہ ظہیر صاحبہ نے اس رسالہ میں اسی موضوع پر گفتگو کی ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک آزاد ملک کی عورتوں کی ذہنیت کس قدر بلند ہوتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے گھروں کی عورتیں اس کا مطالعہ کریں اور سبق لیں۔ قیمت ۶ر۔ ملنے کا پتہ قومی دارالاشاعت بمبئی (م)

الاخلاط والرطوبات

جناب حکیم عبدالجلیل صدیقی قنوجی کی تصنیف ہے عربی زبان میں، اس کے مصنف طبیب بھی ہیں اور دیوبند کے فاضل بھی، اس لئے یہ کتاب زبان اور موضوع دونوں حیثیتوں سے معیاری مرتبہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب انھوں نے اس لئے لکھی ہے کہ طلبہ اس سے فائدہ اُٹھائیں اور اساتذہ فوری حوالہ کے طور پر اس کو اپنے پاس رکھیں۔ اخلاط کی بحث فن طب میں اساسی حیثیت رکھتی ہے اور اسی کے سمجھنے پر صحیح تدبیر و علاج کا انحصار ہے۔ ضرورت تھی کہ مختصراً نہایت صاف عبارت میں اس بحث کو پیش کیا جاتا اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ فاضل مولف نے اس ضرورت کو باحسن وجوہ انجام دیا۔ قیمت ۱۲ر۔ ملنے کا پتہ دفتر قومی اخبار۔ چمن گنج کانپور

جنگ اور طب

رسالہ ہمدرد صحت دہلی کی اشاعت خاص ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جنگ سے فن طب کو کتنی ترقی ہوئی۔ یہ رسالہ اپنی خاص اشاعتوں کے لحاظ سے غیر معمولی شہرت حاصل کر چکا ہے اور اس وقت تک جتنی خاص اشاعتیں اس رسالہ کی شایع ہو چکی ہیں اگر وہ سب کسی کے پاس ہوں تو وہ بجا طور پر طبیب ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اس وقت ہندوستان میں اور بھی متعدد دواخانے اور طبی رسالے موجود ہیں، لیکن ان سب میں ہمدرد دواخانہ دہلی اور اس کے رسالہ ہمدرد صحت کو جو امتیاز حاصل ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں۔ اس اشاعت خاص کی قیمت باوجود ضخیم ہونے کے صرف ۸ ر ہے۔ دفتر رسالہ ہمدرد صحت دہلی سے طلب کیجئے۔

لہو ترنگ

مجموعہ ہے میر سکندر علی وجد بی۔ اے کی نظموں اور غزلوں کا، جسے عبدالحق اکاڈمی حیدرآباد نے نہایت اہتمام سے مجلد شایع کیا ہے۔

وجد، حیدرآباد سول سروس سے تعلق رکھتے ہیں اور اسوقت کے نوجوانوں میں بڑے خوش فکر اور خوشگو شاعر ہیں۔ وجد کو فطری مناظر سے بڑی دلبستگی ہے اور ایسی نظمیں وہ بہت خوب کہتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ ان کی شاعری کی عمر چند سال سے زیادہ نہیں، ان کا کلام نہ صرف یہ کہ بے عیب ہوتا ہے، بلکہ اس میں تمام وہ خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ایک کہنہ مشق شاعر کے کلام میں ہونا چاہئے۔ اُن کے یہاں جدید تشبیہات و تعبیرات بکثرت پائی جاتی ہیں، لیکن شکر ہے کہ ان میں اشاریت و ابہام کہیں نظر نہیں آتا۔ اُن کی غزلیں یقیناً نظموں سے کچھ گری ہوئی ہیں، لیکن پھر بھی وہ آجکل کے بہت سے اچھے شعراء کے کلام کے مقابلہ میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ قیمت قسم اول چھ روپیہ، قسم دوم تین روپیہ

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

جذبات بھاشا

۔ نیاز نے ایک دلچسپ تمہید
ساتھ بہترین ہندی شاعری کے
نے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح
ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے
دمیں یہی سب سے پہلی کتاب
موضوع پر لکھی گئی ہے اور
ی کلام کے بہترین نمونے نظر
ہیں۔

قیمت بارہ آنے
علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے
تین علمی مضامین شامل ہیں:

۱۔ چند قدیم فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔
۲۔ مادئین کا مذہب
۳۔ حرکت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ
علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا
لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام
نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ
میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ
اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر
بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر
نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت
صحیح و خوش خط سرورق رنگین۔

قیمت بارہ آنے
علاوہ محصول

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ
سے ایک شخص آسانی ہاتھ کی
شناخت اور اس کی لکیروں کو
دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے
مستقبل سیرت عروج و زوال
موت و حیات، صحت و بیماری
شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح
پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ
علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

باب الاستفسار ــــــــ
باب المراسلۃ والمناظرہ ــــــــ
مالہ و ماعلیہ ــــــــ

[illegible] اس کو شروع کردینا
[illegible] پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی
اڈیشن ہے جس میں صحت
نفاست کاغذ و طباعت
[illegible] اہتمام کیا گیا
ــ

قیمت ڈیڑھ روپیہ
علاوہ محصول

[illegible] کے بعد

[illegible] افسانوں کا مجموعہ
[illegible] ہے کہ ہمارے ملک کے
ہادیان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی
کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت
و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ قابل ہو
زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو
مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف
دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے
علاوہ محصول

انتقادیات دو حصے (زیر طبع)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی
مقالات [illegible] دو حصوں میں تقسیم کئے گئے
ہیں۔ پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں
[illegible] خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے
مثلاً مومن، ظفر، غالب، مصحفی، نظیر،
سیماب، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ۔
دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی
مباحث ہیں جنکا تعلق شعر و ادب کی تاریخ
سے ہے ہر ایک حصہ پانچ پانچ سو صفحات سے
کم نہ ہوگا اور ہر حصہ کی قیمت پانچ روپیہ ہوگی

مذہبیات (زیر طبع)

حضرت نیاز کے تمام وہ بہترین مقالات
جن میں انھوں نے مذہب و متعلقات مذہب سے
اپنے خاص رنگ میں بحث کی ہے حضرت نیاز کے
یہ مضامین اس قدر دلچسپ اتنے مکمل
[illegible] ہیں کہ ان کا جواب پیش نہیں کیا
جا سکتا۔ اس مجموعہ میں تمام وہ مضامین
[illegible] نے دنیائے مذہب میں ہلچل
ڈالدی تھی [illegible] جنکے مطالعہ کو لوگوں کی آنکھیں ترس
[illegible] دو حصوں میں شائع ہونگے ہر
حصہ کا حجم ۵۰۰ صفحات اور قیمت پانچ روپیہ ہوگی

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۹ء	جنوری سنہ ۴۰ء	جنوری سنہ ۴۱ء	جنوری سنہ ۴۲ء	جنوری سنہ ۴۳ء	جنوری سنہ ۴۴ء
(مصحفی نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں: حیات مصحفی۔ اُردو غزل گوئی میں مصحفی کا مرتبہ۔ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ	(نظیر نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں: نظیر کا مسلک ــــ شاعری پر تبصرہ۔ نظیر اور عوام۔ انتخاب انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ	یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزلگو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے۔	اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری سنہ ۴۱ء میں شایع ہوا تھا۔	اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔	جدید شاعری نمبر اس میں بتایا گیا ہے کہ جدید رجحانات شعر کی کیا حقیقت ہے اور آزاد نظم نگاری کا ردیف و قافیہ سے بے نیاز ہو کر کیا معنی رکھتا ہے
قیمت دو روپے علاوہ محصول	قیمت دو روپے علاوہ محصول	قیمت تین روپے علاوہ محصول	قیمت دو روپے علاوہ محصول	قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول	قیمت دو روپے علاوہ محصول

نرخنامہ اُجرت اشتہار

	ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۶۰۰ روپیہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
آدھا صفحہ	۳۶۰ روپیہ	۱۸۰ روپیہ	۹۰ روپیہ	۳۰ روپیہ
چوتھائی صفحہ	۱۸۰ روپیہ	۹۰ روپیہ	۴۵ روپیہ	۱۵ روپیہ

(۱) اُجرت بہر حال پیشگی لی جائے گی۔ رو چہ یا وی پی کے ذریعہ سے وصول منظور نہیں۔

(۲) جتنی مدت کے لئے اشتہار دیا جاتا طے ہوا ہے اسکی رقم پیشگی یکمشت لی جائیگی ماہانہ ادائی کی صورت میں نرخ وہی ماہانہ رہے گا۔

(۳) اشتہار فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کمیشن ذریعہ خط و کتابت طے ہو سکتا ہے

مینیجر

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر ... مصیبت ہیں اس اشا

۶ بیرون ہند آٹھ

(نوٹ) رسالہ جاری

۲۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ

۸ فی پرچہ کے حساب سے قیمت

نہایت

حصول جواب

خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا تو تعمیل دشوار ہے

چندہ سالانہ پانچ روپیہ

ششماہی جاری نہیں ہوسکتا

نگار

نگراں : نیاز فتحپوری مدیر اعزازی : اخوند فیض محمد فاروقی سرحدی

ادارہ

مجدّد نیازی ـــــــ شوکت جہاں

شمار ۶	فہرست مضامین دسمبر سنہ ۱۹۴۴ء	جلد ۴۶

انتقادیات

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات دو جلدوں میں، جو اخیر دسمبر تک شایع ہو جائیں گی ــ

قیمت جلد اول للعہ ـــــــ قیمت جلد دوم للعہ

منیجر نگار لکھنؤ

ملاحظات

آیندہ جنوری سنہ ۴۵ء کا "نگار" پچھلے مہینہ کی اشاعت میں، مینے بعض علماء کی آمادگی و پسندیدگی کی بناء پر ظاہر کیا تھا کہ آیندہ جنوری کا نگار، ڈاکٹر ٹسڈل کے ان اعتراضات کے لئے وقف ہوگا، جو "ماخذ القرآن" کے عنوان سے انھوں نے اسلام پر کئے ہیں۔

اس دوران میں چند اور اہل علم حضرات نے اس کی تائید کی، اس لئے اب یہ بات قطعی طور پر طے ہو چکی ہے کہ جنوری سنہ ۴۵ء کا نگار اسی موضوع کے لئے وقف ہوگا۔

مینے نومبر کے نگار میں مختصراً ظاہر کر دیا تھا کہ ڈاکٹر ٹسڈل نے اسی موضوع پر پہلے ایک مقالہ فارسی زبان میں ینابیع الاسلام کے نام سے لکھا تھا، جب اس کا انگریزی ترجمہ "[illegible] ۱۹" میں شایع ہوا تو احمدی جماعت کی طرف سے اس کا جواب "Review of Religions" میں بالاقساط شایع ہوا، لیکن اول تو اس کا جواب بہت تشنہ تھا، علاوہ بریں، ڈاکٹر ٹسڈل کی جو تصنیف میرے سامنے ہے، وہ فارسی مقالہ سے بہت بعد کی چیز ہے اور کافی بسیط ہے۔

اگر ڈاکٹر ٹسڈل کی یہ تصنیف محض ہفوات و مزخرفات ہوتی، تو میں قطعاً اسے قابل اعتناء نہ سمجھتا لیکن چونکہ اس میں کافی سنجیدگی سے کام لیا گیا ہے اور بعض مسائل میں مصنف نے واقعی عالمانہ انداز گفتگو اختیار کیا ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ ویسی ہی عالمانہ تحقیق سے اس کا جواب دیا جائے اور یہی خیال میرے اس ارادہ کا محرک تھا۔

اس کتاب کے بعض حصے ایسے ہیں جو ہمارے مسلمات کے منافی نہیں، اس لئے ان پر گفتگو کی مطلق ضرورت نہیں، بعض حصے ایسے ہیں جن کا جواب صرف ایک فقرہ سے دیا جا سکتا ہے اور فٹ نوٹ یا ہر باب کے آخیر میں بطور استدراک میں اس فرض کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن بعض حصے ایسے بھی ہیں جن سے ہم سرسری نہیں گزر سکتے اور جن پر تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے اور یہی وہ حصہ ہے جس کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔

جنوری کا نگار زیادہ سے زیادہ ۱۵ جنوری تک تمام علماء کے پاس پہونچ جائے گا اور اگر انھوں نے جلد توجہ فرمائی تو مارچ سنہ ۴۵ء کے نگار میں تمام جوابات شایع ہو سکیں گے۔

ہر چند بعض حضرات یہی چاہتے تھے کہ اعتراضات و جوابات یکجا شایع ہوں، لیکن جیسا کہ میں پہلے ظاہر کر چکا ہوں، یہ ممکن نہ تھا کیونکہ اول تو دونوں کا مجموعی حجم اتنا ہو جاتا کہ نہ اتنا کاغذ فراہم ہو سکتا اور نہ ہم قانوناً اسے شایع کر سکتے، اسلئے ان دشواریوں کے رفع ہونے تک (جس کا کوئی وقت متعین نہیں ہو سکتا) ان خدشات کا اپنے دل میں رکھنا مینے مناسب نہ سمجھا، خاصکر ایسی صورت میں جبکہ بعض علماء نے اعتراضات و جوابات کی علحدہ علحدہ اشاعت کو نامناسب نہیں سمجھا۔

بہرحال اب آپ جنوری کے رسالہ کا انتظار کیجئے اور مقامی طور پر انتظام کر لیجئے کہ ڈاک خانہ سے آپ کے پاس محفوظ پہونچ سکے، ورنہ دوبارہ مشکل ہی سے مل سکے گا۔

چونکہ یہ بحث بہت پر لطف ہوگی، اس لئے جنوری کے رسالہ کو بہت حفاظت سے رکھئے گا تاکہ جوابات سے آپ پوری

طرح مستفید ہوسکیں۔

یہاں سے ہر خریدار کے نام نہایت احتیاط سے پرچہ روانہ کیا جاتا ہے، اس لئے نہ پہونچنے کی صورت میں یہ خیال کبھی دل میں نہ لائیے کہ یہاں سے پرچہ نہیں بھیجا گیا۔ بلکہ اس کا سبب یا تو محکمۂ ڈاک کی غلطی ہوتی ہے یا تو خود آپ کے پتہ کی عدم صحت!

جو حضرات جنوری کے پرچہ کو ذریعہ رجسٹری طلب کرنا چاہیں، وہ تین آنے کے ٹکٹ بھیجدیں اور اپنا نمبر خریداری لکھ بھیجیں جو ہر ماہ پتہ کی چٹ پر بائیں طرف درج ہوتا ہے۔

ہنگامۂ ستیارتھ پرکاش

ستیارتھ پرکاش کا نام میں عرصہ سے سنتا آرہا تھا، لیکن اس کو دیکھنے کی نوبت کبھی نہ آئی تھی۔ اس دوران میں جب پنجاب اور سندھ کی طرف مسلمانوں میں زیادہ بے چینی پیدا ہوئی، تو میں نے اُسے منگا کر پڑھا۔

میں سمجھتا تھا کہ اس کا چودھواں باب واقعی کوئی بڑی اہم چیز ہوگا، لیکن اس کے دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ واقعی "ہفوات" سے زیادہ نہیں اور "ہفوات" کی طرف توجہ کرنا سنجیدگی کے خلاف ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ سندھ گورنمنٹ نے اس کے چودھویں باب کو اپنے حدود میں ممنوع قرار دیکر بڑھا دیا۔ اگر مسلمانوں کی جماعت اس کتاب کو قابل اعتنا نہ سمجھتی تو غالباً آریہ جماعت کو اس بات کا موقعہ نہ ملتا کہ وہ اس کا اتنا وسیع پروپاگنڈا کر سکتے۔

چودھواں باب پنڈت دیانند سرسوتی کا لکھا ہوا ہو یا کسی اور کا، یکسر طفلانہ چیز ہے اور اس پر بگڑنا بالکل ایسا ہی ہے، جیسے بچوں یا دیوانوں کی باتوں پر خفا ہونا ۔ ہر معمولی قسم کا انسان اس کو دیکھ کر سمجھ سکتا ہے کہ اس باب کا لکھنے والا عربی زبان کا معمولی علم بھی نہ رکھتا تھا اور اس نے شاید یہ سب کچھ اسی لئے کیا کہ مسلمان برہم ہوں اور وہ ان کی برہمی سے فایدہ اٹھا کر جماعتی پروپاگنڈا زیادہ قوت و شدت کے ساتھ کر سکے۔

افسوس ہے کہ مسلمانوں کی جماعت جو شدید ترین اشتعال کی صورت میں بھی سنجیدگی ہاتھ سے نہ دینے میں کافی شہرت رکھتی تھی، اب اس حد تک پست خیال ہو گئی ہے کہ وہ "ستیارتھ پرکاش" ایسی لغو و مہمل کتاب کو دیکھ کر اپنے آپ سے باہر ہو جاتی ہے۔ یہ نتیجہ ہے مسلمانوں کی اس سطحی ذہنیت کا جو نہ صرف مذہب بلکہ اُن کی زندگی کے ہر شعبہ میں پیدا ہو گئی ہے اور اس سے ہمارے اکابر قوم فایدہ اُٹھا کر اس میں اور اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

ستیارتھ پرکاش، دوسرے مذاہب کی تحقیق کے لحاظ سے نہایت ادنیٰ درجہ کی چیز ہے، اور دیگر مذاہب کے اکابر و اعاظم کے متعلق جو لب و لہجہ اس میں اختیار کیا گیا ہے، وہ خود اس کے نامقبول ہونے کا بڑا سبب ہے ۔۔ ابھی نہیں لیکن ایک زمانہ آئے گا جب اس قسم کی کتابیں محض اسی بنا پر مردود قرار دیجائیں گی کہ ان کی زبان، ان کا لب و لہجہ اور ان کا طرزِ استدلال انسانوں کے سامنے پیش کرنے کی چیز نہ تھا۔

التمش کے مذہبی رجحانات

سلطان شمس الدین التمش اسلامی ہند کا پہلا خود مختار فرمانروا تھا۔ اُس نے تقریباً پچیس سال تک نہایت شان و شوکت، جلال و جبروت کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کی۔ اُس کے دربار کی رونق محمود و سنجر کے دربار کی یاد تازہ کرتی تھی۔[1] شجاعت و تہور کا یہ عالم تھا کہ سارا ملک اُس کی جہانکشایانہ ہمت کا بازیچہ بن گیا تھا۔ اُس کی قشونِ قاہرہ نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اسلامی پرچم لہرا کر ایک نظامِ نو کا پیغام سنایا تھا۔ انتظام و انصرام کی صلاحیت اسدرجہ تھی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہندوستان کے منتشر اور ضعیف البنیاد اسلامی مقبوضات کو یکجا کر کے ایک مستقل اور مستحکم سلطنت کے قالب میں ڈھال دیا ـــــ التمش کی زندگی کا یہ صرف ایک رُخ ہے۔ سیاسی اعتبار سے جہاں اُس کا عہد تاریخ ہند میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے وہاں مذہبی حیثیت سے بھی اُس کا عہد نہایت تابناک ہے۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قایم ہونا تھا کہ بغداد و بخارا کے مذہبی حلقوں میں ایک حرکت پیدا ہوئی۔ صوفیاء اور مشائخ جوق درجوق اس ملک میں وارد ہونے شروع ہوگئے۔ اسلامی تہذیب و تمدن کی ترویج کے لئے جو جد و جہد اس زمانہ میں کی گئی وہ خود ایک علٰحدہ مستقل تصنیف کا مبحث بن سکتی ہے۔ فی الحال میرا مقصد التمش کی زندگی کے مذہبی پہلو پر بحث کرنا اور یہ دکھانا ہے کہ اس مذہبی ماحول نے اس کے افکار و اعمال کو کس حد تک متاثر کیا تھا۔

کسی انسان کے افکار و اعمال کو سمجھنے کے لئے اُس کے ماحول کا صحیح اندازہ لگانا بیحد ضروری ہے۔ ہر انسان ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ اُس کے افکار و اعمال، عادات و اطوار، حالاتِ گرد و پیش کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ جس چیز کو "کیرکٹر" کہا جاتا ہے وہ ماحول ہی کے دامن میں پرورش پاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ التمش کے مذہبی احساس و شعور کے تدریجی ارتقا کا اندازہ لگانے کے لئے ہم ہندوستان سے ہٹ کر اُسے بغداد و بخارا کے مذہبی مرکزوں میں دیکھیں

التمش بخارا میں

التمش نو یا دس برس کا ہوگا کہ اُس کے حاسد بھائی بخارا کے بازار میں فروخت کرنے کے لئے لائے یہاں صدر جہاں کے ایک عزیز نے اسے خرید لیا۔ یہ خاندان تقدس و طہارت کے لئے مشہور تھا منہاج السراج نے اسے خاندان "امارت و تصدر" لکھا ہے اور اس کی "بزرگی و طہارت" کی تعریف کی ہے۔ یہاں التمش کی تعلیم و تربیت بالکل اپنی اولاد کی طرح کی گئی۔ گھر کا ہر چھوٹا اور بڑا اُس سے محبت و موت سے پیش آتا تھا۔ التمش اسی خاندان میں تھا کہ ایک معمولی سا واقعہ پیش آیا لیکن اس واقعہ نے اُس کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ ایکدن صاحبِ خانہ

---

[1] "درگاہ سلطان شمس الدین درگاہ محمودی و سنجری شدہ بود"۔ برنی۔ تاریخ فیروز شاہی ص۲۱ (مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی)

نے بازار سے انگور خریدنے کے لئے بھیجا۔ التمش بچہ تو تھا ہی کہیں راستہ میں پیسے کھو دئے اور بازار میں کھڑا ہو کر رونے لگا ایک فقیر اس طرف سے گزرا، التمش کو روتا ہوا دیکھ کر وجہ پوچھی اور حال معلوم ہونے پر اپنے پاس سے انگور خرید کر دئے۔ چلتے وقت کہا " دیکھو جب تم صاحب دولت ہو جاؤ تو فقیروں اور درویشوں کا احترام کرنا اور اُن کے حقوق کی پاسبانی اپنا فرض جاننا" التمش نے وعدہ کیا اور اپنے گھر آگیا۔ کہنے کو تو یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے۔ لیکن التمش کو اپنی عمر میں فقراء و مشائخ سے جو بے پناہ عقیدت رہی اس کی بنیاد در اصل اسی دن رکھی گئی تھی۔ تخت نشین ہونے کے بعد وہ یہ واقعہ اکثر بیان کرتا تھا، اور کہا کرتا تھا کہ " ہر دولت و سلطنت کہ یافتم از نظر آں درویش یافتم"[1]

بغداد میں التمش بخارا میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد بغداد پہونچا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بغداد میں جس خاندان سے وہ متعلق رہا اُس کے افراد مذہبی معاملات میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ التمش کا آقا کبھی کبھی اپنا مکان درویشوں کو محفل سماع منعقد کرنے کے لئے دیدیا کرتا تھا۔ ایک شب کو اس مکان میں محفل آراستہ تھی۔ بڑے بڑے درویش اور مشائخ موجود تھے۔ قاضی حمید الدین ناگوری اس مجلس کے عمائدین میں سے تھے۔ التمش تمام رات ان بزرگوں کی خدمت میں حاضر رہا اور شمع کا سر گلگیر سے کاٹتا رہا۔[2]

جس زمانہ میں التمش بغداد میں تھا۔ بڑے بڑے صاحب کمال بزرگ وہاں موجود تھے۔ ہندوستان آنے والا روحانی قافلہ ابھی بغداد ہی میں قیام کر رہا تھا۔ بغداد اس وقت ایک زبردست روحانی مرکز بنا ہوا تھا۔ جگہ جگہ خانقاہیں قایم تھیں جن سے فیضان الٰہی کے چشمے اُبل رہے تھے۔ مسجد لنکری۔ مسجد ابو اللیث سمرقندی مسجد جنید بغدادی میں صوفیا و مشائخ کے جمگھٹے لگے رہتے تھے۔ کسی خانقاہ میں سعدی کا "مرشد شہاب" تزکیۂ نفس و اخلاق کا درس دے رہا تھا تو کسی مسجد میں ہندوستان کا روحانی سلطان (خواجہ چشتی) معرفت و حقیقت کے دریا بہا رہا تھا۔ مولانا عماد الدین، شیخ اوحد الدین کرمانی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور دیگر بزرگان ملت کے فیضان صحبت سے ہزاروں تشنگانِ معرفت سیراب ہو رہے تھے۔ التمش بھی اسی روحانی ماحول میں سانس لے رہا تھا۔ چنانچہ ایک دن کچھ پیسے لیکر حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی خانقاہ میں حاضر ہوا۔ مودب بیٹھ گیا اور بٹوے میں سے پیسے نکالکر شیخ الشیوخ کی خدمت میں پیش کئے۔ حضرت نے فاتحہ پڑھی اور پھر فرمایا:

" من در چہرۂ ایں شخص انوار سلطنت لامع می بینم"

شیخ اوحد الدین کرمانی بھی اس وقت موجود تھے۔ التمش کی طرف دیکھ کر فرمانے لگے:

" از برکت شما در سلطنت دنیوی دینش ہم سلامت باشد"[3]

ملفوظاتِ قطب صاحب میں بھی اسی قسم کے ایک واقعہ کا ذکر ہے۔ لکھا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور دیگر صوفیائے کرام ایک جگہ تشریف فرما تھے۔ التمش ایک کمان ہاتھ میں لئے ہوئے اُس طرف سے گزرا۔ ان بزرگوں کی نظر پیر

---

[1] "طبقات ناصری"۔ منہاج السراج (مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ) صفحہ ۱۶۷ [2] "تاریخ فرشتہ" جلد اول صفحہ ۲۰۳ اردو (مطبوعہ نولکشور)

[3] "سیر العارفین" حامد بن فضل اللہ المعروف بہ درویش جمالی۔ در عہد ہمایوں بادشاہ صفحہ ۱۷ (قلمی نسخہ)

پڑی - فوراً خواجہ صاحب کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے:

"ایں کودک بادشاہ دہلی خواہد شد"[1]

بچپن کے یہ واقعات التمش کی آیندہ زندگی کو سمجھنے کے لئے پس منظر کا کام دیتے ہیں۔ بچپن میں ماحول سے اثر پذیر ہونے کی صلاحیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں دماغ پر جو نقوش ثبت ہو جاتے ہیں وہ عمر بھر قایم رہتے ہیں۔ انسان کے افکار و خیالات کے اساس یہی نقوش اول ہوتے ہیں۔ التمش کے ایام طفلی مذہبی ماحول میں بسر ہوئے تھے۔ بخارا و بغداد کے جن خانوادوں میں وہ رہا وہ مذہبی معاملات میں بیحد شغف رکھتے تھے۔ ناممکن تھا کہ ایسے لوگوں کی صحبت میں رہنے کے بعد بھی اُس پر مذہبی رنگ نہ چڑھتا۔ صوفیوں کی مجلسوں میں تمام رات کھڑے رہنا۔ خانقاہوں میں قراضۂ سیم و زر لیکر حاضر ہونا، بازاروں میں فقیروں سے اچھے سلوک کے وعدے کرنا۔ یہ تمام باتیں اُس کے ذہنی رجحان کا پتہ دیتی ہیں۔ لہذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ چشتیہ اور سہروردیہ بزرگوں کی مجلسوں سے قلب و جگر میں ایک حرارت لیکر وہ ہندوستان میں داخل ہوا۔

تخت نشین ہونے کے بعد بغداد کی گلیوں میں گھومنے والا یہ لڑکا، ایک دن قرون وسطی کی سب سے بڑی سلطنت کا مالک ہوا۔ مذہب کی جو عظمت بچپن میں اُس کے دل میں قایم ہو چکی تھی اُس نے ہمیشہ اُسے مذہب کا پابند بنائے رکھا۔ سیاسی اُلجھنیں اُس کے مذہبی کاموں میں رکاوٹ نہ بن سکیں۔ چنانچہ انتہائی سیاسی مصروفیتوں میں بھی وہ اپنے فرائض مذہبی کو نہ بھولتا تھا۔ پانچوں وقت کی باجماعت نماز ادا کرتا۔ مہمات کے زمانہ میں بھی نماز قضا نہ ہوتی تھی۔ نماز کا خاص انتظام اور اہتمام تھا۔ واعظ اور امام مہمات میں اُس کے ہمراہ رہتے تھے مولانا منہاج السراج نے اوچہ کے محاصرہ کے دوران میں خیمۂ شاہی میں وعظ کہے[2]۔ سلطان کا معمول تھا کہ ہفتہ میں تین بار وعظ سنا کرتا تھا۔ ماہ رمضان میں روزانہ مجلس وعظ منعقد ہوا کرتی تھی[3]۔ قصر شاہی میں علماء و مشائخ کے جلسے ہوتے تھے اور اُن میں مذہبی معاملات پر بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ اُس کے دربار میں علماء و مشائخ کا ایسا شاندار اجتماع رہتا تھا کہ وہ رونق پھر دہلی کے کسی دربار کو نصیب نہیں ہوئی۔ بلبن اکثر ان بزرگوں کا ذکر کرتا اور کہتا تھا کہ اس طہارت اور بزرگی کے مشائخ کو نہ کبھی اُس نے دیکھا اور نہ سُنا[4]۔ سید نور الدین مبارک غزنوی اکثر التمش کے دربار میں تشریف لایا کرتے تھے۔ انھوں نے سلطان کو مسلمان بادشاہ کے فرائض سے آگاہ کیا۔ "لوازم اُمور بادشاہی" پر نہایت دلکش انداز میں انھوں نے لکچر دیے[5]۔ بہیں ایک مجلس میں اُن کا مولانا نظام الدین ابوالمؤید سے جھگڑا ہوا تھا[6]۔ سماع کے متعلق جہاں اکثر علماء و صوفیا میں بحثیں ہوئی ہیں۔ جمعہ کے دن بعد نماز خاص طور سے ایک مجلس منعقد ہوا کرتی تھی جس میں اکابر و اشراف و مشائخ شریک ہوا کرتے تھے[7]۔

---

[1] "فوائد السالکین" ملفوظات حضرت قطب الدین بختیار کاکی از شیخ بابا فرید گنج شکر ص ۔ ب (قلمی نسخہ) و "مونس الارواح" از شہزادی جہاں آرا بیگم ص ۔ ب (قلمی نسخہ) — [2] "طبقات ناصری" منہاج السراج (فارسی) ص ۱۷۲ (ایشیاٹک سوسائٹی) — [3] "طبقات ناصری" منہاج السراج (فارسی) ص ۱۷۲ — [4] "تاریخ فیروز شاہی" ضیاء الدین برنی ص ۔ ۔ و ۔ (مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی) — [5] "امیر الاولیا" ملفوظات بلتقریر مولانا بدر الدین اسحاق ص ۔ ب (قلمی نسخہ) "اخبار الاخیار" مولانا عبدالحق محدث دہلوی ص ۔ (مطبوعہ دہلی) "تاریخ فرشتہ" جلد دوم ص ۔ — [6] "سیر العارفین" — [7] "دولت جمالی" ص ۔

شب بیداری

التمش کی مذہبی دلچسپیاں روز افزوں ترقی پر تھیں۔ مذہب سے اُس کو ایک خاص لگاؤ پیدا ہو گیا تھا عشق حقیقی کی وہ آگ جو بغداد میں اُس کے سینہ میں اول روشن ہوئی تھی اب اس طرح بھڑک اُٹھی تمام رات بارگاہِ رب العزت میں سرِ نیاز جھکائے بیٹھا رہتا۔ دن بھر سلطنت کے معاملات میں مصروف رہتا۔ شام ہوتی اور نماز پر جا بیٹھتا۔ حضرت بابا فرید گنجشکر نے ملفوظات حضرت قطب صاحب میں اُس کے متعلق لکھا ہے:

"از حد صاحب اعتقاد بود کہ شبہا بیدار بودے کہ وقتے اورا کسے در خواب ندید ... گر در عالم تحیر ایستادہ واگر قدرے خواب کردے ہماں زماں بیدار شدے و خود برخاستے و آب گرفتے، وضو ساختے و بر مصلےٰ قرار گرفتے و ہیچ یکے از خدمتگاراں وغیرہ بیدار نہ کردے و گفتے کہ آسودگاں را چرا در رنج آرم"[۱]

یہی شب بیداری اُس کے لئے چراغ راہ بن گئی۔ تصوف کی تمام دشوار گزار منزلیں اسی کی مدد سے طے کر گیا۔ خواجہ عثمان ہارونی جب اپنے مرید خواجہ معین الدین چشتی سے ملنے کے لئے ہندوستان تشریف لائے تو اُن کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سلطان معرفت و حقیقت کی سب منزلیں طے کر کے "انسان کامل"[۲] کے درجہ کو پہونچ چکا ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی نے "گنج الاسرار" میں[۳] تحریر فرمایا ہے:

"سلطان شمس الدین طالب صادق برائے ملاقات حضرتِ خواجہ عثمان ہارونی آمد۔ بعد ملاقات متکلم شد بسوگند سوال کرد و گفت بحق آں خدائے کہ شمارا جاں دادہ و براہ حقیقت سوئے معرفت حق تعالیٰ راہ راست نمودہ است بصدق آمدہ ام مارا راہ حقیقت سوئے معرفت حق تعالیٰ پیوستن استقامت قوت حضرت راہ راست نمایند و بلطف بیعت ارادت از تربیت قبول کنید۔ بدانکہ چوں خواجہ عثمان ہارونی، سلطان را طالب صادق و انسان کامل بشناخت بعد صحبت تربیت کلاہ ارادت حوالت کرد"[۴]

اولیاء و مشائخ سے عقیدت

التمش نے بخارا میں جو وعدہ فقیر سے کیا تھا اُس کے ایفاء ... جس جوش و خروش کا ثبوت دیا وہ تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ صاحب خزینۃ الاصفیاء نے صحیح لکھا ہے: "اگرچہ بظاہر تعلق بادشاہی داشت لیکن از دل فقیر و فقیر دوست بود"[۵]۔ علماء و مشائخ سے اُسے بے انداز

۱۔ "فوائد السالکین" ص۱۹ — ۲۔ "انسان کامل" کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو: Nicholson: Studies in Islamic Mystic

۳۔ "گنج الاسرار" - خواجہ معین الدین چشتی کی تصنیف ہے۔ اس کا ایک بہت پرانا نسخہ ... کے قلمی کتب خانہ میں موجود ہے۔ بدقسمتی سے تاریخ کتابت کہیں درج نہیں ہے۔ وجہ تصنیف مصنف نے یہ بتائی ہے:-

"خواجہ عثمان ہارونی رحمۃ اللہ علیہ مر خدام درویشاں اضعف العباد معین الدین حسن سنجری را فرمود کہ برائے استقامت تربیت طالب صادق سلطان شمس الدین ۔ ۔ ۔ ۔ از آیات و حدیثات و قول مشائخ رحمۃ اللہ علیہم در تعریفات معانی ابیات نظمات منقولات اولیا راز مستحبات کبار ملفوظات بیعت کن کہ در سفر ملازمت کند تا دل سلطان از تفرقہ خطرات غیر اللہ تعالیٰ کلی باز آید ۔ ۔ ۔ ۔" — ۴۔ گنج الاسرار کے اس بیان کی تصدیق فرشتہ سے بھی ہوتی ہے۔ لکھتا ہے: "حاجی محمد قندھاری کی تاریخ میں مرقوم ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی کے پیر شیخ عثمان ہارونی شمس الدنیا محمد التمش کے عہد میں تشریف لائے اور شمس الدین نے جو آنحضرت کا مرید تھا اُن کی تعظیم و تکریم میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا" تاریخ فرشتہ - جلد دوم (نولکشور)

۵۔ "خزینۃ الاصفیا" - غلام سرور جلد اول ص۲۷۶ (نولکشور)

پڑی - فوراً خواجہ صاحب کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے:

"ایں کودک بادشاہ دہلی خواہد شد"[۱]

بچپن کے یہ واقعات التمش کی آیندہ زندگی کو سمجھنے کے لئے پس منظر کا کام دیتے ہیں۔ بچپن میں ماحول سے اثر پذیر ہونے کی صلاحیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں دماغ پر جو نقوش ثبت ہو جاتے ہیں وہ عمر بھر قایم رہتے ہیں۔ انسان کے افکار و خیالات کے اساس یہی نقوش اول ہوتے ہیں۔ التمش کے ایام طفلی مذہبی ماحول میں بسر ہوئے تھے۔ بخارا و بغداد کے جن خانوادوں میں وہ رہا وہ مذہبی معاملات میں بیحد شغف رکھتے تھے۔ ناممکن تھا کہ ایسے لوگوں کی صحبت میں رہنے کے بعد بھی اُس پر مذہبی رنگ نہ چڑھتا۔ صوفیوں کی مجلسوں میں تمام رات کھڑے رہنا۔ خانقاہوں میں قراضۂ سیم و زر لیکر حاضر ہونا، بازاروں میں فقیروں سے اچھے سلوک کے وعدے کرنا — یہ تمام باتیں اُس کے ذہنی رجحان کا پتہ دیتی ہیں۔ لہذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ چشتیہ اور سہروردیہ بزرگوں کی مجلسوں سے قلب و جگر میں ایک حرارت لیکر وہ ہندوستان میں داخل ہوا۔

تخت نشین ہونے کے بعد بغداد کی گلیوں میں گھومنے والا یہ لڑکا، ایک دن قرون وسطیٰ کی سب سے بڑی سلطنت کا مالک ہوا۔ مذہب کی جو عظمت بچپن میں اُس کے دل میں قایم ہو چکی تھی اُس نے ہمیشہ اُسے مذہب کا پابند بنائے رکھا۔ سیاسی اُلجھنیں اُس کے مذہبی کاموں میں رکاوٹ نہ بن سکیں۔ چنانچہ انتہائی سیاسی مصروفیتوں میں بھی وہ اپنے فرائض مذہبی کو نہ بھولتا تھا۔ پانچوں وقت کی باجماعت نماز ادا کرتا۔ مہمات کے زمانہ میں بھی نماز قضا نہ ہوتی تھی۔ نماز کا خاص انتظام اور اہتمام تھا۔ واعظ اور امام مہمات میں اُس کے ہمراہ رہتے تھے مولانا منہاج السراج نے اوچہ کے محاصرہ کے دوران میں خیمۂ شاہی میں وعظ کہے[۲]۔ سلطان کا معمول تھا کہ ہفتہ میں تین بار وعظ سنا کرتا تھا۔ ماہ رمضان میں روزانہ مجلس وعظ منعقد ہوا کرتی تھی[۳]۔ قصر شاہی میں علماء و مشائخ کے جلسے ہوتے تھے اور اُن میں مذہبی معاملات پر بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ اُس کے دربار میں علماء و مشائخ کا ایسا شاندار اجتماع رہتا تھا کہ وہ رونق پھر دہلی کے کسی دربار کو نصیب نہیں ہوئی۔ بلبن اکثر ان بزرگوں کا ذکر کرتا اور کہتا تھا کہ اس طہارت اور بزرگی کے مشائخ کو نہ کبھی اُس نے دیکھا اور نہ سنا[۴]۔ سید نور الدین مبارک غزنوی اکثر التمش کے دربار میں تشریف لایا کرتے تھے۔ انھوں نے سلطان کو مسلمان بادشاہ کے فرائض سے آگاہ کیا۔ "لوازم امور بادشاہی" پر نہایت دلکش انداز میں انھوں نے لکچر دیے[۵]۔ یہیں ایک مجلس میں اُن کا مولانا نظام الدین ابوالموید سے جھگڑا ہوا تھا[۶]۔ سماع کے متعلق جہاں اکثر علماء و صوفیا میں بحثیں ہوتی ہیں۔ جمعہ کے دن بعد نماز خاص طور سے ایک مجلس منعقد ہوا کرتی تھی جس میں اکابر و اشراف و مشائخ شریک ہوا کرتے تھے[۷]۔

---

[۱] "فوائد السالکین" — ملفوظات حضرت قطب الدین بختیار کاکی از شیخ بابا فرید گنج شکر ص۱ ب (قلمی نسخہ) و "مونس الارواح" — از شہزادی جہاں آرا بیگم ص۱۶ ب (قلمی نسخہ) — [۲] "طبقات ناصری" — منہاج السراج (فارسی) ص۱۷۳ (ایشیاٹک سوسائٹی) — [۳] "طبقات ناصری" منہاج السراج (فارسی) ص۱۶۸ — [۴] "تاریخ فیروز شاہی" — ضیاء الدین برنی ص۴۶ — [۵] ص۴۱ و ص۴۲ (مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی) — [۶] "سیر الاولیاء" ملفوظات بلقرید الاولیاء مولانا بدرالدین اسحاق ص۱۱ ب (قلمی نسخہ) و "اخبار الاخیار" — مولانا عبدالحق محدث دہلوی ص۲۸ (مطبوعہ دہلی) و "تاریخ فرشتہ" جلد دوم ص۳۸۷ — [۷] "سیر العارفین" — درویش جمالی ص۱۳

...شب بیداری

التمش کی مذہبی دلچسپیاں روزافزوں ترقی پر تھیں۔ مذہب سے اُس کو ایک خاص لگاؤ پیدا ہوگیا تھا عشقِ حقیقی کی وہ آگ جو بغداد میں اُس کے سینہ میں اول روشن ہوئی تھی اب اس طرح بھڑک اُٹھی ...ام رات بارگاہِ ربُّ العزت میں سرِ نیاز جُھکائے بیٹھا رہتا۔ دن بھر سلطنت کے معاملات میں مصروف رہتا۔ شام ہوتی اور ...ماز پر جا بیٹھتا۔ حضرت بابا فرید گنجشکر نے ملفوظات حضرت قطب صاحب میں اُس کے متعلق لکھا ہے:

"از حد صاحب اعتقاد بود کہ شبہا بیدار بودے کہ وقتے اورا کسے درخواب ندیدے۔ [1] در عالم تحیر ایستادہ و اگر قدرے خواب کردے ہمانزماں بیدار شدے وخود برخاستے و آب گرفتے، وضو ساختے و بر مصلے قرار گرفتے و ہیچ یکے از خدمتگاراں وغیرہ بیدار نہ کردے و گفتے کہ آسودگان را چرا در رنج آرم" [1]

...یہ شب بیداری اُس کے لئے چراغ راہ بن گئی۔ تصوف کی تمام دشوار گزار منزلیں اسی کی مدد سے طے کرگیا۔ خواجہ عثمان ہارُنی ... اپنے مرید خواجہ معین الدین چشتی [2] سے ملنے کے لئے ہندوستان تشریف لائے تو اُن کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سلطان معرفت و ...یقت کی سب منزلیں طے کرکے "انسان کامل" کے درجہ [3] کو پہونچ چکا ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی نے "گنج الاسرار" میں [4] ...ریر فرمایا ہے:

"سلطان شمس الدین ... طالب صادق برائے ملاقات حضرت خواجہ عثمان ہارونی آمد۔ بعد ملاقات متکلم شد بسوگند سوال کرد وگفت بحق آں خدائے کہ شمارا جان دادہ و براہ حقیقت سوئے معرفت حق تعالیٰ راہ راست نمودہ است بصدق آمدہ ام مارا راہ حقیقت سوئے معرفت حق تعالیٰ بپیوستن استقامت قوت حضرت راہ راست نمایند و بلطف بیعت ارادت از تربیت قبول کنید۔ بدانکہ چوں خواجہ عثمان ہارونی، سلطان را طالب صادق و انسان کامل بشناخت بعد صحبت تربیت کلاہ ارادت حوالت کرد" [5]

...لیاء و مشائخ سے عقیدت

التمش نے بخارا میں جو وعدہ فقیر سے کیا تھا اُس کے ... تک ... خروش کا ثبوت دیادہ تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ صاحب خزینۃ الاصفیا نے ...ع لکھا ہے: "اگرچہ بظاہر تعلق بادشاہی داشت لیکن از دل فقیر و فقیر دوست بود" [6] علماء و مشائخ سے اُسے بے انداز...

---

[1] "فوائد السالکین" صفحہ ۱۰ — [2] "انسان کامل" کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو: Nicholson: Studies in Islamic Mystic...

[3] "گنج الاسرار" — خواجہ معین الدین چشتی کی تصنیف ہے۔ اس کا ایک بہت پُرانا نسخہ ...ے قلمی کتب خانہ میں موجود ہے۔ بدقسمتی سے تاریخ کتابت کہیں درج نہیں ہے۔ وجہ تصنیف مصنف نے یہ بتائی ہے:-

"خواجہ عثمان ہارونی رحمۃ اللہ علیہ مرخدام درویشاں اضعف العباد معین الدین حسن سنجری را فرمود کہ برائے استقامت تربیت طالب صادق سلطان شمس الدین ... از آیات و حدیثات و قول مشائخ رحمۃ اللہ علیہم در تعریفات معانی ابیات فظمات منقولات اولیا راز سخنہا و کبار ملفوظات ...یعت کن کہ درسفر ملازمت کند تا دل ساداں از تفرقہ خطرات غیر اللہ تعالیٰ کلی باز آید ..." — [4] گنج الاسرار کے اس بیان کی تصدیق فرشتہ سے بھی ...ہے۔ لکھتا ہے: "حاجی محمد قندھاری کی تاریخ میں مرقوم ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی کے پیر شیخ عثمان ہارونی شمس الدنیا محمد التمش کے عہد میں ...تشریف لائے اور شمس الدین نے جو آنحضرت کا مرید تھا اُن کی تعظیم و تکریم میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا" تاریخ فرشتہ۔ جلد دوم (نولکشور)

[5] "خزینۃ الاصفیا" — غلام سرور، جلد اول صفحہ ۲۷۶ (نولکشور)

عقیدت تھی۔ حضرت باباصاحب نے لکھا ہے کہ وہ رات کو صرقہ پہن کر مسجدوں اور خانقاہوں میں جاتا تھا اور درویشوں اور محتاجوں کو روپے تقسیم کرتا تھا[1]۔ منہاج السراج نے لکھا ہے:

"غالب ظن آں است کہ ہرگز بادشاہی بحسن اعتقاد وآب دیدہ و تعظیم علماء و مشائخ مثل آوازہ در خلقت در قماط سلطنت نیامد"[2]

اس زمانہ میں سیکڑوں بزرگ درہ خیبر سے ہوکر ہندوستان آرہے تھے۔ سلطان شمس الدین نے نہایت جوش و خروش سے اُن کا استقبال کیا۔ جب کسی بزرگ کی آمد کی خبر سنتا تو میلوں تک استقبال کے لئے نکل جاتا۔ نہایت عزت و احترام سے محل شاہی میں لاتا اور مہمان رکھتا۔ قطب صاحب جب ملتان سے دہلی تشریف لائے تو اُن کا نہایت پرجوش خیر مقدم کیا کچھ عرصہ بعد جب شیخ جلال الدین تبریزی بغداد سے دہلی آئے تو سلطان اُن کے استقبال کے لئے گیا۔ اور شیخ کو دیکھتے ہی گھوڑے سے اُتر کر ملنے کے لئے دوڑا[3]۔ اُن کو محل کے قریب نہایت عزت و احترام سے ٹھیرایا۔ قاضی حمید الدین ناگوری اس عہد کے بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ اُن سے بھی سلطان کو بڑی عقیدت تھی۔ اپنے خواہرزادہ سعد الدین کو قاضی صاحب کی خدمت میں بھیجکر مرید کرایا[4]۔ ایک مرتبہ دہلی میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے غلہ بہت گراں ہوگیا۔ لوگ بہت پریشان ہوئے التمش نے اپنے ایک درباری کو بلایا اور کہا:

"برو درویشان اہل اللہ را کہ دریں شہر اند، از ما سلامے و نیازے برساں و عرض دار کہ دفع ظالم و کفار و فتنہ کار بادشاہان است، ما دراں تقصیر نداریم، و توجہ باطن بحق تبارک و تعالیٰ و دعائے خیر خلائق خاص دعام حق شما است، توجہ بحق نمائید و دعائے استسقا فرمائید تا از برکت اخلاص دعا و توجہ شما حق تعالیٰ کرم فرماید و باران رحمت عطا فرماید"[5]

حضرت قطب صاحب اور التمش

شیخ قطب الدین بختیار کاکی سے التمش کو خاص عقیدت تھی۔ جب حضرت ملتان سے دہلی تشریف لائے تو حاضر ہوکر عرض کی کہ محل شاہی میں فروکش ہوں۔ لیکن قطب صاحب نے انکار کردیا تو عقیدت و محبت کا یہ عالم تھا کہ ہفتہ میں کئی بار حضرت سے ملنے کے لئے شہر سے باہر حضرت کی قیام گاہ پر جایا کرتا تھا[6]۔ قطب صاحب نے شروع ہی میں نصیحت کی تھی:

"اے والیِ دہلی باید کہ با غریباں و فقیراں و درویشاں و مسکیناں نیکو باشی و با خلق نیکوئی کنی و رعیت پرور باشی، ہر کہ با رعیت رعایت کند، با خلق نیکوئی کند خدائے تعالیٰ او را نگاہ دارد و جملہ اعداء او دوست دارند"[7]

---

[1] "فوائد السالکین" – بابا فرید ص۹۱ — [2] "طبقات ناصری" – ص۱۷۶ — [3] "سیر العارفین" – درویش جمالی ص۱۲ (قلمی) — [4] "رسالہ حال خانوادۂ چشت" ص۲۰ – یہ مولانا تاج الدین نبیرہ مولانا شہاب الدین امام کی تصنیف ہے – مولانا شہاب الدین، حضرت نظام الدین اولیا کے امام تھے۔ امیر خسرو نے اُن کے متعلق لکھا ہے:

اوچو ابر کرم بفرق یہاں — زیرکان چوں صدف کشادہ دہاں

شمع من یافتہ ضیاء از وے — مس من گشتہ کیمیا از وے

اس کا ایک پرانا نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ جس کا سنہ کتابت ۱۱۰۰ھ ہے کتاب پر گئی جگہ احمد علی شاہ کے کتب خانہ کی مہریں ہیں۔ ص۹۹ [5] "سیر العارفین" [6] "جواہر فریدی" – مصنفہ علی اصغر در عہد جہانگیر ص۲۸۳، فرشتہ جلد دوم مونس الارواح — [7] "رسالہ حال خانوادہ چشت" – مولانا تاج الدین ص۱۳

سلطان نے اس نصیحت پر جس طرح سے عمل کیا آج ہم اُس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ قطب صاحب سے اُس کی عقیدت روز بروز بڑھتی گئی۔ مولانا جمال الدین محمد بسطامی کے انتقال پر حضرت قطب صاحب سے درخواست کی کہ شیخ الاسلام[1] کے عہدہ کو قبول فرمائیں۔ حضرت نے انکار کر دیا[2] تو شیخ نجم الدین صغریٰ کو اس عہدہ پر مقرر کر دیا۔ نجم الدین صغریٰ نے جب قطب صاحب کے یہاں عقیدت مندوں کا ایک ہجوم دیکھا تو حسد کی آگ بھڑک اُٹھی اور نقصان پہونچانے کی فکر میں لگ گیا اسی زمانہ میں خواجہ معین الدین چشتی دہلی تشریف لائے۔ صغریٰ کے اس طرز عمل کو وہ بھی برداشت نہ کر سکے اور جب اجمیر واپس ہوئے تو قطب صاحب کو بھی ہمراہ لے چلے۔ تمام دہلی میں کہرام مچ گیا۔ التمش بھی سخت پریشان ہوا۔ خود بھی ان دونوں بزرگوں کے پیچھے روانہ ہوا۔ خواجہ اجمیری نے جب سلطان و عوام کو یکساں طور پر مضطرب دیکھا تو کہا "بابا بختیار! تم یہیں مقام کرو۔ خلقت تمھاری جدائی سے سخت پریشان ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس قدر دل خراب اور کباب ہوں"۔ التمش خوش ہو گیا اور خواجہ اجمیری کی قدمبوسی کر کے قطب صاحب کو لیکر دہلی واپس آیا۔[3]

اب قطب صاحب کی خدمت میں سلطان اکثر حاضر رہنے لگا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ (قطب صاحب فرماتے ہیں)۔

"شبے از شبہا بر دعا گو بیامد و پائے دعا گو گرفتہ ماند۔ گفتم چہ رنج داری۔ ہر حاجتے کہ داری بگو۔ گفت حاجت! آں ہمی دارم چنانچہ بہ لطف از حضرت خداوند ایں مملکت دہانیدہ، چوں فردا قیامت شود مارا بکدام طائفہ بگرداند"[4]

دہلی کا وہ سلطان جس کے پاؤں فتح و نصرت نے قدم قدم پر چومے تھے، جس کی شجاعت کو دیکھ کر امیر روحانی بے اختیار پکار اُٹھا تھا ؎

شہ مجاہد و غازی کہ دست تیغش را — روان حیدر کرار میکند تحسیں

اسی حالت میں حضرت کے پاؤں پکڑے ہوئے اُس وقت تک بیٹھا رہا جب تک حضرت نے یہ نہ کہدیا کہ "اے شمس الدنیا والدین! آنے والی دُنیا میں بھی تیرا مرتبہ بلند ہے"۔ کاش اُس وقت قطب صاحب کی طرف دیکھ کر کوئی امیر خسرو کے یہ شعر پڑھتا:

در حجرۂ فقر بادشا ہے — در عالم دل جہاں پنا ہے
شاہنشہے بے سریر و بے تاج — شاہانش بخاکپائے محتاج

جب قطب صاحب کا انتقال ہوا، اور جنازہ غسل کے بعد نماز کے لئے لایا گیا تو خواجہ ابو سعید نے کہا: —

"حضرت خواجہ وصیت کردہ بود کہ امام جنازہ ما آنکس باشد کہ گاہے ازار بہدس لحرام نکشادہ باشد و سنت ہائے عصر و تکبیر اولیٰ فرائض نماز گاہے ازو ترک نشدہ باشد"۔ التمش بھی وہاں موجود تھا۔ خواجہ ابو سعید کے یہ الفاظ سنکر کچھ دیر

---

[1] عہدۂ شیخ الاسلام کے لئے ملاحظہ ہو The Administration of The Sultanate of Delhi by Dr. I. H. Qureshi

[2] انکار کی وجوہات پر میں نے اپنے انگریزی مضمون Medieval Mystics & Govt. Service میں بحث کی ہے۔ اردو میں وہ مضمون آئندہ کبھی ناظرین کے سامنے پیش کیا جائے گا —

[3] "سیر الاولیا" — امیر خورد (مطبوعہ لاہور۔ اردو) ص

[4] "فوائد السالکین" بابا فرید ۹ ب (قلمی)

تک اس انتظار میں کھڑا رہا کہ کوئی شخص ان علماء و مشائخ میں سے آگے بڑھے۔ لیکن جب دیکھا کہ کوئی شخص ان صفا[ت] کا وہاں موجود نہیں ہے تو خود آگے بڑھا اور کہا کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو میرے حال کی خبر ہو، لیکن چونکہ خواجہ [صاحب] نے اسی طرح حکم دیا تھا اس لئے مجبوری ہے۔ اس کے بعد نماز جنازہ پڑھائی۔[1]

قطب صاحب کی رحلت کے چند ماہ بعد ہی التمش کا بھی انتقال ہوا۔ لیکن اس درمیان میں بھی حضرت کی خا[نقاہ] کے لئے کھانا قاضی حمید الدین ناگوری کے پاس خانقاہ میں بھیجتا رہا۔[2] حضرت نظام الدین اولیا نے التمش کی تاریخ وفا[ت] پر یہ شعر کہا تھا:

بسال شش صد و سی و سہ بود کہ از ہجرت نماند شاہِ جہاں شمس دین عالمگیر[3]

خلافت سے عقیدت

التمش پہلا بادشاہ تھا جس نے خلافت بغداد سے رابطہ قایم کیا۔ خلافت سے جس عقید[ت] کا اظہار کیا اُس سے اُس کے مذہبی جذبات کا پتہ چلتا ہے۔ خلیفہ نے جب اُسکو خلع[ت] بھیجا تو اس قدر خوشی ہوئی کہ تمام دارالسلطنت میں جشن منایا گیا۔ تمام شہر چراغاں کیا گیا۔ خوشی کے شادیانے بجا[ئے] گئے۔ نظام الدین نے لکھا ہے:

" سلطان آنچہ شرط اطاعت و ادب بود بجا آوردہ جامہ دار الخلافت پوشیدہ"[4]

جب قاضی جلال، خلیفہ بغداد کی جانب سے سفینۃ الخلفا کا ایک نسخہ (جس پر خلیفہ ہارون الرشید کے ہاتھ کے کچھ نصائح لکھے ہوئے تھے) بطور تحفہ لیکر التمش کی خدمت میں حاضر ہوا تو بقول بلبن " سلطان ازیں موعظت چناں بر قاضی جلا[ل] عروس خوش شد کہ خواست کہ نیمے ملک خود بدو ایثار کند"[5]

عمارات میں مذہبی جذبہ

التمش کے عہد کی عمارات سے بھی اُس کے مذہبی احساسات کا پتہ لگتا ہے۔ حوض شمسی میں خاص طور سے اُس کے مذہبی جذبات کا عکس نظر آتا ہے۔ یہ حوض خا[ص] مذہبی تاثرات کے ماتحت بنایا گیا تھا۔[6] اس حوض کے قریب حضرت قطب صاحب کے لئے ایک حجرہ تھا۔ صوفیوں کی بڑی بڑی مجلسیں اسی حوض کے کنارے منعقد ہوا کرتی تھیں۔ بڑے بڑے مشائخ اپنے چلے اسی جگہ کھینچتے تھے۔ یہیں خواجہ امیر حسن نے یہ شعر پڑھکر:

سالہا شد کہ ما ہم صحبتیم ، گر ز صحبتہا اثر بودے کجا است
زہد تاں فسق از دل ما کم نہ کرد فسق مایاں بہتر از زہد شما است

حضرت نظام الدین اولیا کے قدموں پر سر رکھدیا تھا۔ یہ بنانے والے کی نیت کا اثر تھا کہ یہاں ہمیشہ صوفیوں اور درویشوں کے جمگھٹے لگے رہے۔ آج وہاں مزارات کا ہجوم ہے۔ اسلامی ہند کا روحانی سرمایہ اسی جگہ دبا ہوا ہے۔ حوض شمسی التمش کے مذہبی جذبہ کی ایک زبردست نشانی ہے۔

---

[1] "خزینۃ الاصفیا" ۔ غلام سرور۔ جلد اول ص ۲۷۵ ۔ [2] "رسالہ حال خانوادہ چشت" مولانا تاج الدین ص ... ۔ [3] "سیر الاولیا" امیر خورد ص ۵۲ ۔ [4] "طبقات اکبری" ص ۲۹ ۔ [5] مفصل واقعہ کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ فیروز شاہی" ۔ برنی (ایشیاٹک سوسائٹی) ص ۱۴۵ ۔ [6] "فوائد السالکین" ص ... "فرشتہ" جلد دوم ۔ جواہر فریدی ص ۱۶۸-۶۹ ۔ خزینۃ الاصفیا ۔ جلد اول ص ۲۷۶-۲۷۷

بداؤں کی جامع مسجد پر جو کتبہ ہے اُس سے بھی التمش کے مذہبی جذبات و خواہشات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔
... کے ہر لفظ میں ایک تبلیغی جذبہ پنہاں ہے۔ لکھا ہے:

من دخلہ کان امنا　　　جو آیا اس جگہ امن سے ہوا
ادخلوھا بسلام　　　آؤ اس جگہ سلامت رہوگے

آگے لکھا ہے " وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا " (اور اللہ کا فرض ہے لوگوں
... کرنا خانۂ خدا کا جس کو پہونچنے کی مقدرت ہو)
بادشاہ کے متعلق لکھا ہے: " شمس الدنیا والدین اعلی الاسلام والمسلمون "
(جس نے بلند کیا اسلام اور اسلام والوں کو)

اجمیر میں اڑھائی دن کے جھونپڑے پر جو عبارت کندہ ہے وہ بھی اُس کے مذہبی جذبات کی شاہد ہے[۱]۔ قطب مینار
... قطب الدین بختیار کاکی کے نام پر بنایا گیا تھا[۲]۔

... علماء و مشائخ سے اس قدر عقیدت اور مذہبی معاملات میں اس قدر دلچسپی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی حلقوں میں اُسکا
... خاص احترام کیا جانے لگا۔ مذہبی دلچسپیوں کا دور دور شہرہ ہو گیا۔ علماء اور اولیاء اُس کو محافظ مذہب سمجھنے
... ناصر الدین قباچہ نے ملتان میں جب فسق و فجور کا بازار گرم کیا تو مدد کے لئے جس طرف لوگوں کی آنکھیں اُٹھیں وہ التمش
... ذات تھی۔ حضرت بہاء الدین ذکریا ملتانی اور قاضی شہر مولانا شرف الدین نے ایک درخواست قباچہ کی مذہب سے
... تنائی کے بارہ میں التمش کی خدمت میں روانہ کی[۳]۔

مذہبی تقدس کے باعث خود بھی اُس کا شمار اولیاء اللہ میں ہونے لگا۔ اکثر تذکروں میں اُسے ولی کہا گیا ہے۔ تاج الدین
اُسے " سلطان الاولیا " کہہ دیا ہے[۴]۔ حضرت نظام الدین اولیاء اکثر فرمایا کرتے تھے کہ شیخ شہاب الدین سہروردی اور
... وحد الدین کرمانی کو التمش سے محبت تھی[۵]۔ درویش جمالی نے لکھا ہے:

" سلطان شمس الدین مرد متعبد و مجتہد اولیا بود و منظور نظر مشائخ کبار "[۶]

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کا پہلا خود مختار فرمانروا بڑی خوبیوں کا حامل تھا۔ منہاج نے صحیح لکھا ہے کہ خدا نے
... فریدوں کی شان و شوکت، قباد کا مزاج، کاؤس کی شہرت، بہرام کا عظمت و جلال اور سکندر کا سلیقۂ ملک گیری
... فرمایا تھا۔ شجاعت میں وہ دوم علی کرار تھا تو سخاوت میں حاتم طائی ۔ ع

انچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

خلیق احمد نظامی ام۔اے

Epigraphia Indo Moslemica
Tabakat i Nasiri translated by Raverty P. 622 ملاحظہ ہو۔
... جلد دوم ص ۶۲۶ " فرشتہ " ۔ ص ۱۷۰ " سیر العارفین " ۔ ص ۵۲۶ " سیر الاولیا " [۳]　　Foot-note
... سالہ حال خانوادہ چشت ص ۱۷ ۔ [۵] " فوائد الفواد " ملفوظات حضرت نظام الدین اولیا از شیخ امیر حسن علاء سنجری ۔ [۶] " سیر العارفین " ص ۱۷

حکومت کی اقتصادی و صنعتی پالیسی

اور

پاکستان کا معاشی مستقبل

(بہ سلسلۂ ماسبق)

ہندوستان کی صنعت و تجارت مشین کی ایجاد سے پہلے ہندوستان کی دستکاری اپنی نفاست و نزاکت کے لحاظ سے بہت مشہور تھی اور آبنوس، صندل، ہاتھی دانت اور فلزی اشیاء پر نقش و نگار اور گلکاریوں کے لئے ہمارا ملک سارے مہذب ممالک میں شہرت رکھتا تھا۔ اونی سوتی اور ریشمی پارچہ بافی ہندوستان کی خاص صنعت تھی جس سے ساری دنیا مستفید ہوتی رہی۔ ڈھاکہ کی ململیں، دلی کا کارچوبی ریشم، کشمیری نفیس شال، خوشنما قالین، زردوزیاں، مینا کاریاں اور رہین بچی کاریاں جو ممالک اشیاء یورپ کے لئے سامان تعیش بہم پہونچاتی تھیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جس وقت انگلستان "ہل بیل" کے سوا کچھ جانتا ہی نہ تھا۔

کلوں کی ایجاد اور انگلستان میں صنعتی انقلاب کے بعد ہندوستان کی صنعت میں مزید ترقی کی کوششوں کی بجائے ہماری حکومت نے برطانوی صنعت سے ہمدردی شروع کردی اور سب سے پہلے ہندوستانی کپڑوں پر انگلستان میں بہت زیادہ محصول درآمد لگا دیا گیا، لیکن ہندوستانی کپڑوں کی لاگت اتنی سستی ہوتی تھی کہ ساٹھ فیصدی محصول درآمد لگا دینے پر بھی انھیں انگلستان میں زیادہ مقبولیت حاصل تھی اور خود وہاں کے مال سے وہ زیادہ سستے پڑتے تھے۔ جب اس طرح مقصد حاصل ہوتا ہوا نظر نہ آیا تو قانوناً ہندوستانی کپڑوں کی درآمد ہی انگلستان میں ممنوع قرار دیدی گئی اور خود ہندوستان میں یہاں کے دیہی صنعتوں پر اندرونی ڈیوٹی عاید کردی گئی، مطلب یہ تھا کہ یہاں کے مال کی کھپت خود اپنے ملک میں بھی نہ ہو اور ولایتی کپڑوں کے مقابلہ میں وہ اتنے گراں پڑیں کہ کوئی انکو خریدنے کی ہمت نہ کرے

ایسٹ انڈیا اینڈ چائنا ایسوسیشن کے صدر مسٹر لارپنٹ کے بیان کے مطابق ۱۸۱۴ء سے ہندوستان کے سوتی پارچہ کی انگلستان میں درآمد کم ہونے لگی اور برطانوی کپڑے ہندوستان میں زیادہ آنے لگے، مسٹر لارپنٹ نے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان سوتی مال تجارت کے سلسلۂ درآمد و برآمد کے متعلق سفارش کی کہ دونوں ملکوں میں شرح محصول یکساں کردیجائے مگر کمیٹی کے ایک رکن مسٹر براکلہرسٹ کی مخالفت کے سبب کامیاب نہ ہوئی۔

۱۹۳۵ء اور ۱۹۵۲ء کے درمیان ہندوستان کی عام درآمد و برآمد میں کافی ترقی ہوتی رہی لیکن شرح محصولات میں بھی اس زمانہ میں اس طرح ترمیم و اضافہ ہوتا رہا۔ ہندوستان پھول پھل نہ سکا بلکہ بقول آر۔ سی۔ دت ہندوستان میں برطانوی تجارت کی نوعیت دوسرے ممالک سے بالکل مختلف تھی، کیونکہ دیگر ممالک سے ان کو جو نفع ملتا تھا۔ اس کا معاوضہ بھی ان کو دیتے تھے مگر ہندوستان کو کوئی معاوضہ نہ ملتا تھا۔

تاجِ برطانیہ کے ماتحت ہندوستان کی صنعت و تجارت

۱۸۵۶ء میں پہلی مرتبہ بمبئی میں مل قایم ہوئی اور برطانیہ میں کھلبلی مچ گئی لارڈ کیننگ کو نرخنامہ محصولات میں اصلاح کا خیال ہوا غدر کے بعد مساوی محصول کی تحریک کی گئی لیکن منچسٹر والوں نے مخالفت کی کہ برطانی درآمد پر محصول بڑھانے سے ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ ملیں قایم ہو جائیں گی جس سے انگلستانی صنعت کو دھکا لگنے کا خطرہ ہے ۔ ۱۸۶۰ء اور ۱۸۷۱ء کے درمیان بالکل ہندوستان کے مفاد کے خلاف محصولات میں ترمیم و اصلاح ہوتی رہی ۱۸۷۵ء میں لارڈ نارتھ بروک نے جو کیننگ سے زیادہ ہمدرد، انصاف پسند اور مآل اندیش ہونے کے علاوہ بڑی قوت ارادہ کا مالک تھا ایک نیا قانون نرخنامہ منظور کیا جس سے نیل، چاول، اور لاکھ کے علاوہ سارے محصولات برآمد معاف ہو گئے مگر حالات پر غائر نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ منچسٹر کی مخالفت کی وجہ سے، ہندوستان کو بڑا مالی نقصان پہونچا ۔ لارڈ لٹن کی نیابت سلطنت کا زمانہ ہندوستانی صنعت کے لئے بدترین سمجھا جاتا ہے اس کے بعد لارڈ رپن نے ۱۸۷۹ء کے قحط کے بعد نمک اور شراب کے سوا سارے اندرونی محاصل ختم کر دئے۔ ہندوستان کے لئے لارڈ الگن کا زمانہ شاید لارڈ لٹن سے بھی زیادہ خراب ثابت ہوا ہے اُس نے ولایتی سوت، تاگے اور مصنوعات پر محصول میں کمی کر دی اور برخلاف اس کے ہندوستان کے گاڑھے اور کھدر پر بھی اندرونی ڈیوٹی لگا دی اس سے مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ہندوستانی ملیں بند کر دی جائیں لیکن اس کی مخالفت میں ہندوستان کے انگریزی اور دیسی دونوں قسم کے باشندوں نے آوازیں بلند کیں۔

بیسویں صدی عیسوی میں حکومت کی صنعتی، تجارتی اور محصولاتی پالیسی

اُنیسویں صدی کے آخری حصے میں اور پھر ۱۹۰۱ء میں جب ہندوستان میں زبردست قسم کے قحط کی بلا نازل ہوئی تو کمیشن نے سفارش کی کہ ہندوستان کی صنعت کو ترقی دیجائے تاکہ زراعتی نقصانات کا کسی حد تک ازالہ ہوتا رہے مگر حکومت نے اس طرف کوئی توجہ نہ کی بعض صوبائی حکومتوں نے صنعت کو فروغ دینے کی اسکیمیں بنائیں لیکن مسٹر مارلے وزیر ہند نے کہدیا کہ حکومت ہند کو بجز تجارتی تعلیم کی ترغیب دینے کے اور زیادہ کچھ نہ کرنا چاہئے۔ جنگ عظیم کے دوران میں بیرونجات سے تعلقات اور درآمد کم ہو جانے کے سبب ہندوستان میں مصنوعات طیار ہونے لگیں، حکومت کو بھی ضرورت کا احساس ہوا اور لارڈ ہارڈنگ نے وزیر ہند کے پاس سفارش کی کہ سیاسی مصالح کے پیش نظر ہندوستان کی صنعتی پالیسی میں تبدیلی کی ضرورت ہے اور دل خوش کن الفاظ میں امید دلائی گئی کہ جنگ کے بعد ایسی سہولتیں پیدا کر دی جائیں گی جس سے ہندوستان دنیا میں خاص پوزیشن حاصل کر سکے گا لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں سر ابراہیم رحمت اللہ کے زیر صدارت مالیاتی کمیشن کا تقرر ہوا سنہ ۱۹۲۴ء میں کمیشن نے سفارش کی کہ امتیازی تحفظ (Discriminating protection) کی پالیسی اختیار کی جائے اسی سال سکہ و شرح مبادلہ میں ترمیم کے سبب یہاں کے زرپر کافی اثر پڑا اور سنہ ۱۹۳۰ء میں عالمگیر کساد بازاری کے سبب ہندوستان کی تجارت اور صنعت کو بہت نقصان پہونچا۔

صنعت کی اہمیت اور اسکی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں

ہندوستان میں صنعت و تجارت کے ساتھ ساتھ ملک کے افلاس کی تاریخ شروع ہوتی ہے ہندوستانی قحط کمیٹیوں نے بھی ملک کی صنعت کو فروغ دینے کی سفارش کرتے ہوئے یہی بات کہی تھی کہ قحط کا ظہور قدرتی اسباب کے باعث فصلوں کے خراب ہو جانے سے ہوتا ہے لیکن ملک میں صنعت کی وجہ سے ایسے خطرات کا قبل سے سد باب کیا جا سکتا ہے اور بلا کے نازل ہو جانے کے بعد بھی ملک اور حکومت کو امدادی کارروائیوں میں سہولت ہوتی ہے، لیکن کون سنتا ہے فغانِ درویش!

معاشیات کے اُصول سے واقفیت رکھنے والوں کو معلوم ہے کہ پیدائش دولت کے ذرایع چار ہیں، زمین، محنت سرمایہ اور انتظام، جس میں زمین اور سرمایہ بہت اہم ہیں بالخصوص سرمایہ سب سے مقدم شے ہے۔ ناواقف لوگ دولت اور سرمایہ کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں۔ معاشی دولت بہت سی خصوصیات کی حامل ہوتی ہے جس کے بغیر اس کی معاشی تعریف مکمل نہیں ہو سکتی۔ دولت کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی افادیت ہے دولت کی ساری خصوصیات معاشی سرمایہ میں بھی پائی جاتی ہے، چنانچہ ہر سرمایہ دولت ہوتا ہے مگر ہر دولت سرمایہ نہیں ہو سکتی۔ فرق یہ ہے کہ سرمایہ ذریعہ پیدائش ہے اور دولت سعی پیدائش کا حاصل۔ ہندوستان میں نہ معاشی زمین کی کمی ہے اور نہ محنت کی، مگر سرمایہ کی قلت، محصولات کی زیادتی، تجارتی درآمد و برآمد میں عدم توازن، سکہ و شرح مبادلہ کی خامیاں۔ بنک کاری کے نقایص، تعلیم کا فقدان، غذا کی کمی اور صحت عامہ کی خرابی وغیرہ وہ اسباب ہیں جو ہمارے ملک کی صنعت کی راہ ترقی اور پیدائش دولت کی سعی میں براہ راست یا بالواسطہ رکاوٹیں پیدا کر رہی ہیں۔

اب بنک کاری کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہاں ایک بھی دیسی اکسچینج بنک نہیں ہے، ہماری خارجی تجارت کو غیر ملکی بنک کنٹرول کرتے ہیں اور بٹہ کے مستحق ہوتے ہیں ایسے بنکوں سے نہ صرف ہمارے ملک کو نقصان پہونچ رہا ہے بلکہ ہمارے دیسی مشترک سرمایہ کے بنکوں (Joint Stock Banks) کے لئے ان کا بوجھ مستقبل میں بہت سے خطرات کا باعث ہو سکتا ہے۔ مشترکِ سرمایہ کے بنکوں کو بنک ہی نہیں کہا جا سکتا ہے، ملک کا رزرو بنک آف انڈیا کے قیام سے قبل ملک میں کوئی مرکزی بنک نہیں تھا جس کی ضرورت کا احساس سنہ ۱۸۲۸ء ہی سے لوگوں کو ہوتا آرہا تھا اور مسلسل کوششوں کے بعد صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ سنہ ۱۹۳۴ء میں قیام بنک کا بل پاس ہوا، مگر اس کی حیثیت بھی پرائیوٹ حصہ داروں کے بنک کی ہے جس میں بیرونی سرمایہ داروں کا حصہ بہت زیادہ ہے

ہندوستان کی خارجی تجارت اور محصولات

راہ سویز کے کھلنے کے بعد ہمارے ملک کی تجارت کی ضخامت میں جو اضافہ ہونے لگا ہے تو یہ سمجھانے کی

کوشش کیجاتی کہ ہندوستان کا تمول بڑھتا جارہا ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تجارت کی ضخامت افزونی دولت کا باعث ہوتی ہے جس کی مثال انگلستان میں ملتی ہے۔ مگر تجارت کی ضخامت سے زیادہ قدرتی وسایل کی فراوانی اور ملک کی وسعت کا پیدائش دولت پر اثر پڑتا ہے چنانچہ تجارت کی ساری سہولتوں کے باوجود محض وسایل کے نہ ہونے کے سبب برطانیہ امریکہ کی دولت کا مقابلہ نہیں کرسکتا، باوجودیکہ امریکہ خارجی تجارت کی ضخامت انگلستان سے بہت کم ہے، بات یہ ہے کہ خارجی تجارت میں عموماً لاگت اور منافع کا حساب رکھا جاتا ہے یعنی ملک سے انھیں اشیاء کی برآمد بیرونجات کو کیجاتی ہے جو ملک کی ضرورت سے فاضل ہوتی ہے یا جس سے ملک کے اندر نسبتاً منافع کم ہوتا ہے اور باہر بھیجنے سے زیادہ پیسے آنے کی توقع ہوتی ہے اور درآمد انھیں چیزوں کی ہوتی ہے جن کی پیدائش ملک میں نہیں ہوتی یا جسکی تیاری میں باہر سے زیادہ لاگت ہوتی ہے مگر ہندوستان اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ ڈاکٹر رادھا کمل مکرجی کے حساب سے ہندوستان کا سارا غلّہ ملک کی صرف اٹھاسی فیصدی آبادی کے لئے کافی ہوسکتا ہے بارہ فیصدی آبادی گویا بھوکی رہتی ہے تاہم ہمارے ملک کا غلّہ دوسرے مقامات کو بھیج دیا جاتا ہے اور اپنی ضرورت کے لئے دوسرے ممالک سے غلّہ منگوانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ابتدا میں ملک کی خام پیداوار ساری کی ساری صرف انگلستان ہی کو بھیجی جاتی تھیں مگر جب بعض چیزیں دوسرے مقامات میں بھی زیادہ مقدار میں پیدا ہونے لگیں، تو ہمارے ملک کی خام پیداوار کی کھپت انگلستان میں کم ہوگئی مگر یہ کبھی نہ ہوا کہ یہاں کی خام اشیاء زیادہ سے زیادہ ملک ہی کی مصنوعات میں کھپائی جاسکیں، اس لئے ان کی نکاسی کے لئے دوسرے مارکٹ پیدا کرنے کی کوشش کیجانے لگی۔ انگلستان میں ہندوستان کی صرف انھیں چیزوں کو ترجیح دیجاتی ہے جن کی برآمد ہمارے ملک سے بہت مختصر ہوتی ہے مثلاً چاول اور جو وغیرہ یا ایسی چیزیں جو خاص ہندوستان میں دستیاب ہوتی ہے مثلاً چائے، جوٹ، ابرک، ارنڈ اور بکری کا چمڑا وغیرہ۔ مگر ہم کو دھمکیاں دیجاتی ہیں کہ اگر اٹاوا پیکٹ میں شامل رہے تو ہندوستان سے برطانیہ تجارتی تعلقات منقطع کرلیگا اور ہماری حکومت اس دھمکی سے کانپ اُٹھتی ہے، حالانکہ ہمارا فایدہ اس میں ہے۔

بیرونی مصنوعات کی ہندوستان میں نئی آمد

موجودہ جنگ کے زمانہ میں بحری سلسلہ آمد و رفت کے منقطع ہو جانے اور جنگی ضرورتوں کی وجہ سے ہندوستان کی صنعت کو ترقی دینے کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ یہاں دوائیں، کیمیاوی اجزا، سائیکل کے پرزے، برقی پنکھے اور لالٹین بنائی جانے لگیں، اس ضمن میں حکومت ہند کے ممبر مالیات نے یقین دلایا تھا کہ روزمرہ کی ضروری اشیاء کی باہر سے درآمد لیجائے گی لیکن اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد ایک سوال کے جواب میں کامرس ممبر نے جب اس بات کا اقرار کیا کہ باہر سے صرف کپڑے منگوائے گئے ہیں تو لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ حالانکہ کپڑے کے علاوہ اور بھی چیزیں باہر سے آنے لگی ہیں۔ اول تو کوئلے پر قدغن ہونے کے سبب ہماری صنعت کی ترقی میں یونہی رکاوٹ پیدا ہوگئی تھی، دوسرے غیر ملکی مصنوعات کی درآمد نے اور زیادہ نقصان پہونچایا۔ ان اشیا کی قیمت پر کنٹرول کیا جارہا ہے تاکہ وہ ہندوستان کی اشیاء کے مقابلہ میں زیادہ مقبولیت حاصل کرسکیں۔

(پاکستان کے معاشی مستقبل پر آیندہ بحث کی جائے گی)

حسرت نعمانی

لفظ و معنی کے تعلق پر ایک نظر

لفظ اور معنی کا تعلق فلسفۂ زبان کا ابتدائی اور علم بلاغت کا انتہائی مسئلہ ہے جو فلاسفہ کا بھی موضوع بحث بنا رہا ہے۔ اس پر سب سے پہلے افلاطون نے بحث کی ہے۔ علمائے ادب میں عباد اور فلاسفہ میں میر باقر داماد اسی کے خوشہ چیں ہیں، ان کا خیال ہے کہ الفاظ اپنی آواز کے اُتار چڑھاؤ سے اپنے معنی آپ ادا کرتے ہیں۔ لیکن اسکی مخالفت میں یہ دلیل بھی وزن رکھتی ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو ہر شخص لفظ کے معنی سمجھتا اور کسی زبان کو حاصل کرنے یا کسی لفظ کے معنی لغت میں دیکھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ پھر یہ کہ "لغاتِ اضداد" اپنے معنی کیونکر ادا کر سکتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ہی لفظ اپنی آواز کے چڑھاؤ اُتار سے گرمی کی کیفیت بھی ظاہر کرے اور سردی کی بھی، جن لوگوں کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ لفظ اپنے معنی آپ ادا کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ کا مفہوم پہلے ہی سے ان کے ذہن میں ہوتا ہے اور جس وقت وہ کوئی لفظ سنتے ہیں تو فوراً اس کے معنی کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً "ہاتھی" کی لفظ سے ایک کوہ پیکر مجسمہ کی تصویر سامنے آجاتی ہے اور اس لفظ کی آواز میں بھی جسامت محسوس ہوتی ہے، لیکن اگر اس چلتے پھرتے پہاڑ کا نام "پدّی" رکھ دیا جاتا تو بھی اس لفظ میں وہی کیفیت ہوتی جو "ہاتھی" میں ہے۔ اس کی مثال ذیل کا فقرہ ہے: "زعہد کے وجم تا ایندم" اس فقرہ میں "کے" اور "جم" کی آواز میں جو شوکت ہے وہ ذیل کے فقرہ میں نہیں: "برف کے سیر جم گئی"۔

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ خود لفظ میں کوئی کیفیت نہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شوکت الفاظ کا تعلق لہجہ اور طرز ادا سے بھی ہے۔ مثلاً ہم کہتے: "اب ہم وہاں چلیں"۔ پھر اگر اس فقرہ کا محل استعمال یہ ہے کہ "کہ اب ہم کو وہاں چلنا چاہئے" یا استفہام ہے تو کوئی خاص کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن اگر لفظ "ہم" پر زور دیکے کہئے کہ اب "ہم" وہاں چلیں تو معنی بدل جاتے ہیں اور یہاں "ہم" میں ایک وزن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ وزن متکلم کے لہجہ سے پیدا ہوا اور اس کا لہجہ محل و موقع کی ضرورت نے سخت کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ متکلم کا لہجہ لفظ میں جو کیفیت چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے اور لہجہ، مفہوم کا تابع ہے جیسا مفہوم ہوگا ویسا ہی لہجہ بھی ہوگا۔ اگر لہجہ اور مفہوم میں ہم آہنگی نہ ہوگی تو کلام بے معنی سا ہو جائے گا۔

الفاظ کی تقسیم یہ تو سب جانتے ہیں کہ لفظوں کی تقسیم یہ ہے:۔ اسم۔ فعل۔ حرف۔ وہ الفاظ جن کو اصطلاح میں حرف کہتے ہیں اپنی صوتی اور معنوی حالت میں محل اور ارادہ متکلم کے تابع ہیں مستقل کوئی حیثیت نہیں رکھتے اس لئے انھیں موضوع بحث بننے کا حق نہیں۔

افعال خود کوئی چیز نہیں ان کی اصل اسم ہے۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہر فعل اور اس کی مختلف حالتوں کی

ابتداء مصدر یا حاصل مصدر سے ہوتی ہے اور یہ دونوں اسم ہیں ہر فعل کے تمام مشتقات اپنی صوتی کیفیت میں اسم کے تابع ہیں اس لئے وہ بھی موضوع بحث بننے کا حق نہیں رکھتے۔

اب رہ گئے اسماء ان کی دو قسمیں ہیں: (۱) معرفہ ــــ (۲) نکرہ ۔

اسمائے معرفہ اپنے مسمیٰ کی تکمیلی حالت سے پہلے مقرر ہو جاتے ہیں اس لئے وہ اسکے خصوصیات کے حامل نہیں ہوتے اور مفہوم کے تصور کے تابع ہیں یہی وجہ ہے کہ "جم اور کے" میں اس وقت شان و شوکت معلوم ہوتی ہے جب ہم تصور کریں کہ یہ نام فارس کے دو مشہور صاحب عظمت و جلال بادشاہوں کے ہیں۔

بے شک اسمائے نکرہ اپنے موسوم کی تکمیلی حالت کے بعد مقرر ہوتے ہیں اس لئے وہ بڑی حد تک اسم بامسمیٰ ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے بھی اقسام ہیں۔ جو بعد کو بیان کئے جائیں گے۔ پہلے ہم آپ کے سامنے ایک فطری اصول پیش کرتے ہیں۔

زبان کا فطری اصول

نقالی جاندار کی فطرت ہے۔ جانوروں کو دیکھئے اپنے خیالات کی تصویریں بن جاتے ہیں غصہ۔ محبت۔ خوف۔ ان تمام حالتوں میں وہ ایسی صورت بناتے ہیں جو ان کے دل کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔

آدمیوں میں گونگوں کو دیکھئے! اپنے ہاتھ کے اشارے اور چہرہ کے انداز سے اپنے خیالات کی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ جو لوگ مختلف طرح کی مسلسل آوازیں نکال سکتے ہیں وہ انھیں آوازوں کے اُتار چڑھاؤ سے اپنے دل کے خیالات ادا کرتے ہیں۔

زبان کی ابتداء کے متعلق بھی یہی خیال ہے کہ انسان پہلے اپنی طبعی ضرورتوں، قدرتی چیزوں اور فطری حالتوں کو نہل آوازوں سے ظاہر کرتا تھا رفتہ رفتہ اس نے بعض مخصوص مضمون کے ادا کرنے کے لئے کچھ آوازیں مقرر کرلیں جس کو زبان کہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ زبان کی ابتدا نقل سے ہوئی۔ اس میں سب سے زیادہ کامیابی انسان کو ہوئی جس آواز کی اس نے نقل اُتارنا چاہی ویسی ہی آواز اپنے منھ سے نکال دی جیسے: ٹن ٹن۔ گھن گھن۔ ٹپ ٹپ۔ دھم دھم وغیرہ۔

اس کے بعد اس کی کامیابی کا موقع حالات اور کیفیات کی نقالی میں ہے جیسے:۔ تڑپ۔ سرک۔ لچک۔ لہرانا۔ تھرانا۔ جھجھکنا۔ جھومنا۔ جھونک۔ ٹھونک۔ بھونک وغیرہ۔

چونکہ یہ سب چیزیں مادی نہیں ہیں بلکہ مختلف حالتیں اور کیفیتیں ہیں اس وجہ سے ان کے صحیح مفہوم کو ذہن میں اُتارنے کے لئے انسان کو اپنی فطرت پر زیادہ زور دینا پڑا۔ اور چونکہ ان حالتوں کے ظاہر کرنے کا تعلق ہر شخص سے ہے، لہذا جو شخص جس کیفیت کو زیادہ بہتر ادا کر سکا وہی نام اس کا مقبول ہو گیا۔

اس کے بعد مادی چیزوں کی نقالی یا تصویر کشی کا درجہ ہے اس پر جب غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے الفاظ اپنے معنی کی صحیح تصویریں ہیں جیسے: بھالو۔ گنبد۔ فوارا۔ بالشت۔ گولا۔ ڈھولا۔ جھولا۔ چھچھوندر۔ گھگھو وغیرہ۔

اس میں شک نہیں کہ ایسے نام بہت ہیں جو اپنے مسمیٰ پر دلالت نہیں کرتے جیسے: بادام۔ اخروٹ۔ پالک۔ بتھوا۔ شلجم۔ زمین۔ آسمان۔ آدمی وغیرہ۔ ان ناموں کی صوتی حالت اپنے مسمیٰ کی ظاہری حالت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ اس موقع پر فطرت انسانی کی اس کمزوری کی طرف آپ کے ذہن کو منتقل کرنا چاہتا ہوں جو برابر ہمارے آپ کے

تجربے میں آتی رہتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کوئی شخص کسی پر "پھبتی" کستا ہے تو بغیر سوچے اور غور کئے بے اختیار اُٹھتا ہے اور وہی پھبتی کھپتی ہے۔ اس کے یہ معنے ہیں کہ جب بے اختیار فطرت اپنا کام کر جاتی ہے تو بہت چبھتی بات ہو جاتی ہے اور جہاں انسان کی یہ فطری صلاحیت چوک جاتی ہے وہاں وہ لطف باقی نہیں رہتا۔ یہی انسانی فطرت کی کمزوری ان ناموں میں سے بھی ظاہر ہوتی ہے جو اپنے مسمیٰ کی تصویر نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ یہ چیزیں مادی ہیں اس لئے ان کے غیر موزوں نام مقرر ہو جانے سے بھی آدمی اس کو سمجھ سکتا ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ مادی چیزوں کی آواز کے ذریعہ سے صورت کشی مشکل بھی ہے۔ اس لئے انسان کی ناکامیابی ایسے موقع پر بے جا بھی نہیں۔ بخلاف اصوات اور کیفیات کے کیونکہ یہ مادی نہیں ہیں ان میں تو جب انسانی فطرت پوری قوت اور انتہائی کوشش سے نقل نہ اُتارے مفہوم ادا ہی نہ ہو سکے گا لہذا اس میں فطرت انسانی نے پوری قوت سے کام لیا۔ اس اعتبار سے اسم کی تین قسمیں ہیں:

(۱) اسمائے اصوات — (۲) اسمائے کیفیات — (۳) اسمائے مادیات۔

اسمائے اصوات میں تو انسان کو کچھ دقت نہ ہوئی، اسمائے کیفیات میں بے شک پوری شاعری کرنا پڑی۔ اسماء مادیات میں جہاں فطرت بے اختیار کام کر گئی وہ نام زیادہ موزوں ہوا اور جہاں فطرت پورا کام نہ کر سکی وہ نام موزوں نہ ہوا۔ اس میں ایک بات یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو انسانی صنعت سے تعلق رکھتی ہیں ان کا صانع نے جو نام تجویز کر دیا ہے وہ موزوں ہو یا ناموزوں وہی سب کو اختیار کرنا پڑا۔ یا کسی چیز کو سب سے پہلے جس نے دریافت کیا اس نے جو نام بتایا اسی نام سے سب نے جانا۔ اس طرح اسمائے مادیات کی تین قسمیں ہو گئیں۔

الف: وہ الفاظ جن کی صوتی حالت معنی کے تصور کی مطابق ہے۔ جیسے: ہاتھی، گھوڑا، اونٹ وغیرہ۔

ب: وہ اسماء جن کی آواز مسمیٰ صورت کے مشابہ ہے جیسے:۔ بانس۔ تیر۔ زنجیر۔ بھالو۔ گوالا وغیرہ۔

ج: وہ اسماء جو ایک حالت پر قایم ہیں نہ کوئی شاندار مفہوم ان میں جزالت پیدا کرتا ہے نہ حقیقت سبکی جیسے:۔ جو۔ گیہوں۔ چنا۔ مٹر۔ مٹی۔ پانی۔ زمین وغیرہ۔

علمی نام اس طرح ناموں کی ایک دنیا آباد ہو چکنے کے بعد علم و تمدن کی ترقی نے تشبیہ و استعارہ مجاز و کنایہ کے سہارے بہت سے نام بنائے جیسے:۔ کفگیر۔ کفگیر۔ شہتیر۔ آفتاب۔ شہریار۔

بعض نام دو لفظوں کو جوڑ کر بنائے جیسے:۔ سورج مکھی۔ کھٹمل۔

بعض نام فاعلیت لگا کے بنائے جیسے:۔ گہہ مل۔ اُچکا۔ مچھر۔ قصّاب۔ باورچی۔

بعض میں علامت ظرفیت اضافہ کی گئی جیسے:۔ عیدگاہ۔ شبستان۔ میکدہ۔ آتش خانہ۔ سبزہ زار۔ کہسار۔

علمی ناموں کی ایک قسم مختلف المعنیٰ اور متعدد المعنیٰ الفاظ ہیں جو بضرورت فرض کر لئے گئے ہیں لیکن اگر ان پر غور کیا جائے تو ہر ایسے نام کی آواز کسی ایک معنی سے ضرور مشابہ ہوگی جیسے "آہنگ" جس کے معنی "نغمہ" اور "ارادہ" ہے "آہنگ" کو "نغمہ" سے کچھ مشابہت ضرور حاصل ہے۔ اس اعتبار سے نام کی تین قسمیں ہوئیں۔

(۱) وہ نام جو انسان نے کسی صورت یا کیفیت کو دیکھ کے بے ساختہ اپنی آواز کے چڑھاؤ اُتار سے بنائے اور کامیابی کے ساتھ بنائے۔

(۲) وہ نام جن میں ناکامیابی ہوئی۔

(۳) وہ نام جو دماغ سے سوچ کے اُصول اور قاعدے کے تحت وضع کئے۔

یہ گفتگو لفظ و معنی کے تعلق کے لحاظ سے ان کی انفرادی حیثیت پر تھی لیکن یورپ سے جو نظریے ادبی تنقید کے ایشیا آئے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ الفاظ کو صوتی اعتبار سے معنی کے متناسب ہونا چاہئے یعنی نظم یا نثر کے ایک جملہ کا جو مدعا ہو اُسی کی مناسبت سے آواز کا چڑھاؤ اُتار بھی ہونا چاہئے۔ لیکن اس کا کوئی اُصول یا معیار نہیں کیونکہ ایک ثقیل بھی ترکیب میں اس طرح واقع ہو سکتا ہے کہ اس کا ثقل محسوس نہ ہو اور سبک الفاظ سے بھی گرانی پیدا ہو سکتی ہے

جب انسان کسی بات کو فطری جوش سے بیان کرتا ہے تو مطلب ادا کرنے میں اس کے الفاظ کے ساتھ آواز کی بلندی و پستی لہجہ کی سختی و نرمی ہاتھ کی حرکت چہرہ کا انداز سب شریک ہوتا ہے۔ اسی طرح شعر کے صوت و مفہوم میں مطابقت کے یہ معنی ہیں کہ الفاظ اور اُن کی آواز کا چڑھاؤ اُتار لب و لہجہ طرز ادا یہ سب مفہوم کے مطابق ہو اسوقت شعر کا اثر اور اس کا مفہوم اتنا واضح ہو جائے گا کہ اگر اس زبان سے ناواقف بھی سنے تو سمجھ جائے کہ اس میں کس قسم کا مفہوم ہے۔ چنانچہ پروفیسر میمورآن نے اس کے امتحان کے لئے بارہ برس کی عمر کے بچّوں کو جو ہندوستانی زبان انگریزی کے سوا اور کوئی زبان نہیں جانتے تھے یونان کے مشہور شاعر ہومر کے کچھ شعر سنائے تو لڑکوں نے فوراً بتا دیا کہ ان میں جنگ و جدال کا ذکر ہے۔ اس کے بعد اٹلی کے شاعر اعظم دانتے کے شعر سنائے تو انھوں نے کہا کہ کوئی شخص کسی کی موت پر نوحہ کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ الفاظ کی آواز کے زیر و بم نے ان کا مفہوم اتنا واضح کر دیا کہ زبان نہ جاننے والوں پر بھی اثر ہوا اور انھوں نے مفہوم کو بھانپ لیا۔ لیکن یہ تنہا شعر کی خوبی نہ تھی بلکہ متکلم کے لہجہ کو بھی بہت بڑا دخل تھا۔ جن لوگوں کو مرثیہ خوانی کی مجلسوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا ہے وہ میرے بیان کی تصدیق کریں گے۔ میر انیس ایک دفعہ الہ آباد مجلس پڑھنے گئے اس میں ایک انگریز بھی شریک تھا پروفیسر ذکاء اللہ نے اس سے پوچھا کہ تم کیا سمجھے تو اس نے کہا کہ میں یہ سمجھا کہ ایک شخص منبر پر بیٹھا جادو کر رہا ہے اور جس طرح کا اثر چاہتا ہے سننے والوں پر کر دیتا ہے۔ میر انیس کے بیٹے میر نفیس کے متعلق مشہور ہے کہ انھوں نے یہ مصرع اس طرح پڑھا کہ پوری مجلس مُڑ کے دیکھنے لگی:

"وہ گرد اُٹھی وہ جگر بند بوتراب آیا"

یہ تو سب جانتے ہیں کہ میدان رزم، ایوان بزم اور مجلس غم کے راگ الگ الگ ہیں، اگر غم انگیز باتیں جنگی راگ میں گائی جائیں تو کوئی اثر نہ ہو گا اسی طرح شعر کا اثر اسوقت بڑھ جاتا ہے جب الفاظ کی ترتیب ان کی آواز کا چڑھاؤ اُتار یا زیر و بم پڑھنے والے کی آواز کی بلندی و پستی مفہوم کے مطابق ہو۔ یہ مطابقت اس وقت باقی نہیں رہتی جب شاعر جان بوجھ کے کسی چیز کے اثر کو کم کرنے یا اس میں دوسری کیفیت پیدا کرنے کے لئے ایسے الفاظ لاتا ہے جو دوسرے موضوع کے بیان میں صرف ہوتے ہیں۔ میر انیس کہتے ہیں:

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح — گلزار سب خزاں ہوا آئی بہار صبح
کرنے لگا فلک زر انجم نثار صبح — سرگرم ذکر حق ہوئے طاعت گزار صبح
تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

بند میں میر انیس نے صبح کا سماں ایسی لفظوں میں پیش کیا ہے جو بہار کے بیان میں صرف ہوتے ہیں اور اسلئے ان میں بھی شگفتگی، رنگینی اور

بہار کی دلفریبی پیدا ہوگئی ہے لیکن خود صبح ہونے کی کیفیت اس طرح ظاہر نہیں ہوتی جس طرح ہونا چاہئے لیکن یہاں شاعر قابل الزام نہیں ہے کیونکہ وہ رنگینی پیدا کرنا چاہتا ہے یا اسکو ایشیائی شاعری کا عیب کہئے کہ اس میں کبھی کبھی تشبیہ واستعارے میں اصلیت چھپ جاتی ہے ۔ شاعر قابل الزام اسوقت ہے جب وہ مناسب لفظوں میں مفہوم ادا کرنے پر قدرت نہ رکھے۔ جیسے علامہ ثعلبی نے متنبی کے کلام پر اعتراض کیا ہے کہ وہ عاشقانہ خیالات مناسب الفاظ میں ادا کرنے پر قدرت نہیں رکھتا فردوسی پر عام طور سے یہ اعتراض ہے کہ اسکی طبیعت پر رزم کا رنگ اتنا غالب ہوگیا تھا کہ بزم کے کام کا نہیں رہ گیا۔ متاخرین میں طالب ، کلیم ، صائب ، نظیری وغیرہ کے زمانہ میں تمدن و معاشرت میں نزاکت پرستی آگئی تھی اور عشق و عاشقی کے جذبات عام ہوگئے تھے اسلئے یہ لوگ غزلیں خوب کہتے تھے مگر قصیدہ میں زور نہ پیدا کرسکے ۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر شاعر حقیقت میں شاعرانہ وارداتِ سے کسی جذبہ کو محسوس کرکے شعر نہ کہے بلکہ دماغ سے سوچ کے کہے تو اسکے الفاظ مفہوم ہم آہنگی نہ ہوگی یا کم ہوگی۔

سید محمد باقر شمس (لکھنوی)

معلومات

ایک شیشہ ایسا ایجاد کیا گیا ہے، جو شعاعوں کی گرمی کو تقریباً نصف کم کردے گا۔ یہ شیشہ موٹروں اور عمارتوں میں استعمال کیا جائے گا تاکہ گرمی میں شیشوں کی وجہ سے جو حرارت آفتاب بڑھجاتی ہے وہ کم ہوجائے۔

ٹکٹوں کے تختوں میں جو چھوٹے چھوٹے سوراخ کئے جاتے ہیں اور ان سے جو کاغذ کٹ کر گرتا ہے اس کا وزن امریکہ میں ۳۵ ٹن سالانہ ہوتا ہے، وہاں سالانہ ۱۲ ارب سے زیادہ ٹکٹ چھاپے جاتے ہیں۔

امریکہ میں تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ دماغ امراض میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں اوسط ایسے بیماروں کا ۱۷۰۳ فی لاکھ تھا، لیکن اب یہ اوسط ۲۲۵ تک پہونچگیا ہے۔

امریکہ میں ۱۳۳ سال ہوئے ایک فنڈ قایم کیا گیا تھا جس کا نام "کانشنس فنڈ" ہے۔ اس کے قیام کا مقصود یہ تھا کہ وہ لوگ جنھوں نے کسی نہ کسی طرح دھوکا دیکر ناجائز فایدہ اُٹھایا ہو وہ اگر اپنے ضمیر سے کبھی شرمندہ ہوں تو اس ناجائز رقم کو اس فنڈ میں جمع کردیں اس فنڈ سے امریکہ کی حکومت کو سالانہ ۲۱۷۵۰۶ ڈالر وصول ہوتا ہے۔ اس فنڈ میں جو رقمیں اسوقت تک جمع کی گئی ہیں، ان کی مقدار بیک وقت ایک سنٹ کے ٹکٹ سے لیکر ۸۰ ہزار ڈالر تک پہونچتی ہے۔

کیمیا کے دو پروفیسروں نے دریافت کیا ہے کہ پٹرول میں نہایت نفیس عطر پایا جاتا ہے اور ۵۰ روپیہ فی گیلن کے صرف سے یہ عطر حاصل کیا جاسکتا ہے۔

چین کا نظام سیاسی اور اس کا مستقبل

یہ کہنا کہ چین میں کوئی ایک نظام سیاسی موجود ہے قطعاً غلط ہوگا۔ مغرب میں "سیاسی نظام" سے جو چیز مراد لی جاتی ہے وہ چین کے طول و عرض میں یقیناً ایک ناپید چیز ہے۔ اس میں شک نہیں چین میں ایک حکومت ہے۔ جمہوریت چین کا ایک بنیادی قانون جس کو کہ آئین کہنا چاہئے مرتب ہو چکا ہے حکومت اور جمہوریت کا ایک صدر بھی ہے وزرائے سلطنت کی ایک مجلس موجود ہے۔ حکومت کے فرائض مثلاً قانونی انتظامی وغیرہ وغیرہ بھی علیحدہ علیحدہ باقاعدگی کے ساتھ ادا کئے جاتے ہیں اور گزشتہ تین چار برسوں کی منظم کوششوں کے بعد چین کے پاس ایک متحدہ اور مضبوط فوج بھی موجود ہے۔ مگر یہ حکومت اپنے دائرۂ عمل کے لحاظ سے چین کے وسیع علاقہ کے ایک تھوڑے حصہ پر قابض ہے اور چین کے سیاسی اور آئینی نظام کا بیشتر حصہ محض کتابوں میں تو پایا جاتا ہے عمل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

۲ - چنکنگ میں اس وقت جو قومی حکومت موجود ہے وہ اس میں شک نہیں چین کی قومی حکومت ہے مگر جغرافیہ میں جس چیز کو چین کہا جاتا ہے اس میں کتنی اور حکومتیں اس قومی حکومت کے علاوہ موجود ہیں اور یہ کہ ان میں کیا تعلقات ہیں انہیں کوئی نہیں بتا سکتا۔ گزشتہ دس برسوں میں چین کے مختلف صوبوں اور علاقوں میں کتنی حکومتیں پیدا ہوئیں اور کتنی فوجی قیادتیں قایم ہوئیں اور ساتھ ہی ساتھ جس قدر جلد ختم ہو کر مٹ گئیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ بالکل ناممکن ہے کہ کوئی بھی وہ شخص جو چین کے موجودہ ہیئت اجتماع کے ارتقا کا مطلعہ کر رہا ہو وہ مبہوت نہ ہو جائے۔

۳ - مارشل چیانگ کائی شیک کی قیادت اور حکومت کی پوری وفاداری اور اس کی سخت ترین مخالفت کرنے والے دونوں طاقتور عناصر کا چین میں اس طرح اجتماع ہے کہ آئے دن چین کی سیاسی تشکیل میں گزشتہ دس برسوں میں کوئی نہ کوئی اہم تبدیلی ضرور ہوتی ہے اور اسی لئے چین کی سیاسی زندگی کے بنیادی مسئلہ کے متعلق کسی قطعی نظریہ کا پیش کیا جانا انتہائی مشکل ہے۔

۴ - قانونی طور پر مانچوکو یا منچوریا، اندرونی اور بیرونی منگولیا، جیہول، تبت، چہار، سنگیانگ یا چینی ترکستان، کیانگسی، زسے چوان وغیرہ تمام علاقے چینی قوم کے بحیثیت مجموعی املاک ہیں مگر یہ واقعہ ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ مختلف وجوہ کی بنا پر ان تمام علاقوں نے بیسویں صدی میں کبھی بھی چین کی مرکزی حکومت کے سامنے سر اطاعت خم نہیں کیا اور انیسویں صدی کے نصف آخر سے آج تک جدید حکومت کو وہ مرکزیت کبھی بھی حاصل نہیں جو جنوب کی چرخ عصر حاضر کے سیاسی تصور میں ایک انتہائی ضروری شرط قرار دی گئی ہے۔

۵ - آج جبکہ متحدہ اقوام اپنی جنگی کوششوں میں کامیاب نظر آ رہی ہیں۔ اس وقت چین کے مستقبل [illegible] کے متعلق اگر

یہ غور کیا جائے کہ اس کی آیندہ سیاسی پوزیشن کیا ہو سکتی ہے تو یہ شاید بین الاقوامی جمہوریت اور شہریت کے اولین فرائض کی ادائی ہو گی۔

۲۔ نومبر ۱۹۴۱ء سے قبل ہی یعنی جب سے جاپان اور امریکہ و برطانیہ کے درمیان جنگ جاری ہے۔ چین میں غیر ملکی مقبوضات تجارتی و سیاسی مراعات اور اقتصادی و جنگی تعلقات کی موجودگی اور ساتھ ہی ساتھ جاپان کا بڑھتا ہوا سیلاب، چین کی تباہی، بربادی، غربت، غیر ممالک کے قرضوں میں دبا جانا یہ وہ چیزیں تھیں کہ جن سے چین کا نجات پانا سیاسی مبصروں کی رائے میں بہت مشکل نظر آتا تھا۔

مگر ان تمام ہنگاموں اور انتشار کے باوجود جنھوں نے چین کو اپنی قومی عظمت کے حصول سے بہت عرصہ تک کے لئے روکے رکھا ——————— وہ چیز جسے ہم چین کی اصل زندگی کہہ سکتے ہیں بلا کسی خاص رکاوٹ کے برابر جاری رہی۔ اور چین کی قومی زندگی کے اس بنیادی تسلسل ہی کو ہم چین کی موجودہ کامیابیوں کا سبب کہہ سکتے ہیں۔ اس بنیادی تسلسل کی وجہ بالکل صاف ہے۔ ہندوستان کی طرح چینی سوسائٹی کا سب سے چھوٹا لیکن اپنی جگہ مکمل حصہ گاؤں ہے۔ چین میں بھی ہندوستان کی طرح گاؤں چند خاندانوں کے مجموعہ کا نام ہے اور چین میں خاندان اور گاؤں کی وحدت ایک ایسا تصور ہے جو مغربی خیالات کی زبردست یورش کے باوجود اپنی جگہ پر قایم ہے۔ اسی لئے جاپانیوں کے مہیب ترین حملوں کے باوجود چین میں قومی وحدت کا ایک ایسا روحانی رشتہ سارے ملک میں موجود ہے کہ تمام سیاسی، وجغرافیائی تغیرات کے باوجود آج بھی اتنا ہی سرگرم عمل ہے جیسے گزشتہ صدی میں تھا۔ خاندان کو چین کی سماجی زندگی میں جو زبردست اہمیت حاصل ہے اس نے چین کو اس جنگ میں بھی ایک ایسے نظم کا مالک بنا دیا ہے کہ جو بعد از جنگ قومی تعمیر کے عظیم پروگرام کے لئے انتہائی ضروری ہوگا۔

اس کے علاوہ چین ہزاروں سال سے دنیا کا ایک مہذب ترین ملک بھی رہا ہے۔ تمدن کی اس بلندی کے علاوہ چین میں وہ جماعتی تقسیم بالکل نہیں ہے جو ہندوستان میں اونچ نیچ یا مغربی ممالک میں سرمایہ دار اور مزدوروں کے ناموں سے یاد کیجاتی ہے۔ سوسائٹی کا ہر فرد ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ میں ہمیشہ تبدیل ہوتا رہا ہے اور اس کو اس تبدیلی کے سلسلہ سے کوئی مشکل کبھی نہیں پیش آتی۔ اس کے علاوہ چین کے تمام مذاہب اس دینی عقیدے کی تبلیغ نہیں کرتے کہ جو مسیحیت، اسلام، ہندوازم اور دیگر مذاہب عالم کا خاصہ رہا ہے۔ اُن کا زور ہمیشہ زندگی کی خالص اخلاقی کلچرل اور انفرادی تکمیل پر ہوتا ہے اور اسی لئے چین کی قومی زندگی میں مذہب نے کبھی بھی کسی تخریبی چیز کو کامیاب بنانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس چین کے نشاۃ ثانیہ میں وہاں کے مذاہب نے ایک خاص ارتقائی مقصد کو سرانجام دیا ہے۔ حتیٰ کہ اسلام اور مسیحیت جو چین کے لئے غیر ملکی مذاہب ہیں انھوں نے چین کے سماجی، اخلاقی اور تمدنی ماحول میں رہکر اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کوشش کی۔ زبان اور ادب کے ایک متحدہ ورثہ نے بھی چین کو قومیت کے اعلیٰ ترین منزلوں پر پہونچنے میں بڑی مدد کی ہے۔

اس سلسلہ میں چین کے سیاسی ارتقاء پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے موجودہ جمہوریت چین ۱۹۱۲ء میں قایم ہوئی تھی۔ اس سے پہلے چین خارجی اثرات اور اندرونی مظالم کی وجہ سے سیاسی انقلاب کی ضرورت محسوس کر رہا

تھا۔ اس نئے انقلابی اقدام کے قائد ڈاکٹر سن یاٹ سین مرحوم تھے۔ ڈاکٹر سن یاٹ سین نے چین سے باہر رہنے والے چینیوں کی مدد سے اپنی تحریک ۱۸۹۵ء میں ایک چینی جمہوری جماعت قایم کرکے شروع کی۔ مگر حکومت وقت کی سختیوں کی وجہ سے اُن کا چین میں رہنا ناممکن ہوگیا۔ چنانچہ وہ باہر چلے گئے۔ ۱۹۰۵ء میں ڈاکٹر سن یاٹ سین نے چین کی قومی جمہوری جماعت کومن ٹانگ نامی قایم کی۔ ۱۹۱۱ء میں اس جماعت نے ڈاکٹر مرحوم کی قیادت میں چین کے شاہی خاندان مانچو کے خلاف انقلاب کا جھنڈا بلند کیا۔ یہ تحریک جنوبی چین میں بہت زیادہ کامیاب ہوئی اور جنوبی چین کے انقلابیوں نے شمالی چین پر دھاوا بولدیا۔ چین میں شاہی ختم ہوگئی اور سن یاٹ سین چینی جمہوریت کے پہلے صدر منتخب ہوئے اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ چین میں ایک نیا قومی جمہوری نظام بہت ہی جلد قایم ہوجائے گا۔ مغرب نے بھی اس نئے تجربہ کو بہت دلچسپی سے دیکھا کیونکہ مغربی پارلیمنٹری طرز کی ایک نئی جمہوریت کے قیام کے بعد چین اور ممالک مغرب کے تعلقات میں بہت دور رس تبدیلیاں ہوئیں۔ مگر چین میں شاہی کے خاتمہ کے ساتھ ہی قومی مرکزیت اور سیاسی وحدت کے مضبوط رشتے ٹوٹ چکے تھے۔ نراج کی کیفیتیں پوری طرح سے پیدا ہوچکی تھیں اور چین کے شمالی صوبوں کی روایتی رجعت پسندی قبضہ و اختیار کی جنگ میں سن یاٹ سین کی تحریک کے مقابلہ میں حائل تھی۔ اسی لئے سن یاٹ سین کو گو جنوبی چین کے جمہوری علاقوں میں بہت زیادہ کامیابی ہوئی اور یانگسٹی کے علاقہ میں بھی وہاں کے فوجی سرداروں کو شکست دیکر شاہی ختم کرنے میں کوئی زیادہ مشکل نہیں پیش آئی مگر شمالی علاقوں میں مارشل یوآن شی کائی کے پاس ایک کثیر طاقت تھی جس کی مدد سے وہ چین پر ہر اس نظام حکومت کے تسلط کو ختم کرنے کے درپے تھا جو انقلاب پسند ہو۔ یوآن شی کائی دراصل ہر اُس نظام کے خلاف تھا جو چین کی اقتصادی زندگی میں ذرہ برابر مداخلت کرے۔ یہ اُس کی خالص رجعت پسند ذہنیت تھی ان شرائط کی منظوری پر مارشل یوآن شی کائی نئی تحریک سے مصالحت کے لئے بھی طیار تھا۔

حالات بہت خراب تھے اور ڈاکٹر سن یاٹ سین کی موجودگی میں یوآن شی کائی خانہ جنگی پر تلا ہوا تھا۔ چنانچہ نئی جمہوری حکومت کی منظوری اور قومی وحدت کی حفاظت کے مدنظر ڈاکٹر سن یاٹ سین نے چند ہی ماہ بعد چین کی صدارت سے استعفیٰ دیدیا اور مارشل یوآن شی کائی صدر منتخب ہوئے۔ اس طرح نئی چینی جمہوریت ایک رجعت پسند قیادت کے ماتحت شروع ہوئی۔ یوآن شی کائی کو سن یاٹ سین کے بتائے ہوئے سہ گانہ اُصول : قومیت، جمہوریت اور اشتراکیت سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ سن یاٹ سین ایک مضبوط اور متحدہ چینی ریاست کی تشکیل کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ غیر ملکی اثرات اور دباؤ سے آزاد ہوسکے، اُن کا منشا ایک جمہوری نظام حکومت کا قیام تھا کہ جو ملک کی ذمہ داریوں میں ہر شخص کو شریک ہونے کا موقعہ دے سکے۔ اس کے علاوہ وہ ایک ایسے اقتصادی طریقہ کے موید تھے کہ جو چین میں لوگوں کے لئے مادی فراوانی بہم کرسکے۔

بہرحال یوآن شی کائی کے صدر جمہوریت منتخب ہونے سے یہ تمام منصوبے خاک میں مل گئے۔ نئے صدر نے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے ہی پر اپنا وقت صرف کیا۔ چین نے محسوس کیا کہ اگر سن یاٹ سین کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل نہیں ہوتا ہے تو وہ ساری زبردست کوششیں جو انقلاب کو کامیاب بنانے میں کی گئی ہیں بیکار ہوجائیں گی۔ چین کے لئے یوآن اور شاہ مانچو کے درمیان کوئی فرق نہیں رہ گیا۔ اگر فرق تھا تو صرف یہ کہ مانچو کے زمانہ میں [illegible]

شباب نہیں تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں جنوبی علاقوں نے جس کا صدر مقام نانکنگ تھا۔ سن یات سین کی قیادت میں یوآن شی کائی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ مگر یوآن نے اس بغاوت کو کچل کر رکھدیا۔ سن یات سین کو کینٹن سے بھاگ کر چین کے اندرونی علاقوں میں پناہ لینی پڑی۔ مگر سن یات سین کے سامنے چین کا ایک مستقبل تھا اور اس مستقبل کی تشکیل کی ذمہ داری سن یات سین پوری طرح محسوس کرتے تھے چنانچہ انھوں نے روپوشی کی حالت میں بھی انقلابی تحریک کی تنظیم جاری رکھی۔

مگر ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ جاپان اتحادیوں کے ساتھ شریک تھا چنانچہ اس نے موقع پاکر شمالی چین میں جرمن مقبوضات پر قبضہ کرلیا۔ ۱۹۱۵ء میں جاپان نے یوآن شی کائی کی حکومت کے سامنے اپنے مشہور ۲۱ مطالبات پیش کئے جس کی منظوری کے بعد چین کی آزادی ختم ہوجاتی اور سارا چین، جاپان کی نوآبادی ہوجاتا۔ یوروپین ممالک جو اس وقت جنگ میں بری طرح سے پھنسے ہوئے تھے ایسی صورت میں کیا کرسکتے تھے؟ خود یوآن شی کائی بھی جاپان سے ہر شرط پر مصالحت کے لئے طیار تھا۔ بشرطیکہ اُس کا شخصی اقتدار قایم رہے۔ چنانچہ اسوقت یہ سمجھنا غلط نہ تھا کہ یوآن شی کائی، چین کو فروخت کر رہا ہے۔ اس نیلام کو باقاعدگی کے ساتھ پورا کرنے کے لئے دسمبر ۱۹۱۵ء میں یوآن شی کائی نے خود شہنشاہ چین ہونے کا اعلان کردیا۔ فوراً ہی ایک نیا انقلاب پھر شروع ہوگیا۔ مگر اس عرصہ میں یوآن شی کائی مرگیا۔ اور یوں چین ایک مرتبہ پھر متوازی حکومتوں اور مخالف طاقتوں کا اکھاڑہ بن گیا۔ آیندہ آٹھ برسوں تک چین میں یہ خانہ جنگی شدید طریقہ سے جاری رہی اور گو پیکین میں ایک کمزور حکومت برائے نام ایک صوبائی گورنر کے رحم وکرم پر موجود تھی مگر حقیقتاً ملک میں اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ ۱۹۱۷ء میں، اسی پیکین کی حکومت نے اس خیال سے کہ جاپان کے جارحانہ اقدام کے خلاف اس کو یوروپین حکومتوں کی امداد مل سکے گی جنگ عظیم میں شامل ہونے کا اعلان کیا۔ اور جب جنگ ختم ہوئی تو "صلح کانفرنس" میں اتحادیوں نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ وہ شانٹنگ سے جاپانیوں کو علٰحدہ کردیں۔ اتحادی اس کوشش میں ناکام رہے۔ چنانچہ چین نے معاہدۂ وارسائی پر مہر توثیق ثبت کرنے سے انکار کردیا۔ مگر اسکے باوجود چین جمعیت اقوام میں شریک ہوگیا گو چین کی نمایندگی جو حکومت کر رہی تھی وہ اختیار کے لحاظ سے بالکل تہیدست تھی

اس عرصہ میں چین کی انقلابی تحریک زوروں پر جاری تھی۔ ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء کے درمیانی عرصہ میں ڈاکٹر سن یات سین جنوبی چین میں پھر آگئے تھے اور انھوں نے چین کی جمہوری تحریک کی قیادت پھر سنبھال لی تھی۔ انھیں اپنی جماعت کومن ٹانگ کے کام کو از سرِ نو منظم کرنے کا موقعہ مل گیا اور گو چین میں ابھی تک کوئی قومی ریاست National State قایم نہیں ہوئی تھی مگر اس کے باوجود انھوں نے یہ بتادیا کہ وہ متحدہ طور پر عمل کرسکتے ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں جاپانی اشیاء کا بائیکاٹ ایک قومی عمل تھا جو قریب قریب سارے ملک میں کامیاب ہوا اور جس نے جاپانی پالیسی میں کافی ترمیم کرالی اور ۱۹۲۲ء کے معاہدۂ واشنگٹن کی رو سے جاپان کو بہت کافی دبنا پڑا۔ چین کی آزادی اور اسکی وحدت کے لئے جاپان، امریکہ، برطانیہ وغیرہ نے وعدے کئے اور چین میں تمام ممالک کی تجارت کے لئے خاص مراعات کے اُصول کو ختم کرکے مساوی حقوق کے اُصول کو تسلیم کیا گیا۔

اس کے علاوہ چین کی ابتر سیاسی حالات سے ناجائز فایدہ اُٹھانے کی مذمت بھی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ

۱۹ء میں جاپان نے منچوریا پر قبضہ کرکے اس معاہدہ کو توڑ دیا مگر ایک عرصہ تک اس معاہدہ سے چین کو خاص امداد
۱۹۱۹ء میں جاپانی اشیاء کے بائیکاٹ اور شان ٹنگ سے جاپانی تسلط کے ختم کئے جانے کے مطالبات کی وجہ سے چین
قلابی اور قومی تحریک پھر زوروں سے شروع ہو گئی۔ اس نئی تحریک کی لیڈر شپ نوجوان طالبعلموں کے ہاتھ میں
سن یاٹ سین کے جھنڈے کے نیچے قومی انقلاب کو طوفان کی شدت کے ساتھ پھیلا رہے تھے۔ اسی انقلابی
کی وجہ سے طلباء میں کمیونسٹ اثرات بہت تیزی کے ساتھ پھیلنا شروع ہو گئے۔ اس وقت روس میں اشتراکی
ب کامیاب ہو چکا تھا۔ اس اشتراکی انقلاب کی وجہ سے مشرق میں بھی اشتراکی جمہوریتیں قایم ہو گئیں۔ سائبیریا سے
افواج کو بھی نئے حالات کے مدنظر اپنے ملک بھاگنا پڑا چنانچہ چین کی نئی تحریک میں روسی پروپیگنڈہ زور دار ہو
لگا اور کمیونسٹ ایجنٹوں نے آکر چین کی سیاسی بساط پر اپنی چالیں چلنا شروع کر دیں۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں چینی کمیونسٹ
قائم ہو گئی۔ اس پارٹی کے لیڈر ماوزے تنگ اور "جنرل چوتیہ" ہر دو نہایت ہی تیز انسان تھے۔
۱۹۱۹ء سے پہلے سن یاٹ سین کو اپنی تحریک میں کمیونسٹوں کی طرف سے کوئی خاص مشکل نہیں پیش آئی تھی مگر کمیونسٹ
کے مستقل قیام کے مدنظر سن یاٹ سین نے اس امر کو مناسب سمجھا کہ وہ فوراً عمل کریں۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں
میں ایک نئی جمہوری حکومت کا اعلان ہوا۔ سن یاٹ سین اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔
مگر ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء کے درمیان عرصہ میں کومن تانگ اور کمیونسٹ پارٹی کے درمیان اختلافات پیدا
شروع ہو گئے۔ مگر روسی انقلاب پرست جانتے تھے کہ چین کے نئے قومی انقلاب سے انکا ایک عرصہ تک متعلق رہنا
ی ہے۔ اسی لئے ۱۹۲۳ء میں چین میں روسی انقلابیوں کے نمایندہ جافے Joffe اور
ٹ سین نے ملکر ایک نئے معاہدہ کی بنیاد ڈالی۔ اس معاہدہ کی رو سے کمیونسٹوں کے لئے کومن تانگ میں شامل ہونا
رار دیا گیا مگر ساتھ ہی ساتھ کمیونسٹوں کو اپنی علیحدہ جماعتی تنظیم بھی قایم رکھنے کی اجازت دی گئی۔ ڈاکٹر سن نے
یں کمیونزم کے فوری نفاذ کی مخالفت کی اور اس کو نامناسب بتایا۔ جافے نے اس مسلک کی تائید کی۔ جافے نے
ں نئے معاہدہ کے مطابق ایک متحدہ حکومت کے ماتحت چین کی قومی آزادی کے تحفظ اور قیام کے لئے روس کی
امداد کا وعدہ کیا۔ اس کے فوراً ہی بعد روس نے ایک دوسرے مشہور کمیونسٹ انقلابی بروڈین Borodin کو
کی نئی جمہوریت کی تشکیل میں مدد دینے کے لئے روانہ کیا۔ انھیں کے ساتھ انقلابی روس کے مشہور جنرل مارشل
و بھی بھیجا گیا تاکہ وہ چین کی فوج کی تنظیم کریں۔ دراصل اس وقت کی بین الاقوامی کمیونسٹ جماعت کا یہ خیال تھا
ں میں ایک متحدہ اور ترقی پسند حکومت کے قیام سے بین الاقوامی سرمایہ داری اور ملوکیت کو سخت نقصان پہونچے گا جو
مفاد کے مطابق ہوگا۔ اس کے علاوہ چیانگ کائی شیک جو اس وقت سن یاٹ سین کے خاص معاونوں میں تھے
روس میں سن یاٹ سین کے نمایندہ کی حیثیت سے قومی اور فوجی تنظیم کے کاموں کو سیکھ کر آچکے تھے نئے فوجی کالج
مدر بنائے گئے۔ اس ادارہ میں چین کے آیندہ فوجی افسروں کی طیاری کا کام شروع ہوا۔ اس سلسلہ سے ایک امر
نظر رکھنا چاہئے۔ سیاسی طور پر اس میں شک نہیں کہ من تانگ کی تنظیم نو مسیو بروڈین نے قریب قریب کمیونسٹ
پر کی تھی لیکن اس میں وہ عمومیت اور عسکریت نہیں پیدا کی جاسکتی تھی کہ جو کمیونسٹ پارٹی کا طرۂ امتیاز ہے

کیونکہ کومن ٹانگ بہرحال محض مزدور کسان انقلاب کے لئے نہیں بنی تھی۔ بایں ہمہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بروڈین نے سارے جنوبی چین میں سوویٹ پیمانہ کے مطابق مزدوروں اور کسانوں کی انجمنیں قایم کر دیں جن کی براہ راست قیادت کمیونسٹ پارٹی کے ہاتھوں میں آ گئی۔ یہی نہیں بلکہ کومن ٹانگ کے دائیں بازو نے جب اس اشتراکی نفوذ کے خلاف آواز اُٹھانا چاہی تو ۱۹۲۴ء میں اس کوشش کو دبا دیا گیا۔

مگر ابھی تک نئی جمہوری تحریک محض جنوبی علاقوں میں محدود تھی۔ چنانچہ سن یات سین ایک عام اتحاد کے حصول کے لئے شمال کے شہر پیکن اسی سال گئے تاکہ وہ جنرل چینگ اور دوسرے لیڈروں سے ملکر کوئی مصالحت کر سکیں۔ مگر ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر سن یات سین کا انتقال ہو گیا اور اس طرح انقلابی تحریک پھر بغیر کسی مشترکہ لیڈر کے ہو گئی۔ چنانچہ قیادت کی جنگ پھر شروع ہو گئی۔ لیو چنگ کائی جو سن یات سین کے سب سے زیادہ معتمد تھے اور جو کمیونسٹ ہونے کی وجہ سے کومن ٹانگ اور کمیونسٹ پارٹی کے معاہدہ کی روح رواں تھے وہ بھی مخالفین کی سازشوں سے قتل ہو چکے تھے۔ چنانچہ موسیو بروڈین، جافے، بلوچر وغیرہ کی حمایت سے جنرل چیانگ کائی شیک قومی تحریک کے لیڈر مان لئے گئے۔ اس اثنا میں سارے ملک میں مزدور کسان تحریک زوروں پر جاری تھی۔ ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ کسان زمینوں پر حق موروثی طلب کر رہے تھے۔

۳۰ مئی ۱۹۲۵ء کو شنگھائی میں ہڑتالیوں اور برطانوی افسروں میں جھگڑا ہو گیا۔ برطانوی پولیس نے ہڑتالیوں پر گولی چلائی۔ سارے ملک میں برطانیہ کے خلاف غم و غصہ کے جذبات عام ہو گئے اور اس کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی نے تمام غیر ملکی اثرات کے خلاف عام احتجاج بلند کرنا شروع کیا۔ برطانوی مال کا اس قدر زبردست بائیکاٹ کیا گیا کہ جس کے خسارہ کو برطانیہ آج تک پورا کرنے سے قاصر رہا ہے۔ اس تحریک کے زور پر ۱۹۲۶ء میں جنرل چیانگ کائی شیک نے شمالی علاقوں پر اپنی فوجوں کے ساتھ دھاوا بولدیا اور ہر جگہ کومن ٹانگ کے انقلاب کا اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ہی ہنکاؤ، شنگھائی اور نانکنگ وغیرہ پر انقلابیوں نے غیر ملکیوں کو سخت نقصان پہونچا کر اپنا قبضہ کر لیا۔

ان ہنگاموں سے کومن ٹانگ کے اندر اور باہر کے نرم سیاست داں سخت خائف تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے زبردست اقتصادی دباؤ اور غیر ملکی اثرات کے ماتحت ملک میں کمیونسٹوں کے خلاف ایک عام تحریک کرنا شروع کی۔ چیانگ کائی شیک کو اپنی قیادت اور اس قیادت کے توسط سے نئی قومی حکومت کی مرکزیت بہرحال قایم رکھنا تھی۔ چنانچہ چیانگ کائی شیک اور کمیونسٹوں میں سخت اختلافات پیدا ہو گئے اور جس کے نتیجہ میں شنگھائی اور دوسری جگہوں پر کمیونسٹوں کا قتل عام ہوا چیانگ کائی شیک نے ایک نئی مرکزی حکومت قایم کی جو پرانی کومن ٹانگ اور کمیونسٹ پارٹی کے ارکان پر مشتمل نہیں تھی بلکہ جس کے اراکین تمام کمیونسٹ دشمن حضرات تھے۔ کمیونسٹوں کا یہ زوال بہت کچھ اس انکشاف کی وجہ سے ممکن ہو سکا کہ روس سے موسیو بروڈین کے پاس یہ احکام آئے تھے کہ کمیونسٹوں کو چاہیئے کہ وہ کومن ٹانگ کی تمام اہم پوزیشنوں پر قبضہ کر لیں، دریائے یانگسی کی وادی میں ایک خالص کمیونسٹ فوج قایم کی جائے، کسانوں کو حکم دیا جائے کہ وہ بلا حکومت کی منظوری کے تمام زمینوں پر قبضہ کر لیں اور آخر میں کومن ٹانگ کو معطل کر کے چین میں کمیونسٹ انقلاب کر دیں۔ اس میں شک نہیں کہ بروڈین نے ان احکامات کو چھپانے کی کوشش کی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان پر ابھی عمل نہیں ہو سکتا

مگر ان کے ظاہر ہو جانے سے کمیونسٹ کا سیاسی اثر کم ہو گیا اور چیانگ کائی شیک کو اپنی قیادت تسلیم کرانے میں کوئی دقت نہیں پیش آئی۔

امریکہ، برطانیہ اور دوسری غیر ملکی حکومتوں نے چیانگ کی نئی حکومت کی بڑی مدد کی۔ مقبوضات، تجارتی حقوق اور دیگر مراعات واپس کر دئے گئے۔ دیگر مسائل کے لئے آئندہ سمجھوتہ کی امید دلائی گئی اور نئی حکومت کو قرضے بھی دئے گئے۔ مگر جنوب کے دو صوبوں یعنی یانگٹسی اور کیانگسی میں کمیونسٹوں نے سوویٹ طرز کی حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ چنانچہ سنہ ۳۴ء تک چیانگ کائی شیک کی حکومت نے ان صوبوں کے خلاف سات معرکے کئے۔ چیانگ کائی شیک اس وقت چین کے وزیر اعظم اور اس کے بعد مکمل ڈکٹیٹر ہو چکے تھے اور اسی لئے گو ان دونوں صوبوں سے کمیونسٹ اثرات کا اخراج ہو گیا مگر چونکہ چیانگ کو محض اپنی فوجی مضبوطی اور کمیونسٹوں کے خلاف جنگ کرنے سے ہی سروکار تھا اس لئے ملک کی عام اقتصادی حالت میں کوئی بہتری نہ پیدا ہوئی۔ جمہوری نظام کے قیام کا مسئلہ بھی تعطل میں پڑا ہوا تھا اور جاپان کی ریشہ دوانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔

چینی کی کمیونسٹ فوج نے جنوب کے علاقوں سے مغربی علاقوں کی طرف کوچ کر دیا جسے دنیا کا سب سے بڑا کوچ کہا جاتا ہے۔ اور چین کے مغربی اور شمالی مغربی علاقوں میں کمیونسٹ حکومت قائم کر دی گئی۔

منچوریا پر جاپان نے قبضہ کر لیا تھا اور کنٹن اور شنگھائی پر بھی اس نے حملے کئے تھے۔ چیانگ کائی شیک نے جاپان سے مصالحت کرنے کی کوشش کی۔ کمیونسٹوں نے اس اقدام کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ اور سنہ ۱۹۳۶ء میں ایک مشہور جنرل چانگ ہسوئے لیانگ نے چیانگ کائی شیک کو گرفتار کر کے کمیونسٹوں سے متحدہ محاذ قائم کرنے کا معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدہ کی رو سے شمالی اور مغربی علاقوں میں کمیونسٹ تسلط کو مان لیا گیا کہ جاپان سے لڑنے کے لئے ایک متحدہ محاذ قائم کرنا سب نے معاہدہ کیا۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں چین اور جاپان کے درمیان جنگ باقاعدہ شروع ہو گئی۔

ان تمام ہنگاموں اور جھگڑوں کے باوجود کومن ٹانگ نے سنہ ۱۹۲۸ء میں نانکنگ میں ایک کانگریس طلب کی جس نے ایک بنیادی قانون Organic Law پاس کیا اور گو اس قانون کا بہت سا نظام تغیر پذیر ہو چکا ہے اور ملک میں اب بھی آمریت قائم ہے مگر چین کے آئندہ سیاسی ارتقا پر اس بنیادی قانون سے بڑی روشنی پڑتی ہے۔ اس آئین کے ماتحت کومن ٹانگ ملک کی دو سب سے بڑی جماعت ہے کہ جسے ملک کی حکومت کی آخری ذمہ داریاں تفویض ہیں۔ اس نئے قانون کے مطابق حکومت پانچ جماعتوں پر منقسم ہے: انتظامی، قانون ساز، عدالتی، امتحانی اور عام نگرانی۔ یہ پانچ سرکاری مجلسیں دراصل مجلس وزراء سے علیحدہ چیز ہیں۔ مجلس وزراء دراصل ان افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو ان پانچ مختلف کونسلوں کے صدر اور نائب صدر کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ مجلس انتظامی سب سے اعلیٰ مجلس ہے جس کا کام وزراء کا تقرر کرنا اور ان کے کام کی عام نگہداشت ہے۔ مجلس قانون ساز تمام قانون بناتی ہے، میزانیہ حکومت منظور کرتی ہے اور انتظامی مجلس کے مشورے سے معاہدے کرتی ہے۔ گویا مجلس قانون ساز چینی آئین میں وہ چیز ہے جسے ہم مغربی پارلیمنٹ سے سب سے قریب ترین جماعت کہہ سکتے ہیں مگر دوسری مجلسوں کی طرح وہ منتخب شدہ جماعت نہیں ہوتی بلکہ کومن ٹانگ کے اراکین کو اس مجلس کے اراکین کی حیثیت سے مقرر کر دیا جاتا ہے۔ مجلس عدالتی

تمام عدالتوں کی اعلیٰ ترین مجلس ہے اور قانون کی تاسیس و تشکیل اس کا اہم کام ہے۔ امتحانی مجلس تمام تقرریوں اور ملازمتوں کی سب سے اونچی جماعت ہے کہ جو زمانۂ نامعلوم سے چین میں حکومت کے عہدیداروں کا انتخاب کرتی رہتی ہے اور جو شاید تمام آئینی تبدیلیوں کے باوجود چین میں باقی رہے۔ پبلک کے کسی کام کرنے کے لئے کوئی شخص مقرر نہیں ہو سکتا جب تک یہ مجلس اس کی منظوری نہ دیدے۔ مجلس نگراں کار دراصل ملک کے عام انتظام کی محاسب ہے اور اسے اس سلسلہ میں پورا اختیار حاصل ہے۔ انتظامی مجلس کا صدر شاید وہی چیز ہے کہ جسے مغربی ممالک میں وزیر اعظم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اسٹیٹ کونسل بھی ہوتی ہے جو شاید اختیار میں سب سے اونچی جماعت ہے اور اس کا صدر جمہوریت کا صدر رہوتا ہے۔ حکومت کے مشوروں کے لئے ایک ایڈوائزری کونسل بھی ہوتی ہے۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں ایک نئے مسودۂ آئین کا اعلان کیا گیا تھا۔ نظری طور پر اس مجوزہ آئین کی رو سے بہت سے نئے جمہوری حقوق اور اداروں کے اجراء کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس میں ایک قومی مجلس عام National Assembly کے قایم کرنے کا بھی وعدہ ہے۔ مگر یہ تمام حقوق کومن ٹانگ کی منظوری سے قایم رہ سکیں گے۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں ایک قومی کانگریس نے کہ جس کے چالیس فیصدی اراکین منتخب شدہ تھے اور بقیہ محض کومن ٹانگ کے مقرر کردہ، اس آئین کو منظور کیا۔

سنہ ۱۹۳۷ء سے کہ جب سے چین اور جاپان برسرِ پیکار ہیں، چین کا ایک بہت بڑا علاقہ جاپان کے ماتحت آ چکا ہے اور وہاں جاپان نے چیانگ کائی شیک کے مقابلہ میں ایک متوازی حکومت وانگ چنگ وائی کی سرکردگی میں مقرر کر دی ہے۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں جب جاپان نے نانکنگ پر قبضہ کر لیا، تب سے چیانگ کائی شیک کی حکومت اندرونی چین میں چنکنگ کے مقام میں چلی آئی ہے اور وہاں سے چین، جاپان کے خلاف اپنے متحدہ محاذ جاری رکھنے میں کامیاب ہے۔

دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء تک کہ جب امریکہ اور برطانیہ نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے، چین کو جاپان سے لڑنے میں سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ سوائے روس کے دنیا کی کسی حکومت نے چین کی مدد نہیں کی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ۱۹۴۱ء تک روس نے چین کی مدد نہ کی ہوتی تو آج چین ختم ہو گیا ہوتا۔ سنہ ۱۹۴۲ء کے قبل رنگون سے چنگ کنگ تک ایک سڑک برما روڈ کے نام سے بنائی گئی تھی تاکہ چین کو سامان جنگ پہونچایا جائے مگر جاپان حکومت کے شدید مطالبہ کے مطابق برطانوی حکومت نے پہلے اسے خود ہی بند کر دیا اور اس کے بعد جاپان اور متحدہ اقوام سے لڑائی شروع ہونے پر برما، جاپانیوں کے پاس چلا گیا جس سے چین ایک عرصہ تک بہت زیادہ دبا رہا۔

بین الاقوامی جنگ کا اب رُخ بدل رہا ہے۔ یورپ میں جرمنی کی شکست چند مہینوں میں پوری ہو جائے گی۔ بر اور بحر الکاہل میں جاپان کے خلاف سخت اقدامات جاری ہیں، جاپانی ہر طرف پسپا ہو رہے ہیں۔ اور وہ وقت بھی دور نہیں جب متحدہ اقوام ٹوکیو میں اپنا جھنڈا لہرا رہی ہوں گی۔ ایسی صورت میں چین کے آیندہ سیاسی ارتقاء کے متعلق کیا اُمیدیں قایم کی جا سکتی ہیں؟

گو چین کے متحدہ محاذ کے مدنظر اور جاپان کے خلاف جنگ کو ہر طرح سے کامیاب بنانے کے لئے چینی کمیونسٹ پارٹی اس وقت تک خاموش ہے مگر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ چین کی بہترین افواج مغرب اور شمال مغربی کمیونسٹ علاقوں

ے ہوسکے اب بھی پڑی ہیں درانحالیکہ چین کی کمیونسٹ فوج جاپان کے خلاف برابر لڑ رہی ہے تو کیا یہ امید کیجا سکتی
بنگ کے خاتمہ پر کومن ٹانگ اور کمیونسٹ پارٹیوں کے اختلافات شدید طور پر منظر عام پر نہ آجائیں گے؟ ۱۹۴۶ء
یانگ کائی شیک نے جس مجوزہ دستور کا اعلان کیا ہے اس سے چینی کمیونسٹوں نے اپنی مخالفت کا اظہار کر دیا ہے
ن کے خیال کے مطابق چیانگ کائی شیک کے مجوزہ نئے آئین میں سن یاٹ سین کے تین اصولوں یعنی قومی اتحاد،
ی جمہوریت اور اقتصادی اشتراکیت کو پس پشت ڈالدیا گیا۔ اس کے علاوہ امریکہ، برطانیہ اور روس تینوں اس
برابر متمنی ہیں کہ چین کا آیندہ سیاسی، اقتصادی اور فوجی ارتقاء اس طرح سے ہو کہ مشرق بعید میں اُن کے مفاد
رہ سکیں۔ چین میں ممالک مغربی کی نوآبادیات کا سوال ابھی تک نہیں حل ہوا ہے۔ اس کا بھی ڈر ہے کہ چین پر الکیہ
یں غیر ملکی سرمایہ غالب نہ ہوجائے۔ محض ۱۹۴۰ء تک امریکہ کے ۴۰ کرور ڈالر اور برطانیہ کے ۴۵ کرور پونڈ چین میں
لے تھے۔ روس نے اپنا کس قدر سرمایہ چین میں اتنے عرصہ میں کھپایا ہے اس سے دنیا ناواقف ہے۔ کیا ایسا نہیں
ناکہ آیندہ چلکر چین اور مشرق بعید میں ان ممالک کے مفادمیں تصادم پیدا ہوجائے؟ اس کے علاوہ روس بجائے
ل مشرقی اور شمال مغربی علاقوں سے اپنے تسلط کو ختم ہوتے ہوئے ہرگز نہیں دیکھ سکتا۔
یہ وہ مسایل ہیں کہ جو چین کے سامنے کچھ ہی عرصہ میں پیش ہوں گے اور پوری شدت کے ساتھ پیش ہوں گے، ان
مل محض اس چیز پر مبنی ہے کہ مستقبل میں چینی قوم کسقدر زیادہ سن یاٹ سین کے تین اُصولوں پر عمل کر سکتی ہے۔

محمد مُبین بی۔ اے

نئے شاعر

جعفر علی خاں اثر نے نگار - اپریل سنہ ۴۲ء میں ایک جگہ لکھا ہے ـــــ " اصل یہ ہے کہ موجودہ دور اُردو شاعری کا عہد زریں ہے - اُردو نے کسی زمانے میں ایسے اچھے شاعر اتنی تعداد میں پیدا نہیں کئے" ـــــ اور اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں - یہی نہیں کہ اتنے اچھے شاعر اس دور میں پیدا ہوئے - بلکہ ادب کی مقبولیت کا دائرہ بھی پہلے سے کہیں زیادہ وسیع ہوگیا ہے اور تنقیدی شعور نہ صرف بڑھ چلا ہے - بلکہ ایک واضح اور بلند معیار بھی اختیار کرتا جارہا ہے اُردو ادب میں بحیثیت مجموعی ایک عام بیداری - گہرائی - تنوع اور معنویت آ چکی ہے - اور پہلی مرتبہ نثر، شاعری سے فایدہ اُٹھا رہی ہے اور شاعری نثر سے بہت کچھ سیکھ رہی ہے - یہ میل یہ اتحاد پہلے نہیں تھا نثر کی ایک اور اہم خصوصیت اس دور کی جس کو شاید ابتک ہم لوگوں نے محسوس نہیں کیا ہے - وہ شاعری میں فارسی کا رچا ہوا مذاق ہے - ممکن ہے یہ بات تعجب خیز معلوم ہو ـــ مگر ہے کچھ ایسا ہی - فارسی پڑھنے والوں کی تعداد اسوقت بہت کم ہے اور اُن میں سے فارسی ادب کا صحیح مذاق رکھنے والوں کی تعداد اور بھی کم - ہندوستان میں اس وقت فارسی کا کوئی اچھا اور نمایاں شاعر بھی نہیں - مگر ان سب باتوں کے باوجود اردو نے کئی صدیوں کے بعد فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کو اب ہضم کیا ہے - پچھلے شاعروں میں ایک غالب کو چھوڑ کر اور کسی کے کلام میں بھی فارسی کی اتنی دلآویز آمیزش نہیں ملتی جتنی آجکل - غزلگو شعرا میں حسرت، فانی، اصغر، جگر، فراق، اثر اور نظم میں اقبال، جوش، مجاز اور دیگر شعرا کے یہاں فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبیں جس خوش اسلوبی اور دلکشی سے آئی ہیں اس کی مثال اُردو کے کسی اور عہد میں کمیاب ہے - کہنے کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ فارسی دانی بڑھ گئی ہے - بلکہ صرف اتنا کہ اُردو نے فارسی کے جو کچھ اثرات قبول کئے تھے ان کو اب کہیں جا کر اپنایا ہے -

" اچھے شاعروں " سے جناب اثر کی مراد غالباً حسرت، فانی، جگر، فراق، اقبال، جوش اور شاید چند نوجوان شعرا سے ہے - اس فہرست میں نہ صرف اچھے شاعر شامل ہیں بلکہ بڑے شاعر بھی - مگر ان کے بعد ہی جو جماعت آتی ہے اُس میں اچھے شاعر تو ہیں مگر بڑا شاعر کوئی بھی نہیں - غزل تو خیر یوں بھی پس پشت پڑ رہی اور کافی مطعون ہو رہی ہے مگر نظم نگاری میں بھی اقبال اور جوش کے بعد اس پایہ کا شاعر کوئی فی الحال تو نظر نہیں آتا اور نہ آیندہ اس کی زیادہ توقع کی جا سکتی ہے - اس لئے کہ آیندہ شاعری کے پڑھے جانے کے امکانات تو ہیں مگر شاعر اور خصوصاً نظم گو شاعر کے پیدا ہونے کے امکانات کم ہیں - مستقبل میں اگر کسی قسم کی شاعری ہو سکے گی تو وہ غزل ہی ہوگی - وقت کی کمیابی، نثر کی جامعیت اور بلند معیاری نظم سے بہت کچھ چھین لے گی - یہی وجہ ہے کہ آج زیادہ طویل نظمیں نہیں لکھی جا رہی ہیں - زمانہ کی موجودہ

رفتار دیکھتے ہوئے امید ہے کہ سائنس، تجارت، اور سیاست کا پھیلاؤ عالمگیر ہو جائے گا اور انھیں مسایل کی اہمیت رہ جائے گی جن کا تعلق اُن سے ہے۔ نفسیات۔ فلسفہ اور دوسرے پیچ در پیچ کاروباری مسایل کا بار اولاً تو نظم یوں بھی نہ سنبھال سکے گی دوسرے یہی مسایل زیادہ سنجیدہ واضح اور عالمانہ انداز میں نثر میں پڑھے اور لکھے جائیں گے انھیں نظم میں پیش کرنے کا خیال کچھ بچکانہ سا معلوم ہونے لگے گا۔ اس کے علاوہ اُس دور "عقلیت" میں شاعری کا دبا دو بہت کچھ ٹوٹ چکا ہے۔ ایسی صورت میں شاید غزل ہی سخت جان ثابت ہو سکے جس کے کہنے اور پڑھنے کے لئے ممکن ہے وقت نکل آئے اور چونکہ اس صنف پر خاص طور سے کسی نظریے کی مہر نہیں لگی ہوتی اور اس کا تعلق براہ راست ہماری مرکزی شخصیت اور جذبات سے ہوتا ہے اس لئے اگر شمع انجمن نہ ہو گی تو "چراغ خانہ" کم از کم ہو جائے اور کبھی کبھی ریڈیو اور سینما میں بھی گائی جائے۔ شاعری کا کام تو شاید ختم ہو چکا۔ اب تک شاعری تہذیب نفس کا جو کچھ سامان بہم پہنچا چکی اور ذہن انسانی کو جس سطح پر لا چکی ہے اس کے کافی یا ناکافی ہونے کا فیصلہ تو نہیں کیا جا سکتا البتہ اس کے اثرات اب اور بڑھتے نظر نہیں آتے۔ پہلے آبادی زیادہ نہیں تھی اسی لئے شاعری کا اثر محدود ہوتے ہوئے بھی مستقل اور دیرپا تھا اب آبادی کی کوئی تعداد ٹھیک سے معین نہیں کی جا سکتی اور اسی لحاظ سے ضروریات زندگی اور ان سے متعلق دوسرے مسایل بھی لاتعداد ہو چکے ہیں اور ان کا تعلق براہ راست شاعری سے اب کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے۔ پریس۔ ریڈیو۔ اور نقل و حرکت کے آسان ذرایع کے باوجود شاعری کے اثرات مستقل اور دیرپا نہیں ثابت ہو سکتے۔ شاعری کا کام کہنے کو عام دماغوں کی تربیت کرنا ہے مگر اس سچ میں جھوٹ بہت شامل ہے۔ شاعری واقعی محدود سے چند آدمیوں کی زندگی کی تعمیر اور تشکیل میں مدد دے سکتی ہے۔ اس سے زیادہ اس کا حلقۂ اثر وسیع نہیں ہو سکتا — اور یہ شاعری کا کچھ کم کارنامہ نہیں ہے۔ انسان کو کسی قسم کے مادی فایدہ کی امید دلائے بغیر بدل دینا کسی اور قوت کے بس میں نہیں۔ ایک شاعری ہی پر موقوف نہیں ہے۔ مجموعی طور پر ادب کا حلقہ بہت محدود ہے۔ "جنتا" پر تقریر یا شاعری نما تقریر کا اثر تو پڑ سکتا ہے مگر "شاعر" کا نہیں — غالب اور اقبال، میر اور مومن کا نہیں! اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں بھی تعلیم کی بہت کمی ہے۔ ایسا نہیں بھی نہیں ہوا اور اگر ہوا بھی تو اس عہد میں نہیں۔ تعلیم کو ذرا اور عام ہونے دیجئے (اور ایسا ہو رہا ہے) پھر دیکھئے شاعری سے خاص طور پر اور ادب سے عام طور پر دلچسپی بڑھتی ہے یا نہیں۔ یہ اُن لوگوں کی بد مذاقی کی دلیل نہیں ہو گی۔ بلکہ ان لوگوں کو اس سے اہم چیزیں پڑھنی ہوں گی جو اجتماعی بہبودی کے حق میں بہتر ثابت ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں یہ دور چاہے جو کچھ بھی ہو — بحرانی سرسامی برزخی — مگر ہے غنیمت ادب کی جو وسعت اور رسائی اس دور میں ہے۔ پھر مشکل ہی سے ہو سکتی ہے دوسرا اقبال یا جوش پھر شاید نہ پیدا ہو۔ جدید شعرا میں، میری مراد مجاز فیض۔ راشد۔ جذبی۔ سلام۔ یوسف ظفر وغیرہ سے ہے۔ کوئی بھی بڑا شاعر نہیں ہے۔ ان میں اچھے اور بعض بہت اچھے شاعر ہیں۔ مگر بڑا کوئی بھی نہیں۔ ایک صرف شاعری ہی پر کیا منحصر ہے زندگی کے کسی شعبہ میں بھی بڑی شخصیت اب نہیں پیدا ہو رہی ہے۔ مغرب میں برنارڈ شا کے بعد ادبیات میں اس پایہ کی کوئی دوسری شخصیت نظر نہیں آتی۔ سیاست کے میدان میں چرچل اور اسٹالن کے بعد کوئی اور نہیں ہے۔ ہندوستان میں بڑے یا ہے لے جناح اور گاندھی کے بعد نا — بات یہ ہے کہ اب انفرادیت

اور استبدادیت کا زمانہ ختم ہو رہا ہے اس کی جگہ جمہوریت۔ تعاون اور اتحاد کا زمانہ آرہا ہے جس میں کسی اہم کام کے انجام دینے کے لئے تعاون ناگزیر ہے۔ اجتماعی ذمہ داری کا احساس بڑھ چلا ہے۔ اس حوصلہ شکن تصور (شاعری کے لحاظ سے) کے بعد سوال یہ اُٹھتا ہے کہ ہمارے موجودہ شعرا کو کیا کرنا چاہئے۔ ہم کسی شاعر کے محاسن اور معائب تو گنوا سکتے ہیں۔ مگر اس کی رہنمائی قطعاً نہیں کر سکتے۔ اُسے یہ تو بتایا جا سکتا ہے، یہ چیز نہ کرو مگر یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ 'یہ چیز' کرو۔ اس کا سروکار شاعر کی ذات اور اس کے ظرف سے ہے۔ اس انقلاب کا جس سے دنیا دوچار ہونے والی ہے ابھی مشرق پر کم ازکم ایک صدی تک تو ایسا اثر پڑتا نظر نہیں آتا جس کی وجہ سے ادب سے بے اعتنائی برتی جانے لگی۔ اس دوران میں ہم آگے بڑھتے چلے جائیں ـــــ پھر اللہ مالک ہے۔ زمانہ پر یقینی طور پر کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ ممکن ہے جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے حرف بکواس ثابت ہو اور دنیا قدامت پرست ہو جائے (رجعت پسند کے معنوں میں نہیں) ـ یا پھر وہی ہو جس کا اندیشہ ہے ـــــ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا ـــــ مایوسی اور دہشت امید اور اضطرار تلاش اور انتظار ـــــ کیا ہوگا ؟ کیا ہونے والا ہے ـــــ ؟ آنے والے لوگ ہمیں پہچان سکیں گے ؟ ہم اُنھیں کچھ دے سکیں گے ؟ ـــــ ہمارا تمدن۔ ہماری معاشرت۔ ہماری روایات۔ ہماری شاعری۔ ہمارا ادب ـــــ ان میں سے کسی کی اُنھیں ضرورت ہوگی ؟ ـــــ یہ ہم اثبات میں کہہ سکتے ہیں مگر دبی زبان سے ـــــ یہ ہم کہہ سکتے ہیں کھُل کر بہانگ دہل ! ـــــ ان میں سے ہر چیز کی اُنھیں ضرورت ہوگی۔ وہ اس کے بغیر زندہ نہ رہ سکیں گے ! ـــــ

ان دو نظریات اور شخصیت کے شاعر اس زمانہ میں ہو سکتے ہیں۔ موخرالذکر قسم کے شاعر جن میں جذبہ تیقن اور خود اعتمادی پائی جائے، بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ اقبالؔ اور جوشؔ۔ جوشؔ اور اقبالؔ انھیں دو ناموں کو آج دہرایئے ؎

عالم نو ہے ابھی پردۂ افکار میں　　میری نگاہوں میں ہے اُس کی سحر بے حجاب　　اقبالؔ

یا پھر ؎　نہ ستاروں میں ہے نے گردشِ افلاک میں ہے　　تیری تقدیر مرے نالۂ بے باک میں ہے　　اقبالؔ

اور جوشؔ کی یہ مغرور آواز ؎

مرے غرور کے ماتھے پہ آ چلی ہے شکن　　بدل رہی ہے تو بدلے ہوا زمانے کی

یا

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لئے　　اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

ہر شاعر کو نصیب نہیں ہو سکتی اور نہ ہر شخص کے منہ پر کھلتی ہے۔ حالانکہ اس 'بالغ نظری' کے دعوے کے ثبوت میں جوشؔ کا ذاتی سرمایہ بہت کم ہے۔ مگر ان کے پاس لہجہ ہے ـــــ بڑے شاعروں کا ! جو مستحکم ہے اور دعوے کے ثبوت کے لئے بہت کافی ہے۔

اول الذکر قسم کے شاعر جو تذبذب۔ تحیر۔ یاس اور امید کی کشمکش میں مبتلا ہیں وہ زیادہ تر جدید شاعر ہیں ؎

دل کے ایواں میں لئے گل شدہ شمعوں کی قطار　　نورِ خورشید سے سہمے ہوئے اُکتائے ہوئے

اور ؎　　اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

ان کے علاوہ ایک اور جماعت ہے نئے شاعروں کی جس میں مجازؔ۔ فیضؔ۔ راشدؔ۔ جذبیؔ وغیرہ کے بعد کے شعرا آتے ہیں

شاعروں کی ایک آواز - ایک انداز - قریب قریب ایک بحر اور ایک سطح ہے - ان میں سے زیادہ تر شعرا کی سطح - میں پنجابی شعرا کا حصہ زیادہ ہے - فیض احمد فیض کا کلام ہے - ہر شاعر کا کلام فیض کی میزان شاعری پر رکھ کر تول لیجئے ابہام - وہی غنودہ نغمگی - وہی ماورائیت پیدا کرنے کی کوشش ملے گی جو فیض کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے - یہ عجیب ہے کہ پنجاب کے موجودہ شعرا پر سب سے زیادہ اثر فیض کا ہے اور اقبال کا کچھ بھی نہیں - اقبال کا اثر بیرون پنجاب شعرا نے قبول کیا - جس کی سب سے نمایاں جھلک علی سردار جعفری کی نظموں میں ملتی ہے - کوئی صاحب امین حزیں کو سلسلے میں نہ پیش کر دیں - ان کے خلوص مقصد سے ممکن ہے انکار نہ ہو سکے مگر شاعرانہ خلوص کا اقرار ناممکن ہے - ال میں جو چیز بعض اوقات کھٹکنے لگتی ہے وہ ان کا زہد - پارسائی یا ملائیت ہے - یہی ملائیت تمام و کمال امین حزیں میں ہے - اقبال کا فارسی اور اردو کلام پڑھنے سے کبھی کبھی جو احساس ہوتا ہے وہ یہ کہ اردو میں کہیں کہیں، خصوصاً ضرب کلیم" میں ایک طرح کی مذہبی عصبیت یا ملائیت مترشح ہو جاتی ہے مگر فارسی میں "شیشہ و پیمانہ" اسے چھپا لیتے ہیں بت وہاں انھیں کچھ اور انسانیت قبول کرنے پر مجبور کر دیتی ہے - بات میں بات نکل آئی - کہنا یہ تھا کہ اقبال کا اثر ب کے شاعروں پر زیادہ نہیں رہا - فیض کا فیضان البتہ ہر شاعر کی نظموں میں نظر آتا ہے خواہ وہ کسی صوبہ کا شاعر ہو نثنائے مجاز ـــــ مجاز کی اپنی ایک شخصیت ہے جو اگر اہن مدت ہو سکتی ہے تو اپنے سے بڑے شاعر کی فیض کے سے جذبی ایسا خود پرست شاعر بھی نہیں بچ سکا - مگر جذبی نے اس اثر کو اپنا لیا ہے - جاں نثار اختر میں یہ اثر زیادہ ل ہے - موجودہ شعرا میں سب سے کمزور شخصیت انھیں کی معلوم ہوتی ہے ان کے کلام میں کبھی جوش - کبھی مجاز ہی کبھی فیض کا رنگ پایا جاتا ہے - فیض کا اتنا اثر نئے شعرا نے کیوں قبول کیا اس کے کئی اسباب ہیں - فیض کا لب و لہجہ - یقیت - لذت پرستی - بحروں کا انتخاب زندگی تک رسائی (approach) کا طریقہ ـــ کسی دری بات کو اس طرح کہہ دینا کہ ادھوری رہتے ہوئے بھی قاری کے ذہن میں کچھ تکمیل کا احساس اور کچھ مابعد الطبیعاتی ات اور احساسات چھوڑ جائے - یہ تمام چیزیں نئے شاعروں کو اپنے دل و دماغ کی تشکیل کے لحاظ سے بہت سہل الحصول م ہوئیں ـــ یہی نہیں، انھوں نے اپنے کو اسی طرز میں سوچنے اور محسوس کرنے پر مجبور بھی پایا - فیض کی بڑی کمزوری ے کلام کی یکسانیت اور ایک محدود داخلیت کے ذریعہ محسوس کرنے کا طریقہ ہے - پھر بھی فیض خراب ہونے سے بچ گئے ا یہ مابعد الطبیعاتی داخلیت اور ابہام بڑی حد تک ان کی مکمل شاعرانہ شخصیت ہے جس کو کوئی خارجی تحریک زیادہ نہیں کر سکتی نہ اثر انداز ہی ہو سکتی ہے ـــ یہ فیض کا صرف احساس ہے ـــ

اب یہاں کوئی نہیں ـــ کوئی نہیں آئے گا !

سمجھنے کی کوشش ہمیشہ خطرناک ہوگی اور سمجھ کر لکھنے کی کوشش ناکام - چنانچہ یہ تاثر جو فیض کے قلم سے ٹپک پڑا ہے - کی نظموں میں زیادہ سے زیادہ ایک "گر" یا ہنر بن کر رہ جاتا ہے - جو احساس سے خالی ہے ـــ

خواہ زنجیر جھنکتی ہی جھنکتی ہی رہے

یا

وہ ہاں مگر تیرے سوا - تیرے سوا - تیرے سوا

نئے شعرا کو فیض کے تتبع سے جو چیز ملی ہے وہ اجمال ـ ابہام ـ یک رنگی اور وقتی شہرت ہے۔ فیض کا یہ اثر ملاحظہ ہو ـ

راگ اب کیا ہے، فقط آگ مرے کمرے کی
اور میں ہوں ـ مری تنہائی، مری تنہائی !

یوسف ظفر

اور آگے چلئے ـ لب و لہجہ کی مماثلت ذرا دیکھئے ؎

مُسکرا لے کہ یہ منظر نہیں ـ رونے کے لئے
مُسکرا لے کہ یہ رونے سے کہیں بہتر ہے
مُسکرا لے کہ تجھے بعد میں مرنا ہوگا

یوسف ظفر

اب ذرا فیض کی نظم "بول" کا آخری حصّہ ملاحظہ ہو:

بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے !

فیض کی مشہور نظم ہے "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ"۔ ساحر لدھیانوی کی نظم ہے اور کامیاب نظم ـ "میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھسے"۔ اس نظم کے بنیادی تخیل کے لئے ساحر صاحب فیض کی نظم کے رہینِ منت ہیں گو پیرایۂ بیان جداگانہ ہے ـ کوئی صاحب صہبا لکھنوی ہیں ان کی ایک نظم "زلزلہ" کے عنوان سے نومبر ۴۲ء کے ہمایوں میں شایع ہوئی ہے ـ اُس کا پہلا ہی مصرع ملاحظہ ہو :

اُف یہ ہنگامِ جوانی، یہ سُلگتی ہوئی شام

فیض کا مصرع ہے ؎

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام

یہی نہیں سنہ ۴۲ء ـ ۴۳ء کی نظموں کا مجموعہ دیکھ لیجئے ـ کم و بیش ہر نظم میں ـ اسی آواز ـ اسی بحر ـ اسی لہجہ کی نقالی کی کوشش کی گئی ہے ـ آپ نظموں کو پڑھئے اور آپ کی طبیعت ان یکساں ـ یک رنگ ـ اُلجھی ہوئی اور بے سر و پا نظموں کی سطحیت اور کھوکھلے پن سے ادب جائے گی ـ ان لوگوں کو اگر اسی بحر اور اسی طرز میں کہنا ہے تو کم از کم اپنی ایک علحدہ آواز اور مستقل شخصیت تو رکھیں ـ ورنہ ایسی تو یہ کوشش فیض کی ناکامیابی اور دوسرے شعرا کی کمزوری سے زیادہ اور کوئی معنے نہیں رکھتی ـ نئے شعرا نے ن ـ م ـ راشد کو زیادہ ہاتھ نہیں لگایا اس لئے کہ راشد کی دماغی ساخت فیض سے بہت مختلف ہے ـ راشد کے یہاں لذت پرستی تو ہے مگر ساتھ ہی خشونت بھی ـ اُن میں فنادگی بالکل نہیں ہے ہاں "تھکن" کا احساس ضرور ہوتا ہے اور لہجہ سے قدرے کرختگی بھی ظاہر ہو جاتی ہے ـ علاوہ اس کے راشد کا انداز بیان ذرا بیگانہ بھی ہے ـ ان کا کلام پُرانی قدروں (values) سے بغاوت کے باوجود کلاسیکی وضاحت اور سنجیدگی لئے ہوئے ہے جس میں دعوت کام و دہن زیادہ نہیں ـ لیکن لگے ہاتھوں اس رنگ کو بھی دیکھتے چلئے ؎

زندگی کے بیکراں مرگھٹ میں دیکھ
میری راتوں کی کئی لاشوں کے ڈھیر - یوسف ظفر

یہ شعر (خواہ وہ غیر محسوس طور ہی پر کیوں نہ ہوا ہو) راشد کے اس مصرع سے بنا ہے ؎
بیکراں رات کے سناٹے ہیں

"اطلس"۔ "مخمل خواب کا فرش طربناک"، "شمع شبستان وصل" یہ ترکیبیں اور الفاظ جو راشد کے کلام میں پائے جاتے ہیں ان شعرا کے یہاں بار بار دہرائے ہوئے ملتے ہیں - ایسا کیوں ہے ؟ اس کا جواب یہ نہیں دیا جا سکتا کہ یہ تمام شاعر ایک طرح سوچتے اور محسوس کرتے ہیں ـــــ کیا کیا جائے زمانہ ہی ایسا ہے - ورنہ دوسرا سوال یہ اٹھتا ہے کہ پھر فیض - راشد - مجاز - جذبی اور سلام کی آوازیں مختلف کیوں ہیں - اس کا صرف ایک جواب ہے ان شعرا میں بل بوتہ نہیں ہے - یہ شعرا کلاسیکی شاعری کے فیضان سے محروم ہیں اور انھوں نے جدید شاعری کو جیتے جی روایتی شاعری بنا ڈالا ہے - گل و بلبل - لیلیٰ مجنوں - آشیانہ و قفس - یہ علامات اب بہت کم استعمال ہوتی ہیں - شیشہ و ساغر البتہ اب تک مشرب میں داخل ہے - ان کی جگہ نئی علامتیں (Symbols) گڑھ لی گئی ہیں - اس میں کوئی مضایقہ نہیں تھا - مگر یہ علامتیں بغیر محسوس کئے ہوئے وضع کی گئی ہیں - محض جدت طرازی کی بنا پر - اور انکی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ان میں وہ روایتی خون نہیں دوڑتا جو نئی شاعری کی تعمیر میں ممد و معین ہو سکے - "سنگ آستاں" "پنچھی" - "پگڈنڈی" - "سڑک" اور اسی قسم کے چند اور الفاظ اور بعض ایسی علامتیں بھی جنھیں شاعر کے سوا اور کوئی نہیں سمجھ سکتا بار بار بالتکرار بغیر سمجھے بوجھے دہرائی جاتی ہیں - روایتی اسلوب بیان سے تو پیچھا چھڑایا جا سکتا ہے مگر روایات سے پیچھا چھڑانا محض ایک فریب ہے - یہ تاریخی غلطی اور ارتقائی قوتوں کا بطلان ہے - ہمارے نئے شاعر ابہام کے بہت دلدادہ ہیں حالانکہ انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہر بڑا شاعر ابہام سے بچتا ہے - اس کی زندگی میں ایک دور ابہام کا ضرور آجاتا ہے - مگر وہ ابہام برائے ابہام کا قایل کبھی نہیں ہوتا - اس میں شک نہیں کہ ابہام شعر کو زیادہ سا - وسیع اور دلکش بنا دیتا ہے مگر یہ بات صرف اُس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہنے والے کے سامنے کوئی واضح تصور ہو یہ نہیں کہ ایک مبہم - غیر واضح اُلجھی ہوئی تخیل کو اور زیادہ مبہم بنا کر پیش کر دیا جائے - یہ شاعری نہیں دھوکا دینا ہے خود کو اور پڑھنے والے کو ـــــ یہ اعتراف شکست ہے اپنے ذہنی انتشار کے مقابلہ میں - اس ابہام سے آجکل بہت کم شاعر بچ سکے ہیں - وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ دور عبوری ہے مستقبل ناپید ہے اور نئے شعرا ماضی سے روگرداں اور روایات کو ٹھکرا چکے ہیں - نظریات لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہوتے جا رہے ہیں - زندگی کا کوئی واضح نظریہ اب تک نہیں قایم ہو سکا ہے - سیاست کے بغیر شاعری میں چاشنی نہیں آسکتی جیسے پہلے تصوف تھا (تصوف برائے شعر گفتن خوب است - علی ہذا) واقعی سیاست ہماری زندگی کا ایک جز ہے جس سے ہم آنکھیں نہیں چرا سکتے - مگر پھر بھی ان آئے دن کے تغیرات میں کوئی نظریہ صداقت اور خلوص کے ساتھ کیسے قبول کیا جا سکتا ہے، ایسی صورت میں انھیں لامحالہ ابہام کے دامن میں پناہ لینی پڑتی ہے - علاوہ ازیں خود نئے شعرا کی زندگی متضاد جذبات کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے ـــ دل کچھ کہتا ہے - دماغ کچھ کہتا ہے ـــ عقل کچھ اور کہتی ہے [illegible]

وہ کریں تو کیا کریں ــــ اس قدر انتشار ــ زندگی کی اس قدر تیز روی۔ اشاعتی مقابلہ، اور جنگ ــ وہ مجبور ہیں اُن کی زندگی بھرپور نہیں ہے اور اگر وہ دس پانچ اچھی نظمیں کہہ ڈالتے ہیں تو یہ ان کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ آ دس پانچ اچھی نظمیں کہنا ' لانا ہے جوئے شیر کا ' ــ اور پھر اس کوہکنی کے بعد انکا وہی حشر ہوتا ہے جو کوہکن کا ہوا وہ اپنے ہی تیشہ سے خودکشی کر لیتے ہیں۔ در اصل نئے شعرا اچھی نظموں سے زیادہ اچھی شاعرانہ فضا دیتے ہیں۔ ا نظمیں شروع سے آخر تک ایک ہموار اچھی شاعرانہ فضا پیدا کرنے میں کامیاب ضرور ہو جاتی ہیں۔ ان کی قوتیں منتشر ہ ان کے تجربات بہت محدود ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ بڑی نظمیں نہیں کہہ پاتے۔ انکا ایک دیوان اور انیس کا ایک مرثیہ برابر ہے اور پھر ان کے پورے دیوان میں اتنی تکمیل اور وہ قوت نہیں جو انیس کے ایک مرثیہ میں پائی جاتی ہے۔ یہ نئے شعر کی تنقیص نہیں۔ " منظور ہے گزارش احوال واقعی " ــ ان میں سے اکثر شعرا کے کلام میں ذاتی ناکامیاں۔ تلخیاں ا کمزوریوں کی جھلک صاف نمایاں ہوتی رہتی ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کو سب کچھ سمجھ رکھا ہے۔ ایسا سمجھنا بعید از فطرت نہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ جو اُن کی زندگی ہے وہی کم و بیش سب کی زندگی ہے۔ مگر اسے ایک عالمگیر احساس بنا کر پیش کرنا انھیں نہیں آتا ــ حالانکہ ادعا یہی ہے۔ موجودہ دور میں شخصی انانیت بہت مجروح ہ ہے اور شاید یہی صدمہ ہے جو ان شعرا کے لہجہ کو بہت محدود بنا دیتا ہے۔ ان کی ناکامیاں سچی اور حقیقی سہی مگر ا ایک عالمگیر صداقت کا احساس نہیں پایا جاتا۔ اس میں خود غرضی کی دبی ہوئی چنگاری نظر آتی ہے جو شاعری اور شاع دونوں کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ ان کا دل دُکھتا ہے، اسواسطے نہیں کہ دُنیا کا دل دُکھتا ہے بلکہ اس لئے کہ دُنیا ان کا دل دُکھایا ہے۔ یہی چیز کبھی غیظ و غضب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کبھی شکست اور اعتراف شکست کی۔ کبھی احساس کمتری ــ اور کبھی بے نیازی اور بے تعلقی کی یہ جذبات اچھی شاعری کے محرک ہمیشہ ہوئے ہیں۔ مگر اُس قت جبکہ انسان انھیں کا ہو کر نہ رہ جائے بلکہ ان پر فاتحانہ طور پر قابض ہو جائے۔

حسرت کا شعر ہے :

بڑی درگاہ کا سایل ہوں حسرت
بڑی امید ہے میری ــــ بڑا دل ،

اگر تجزیہ کیا جائے تو وہی ناکامی اور قناعت کا احساس اس شعر میں بھی ملے گا۔ مگر لہجہ میں کتنا سکون اور کتنی عظمت ہے۔ ' بڑا دل ' جس طرح دوسرے مصرع میں آیا ہے اس کے لئے واقعی بڑا دل چاہئے۔ اقبال جب یہ کہتا ہے :

بڑا کریم ہے اقبال بے نوا لیکن
عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں

تو فوراً احساس ہوتا ہے کہ کچھ اور بھی ہے۔ اور اگر کچھ اور نہ سہی تو یہی ' شرر ' کیا کم ہے۔

شاعری زیادہ تر ماحول سے بے اطمینانی کے سلسلے میں وجود میں آتی رہی ہے۔ کبھی یہ بے اطمینانی محض ماضی سے وابستہ رہتی ہے۔ کبھی مستقبل سے اور کبھی حال سے ــــ اور اسی بے اطمینانی اور بے سروسامانی کے عالم میں زندگی کے ہزاروں تجربات شاعر کی نگاہوں سے گزرتے جاتے ہیں۔ کبھی وہ ان کو مسترد کر دیتا ہے۔ کبھی ان سے سمجھوتہ کر لیتا ہے اور کبھی وہ نئی زندگی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے اور وہاں تک پہونچنے کی دشوار گزار راہوں

سے اپنے ساتھ ہم کو بھی لیجاتا ہے مگر یہاں یہ حال ہے کہ شاعر اپنی کوٹھری میں خود گھس کر بیٹھ گیا ہے اور اُس کے حوصلے باہر سے زنجیر چڑھا کر اُسے ہمیشہ کے لئے تنہا چھوڑ کر زمانہ کی شورشوں میں گم ہو گئے ہیں۔ یہ شعرا اپنے غم اور اپنی پسپائی میں لذت محسوس کرتے ہیں اور یہی لذت انکے لئے سب کچھ ہے۔ فانی کی غزل گوئی کو اسی جذبے نے نقصان پہونچایا حالانکہ وہ پھر بھی بچ نکلے اس لئے کہ انھوں نے غزلیں کہیں اور غزلوں کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ محدود جذبہ کو لامحدود بنانے میں بڑی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ مگر نظم میں اگر جذبہ محدود ہے تو پھر کوئی طاقت اسے عالمگیر نہیں بنا سکتی۔ ان میں سے بیشتر شعراء نے شاعری کو اپنے ہیجانات کا مرقع بنا دیا ہے ـــــ 'سکون جذبات' کی ایک راہ اُنھیں شاعری بھی نظر آئی شاعری ان کی منزل نہیں ــــ ایک پگڈنڈی بن کر رہ گئی ہے۔ وہ اپنے دماغ کی تاریک فضا سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ جب انکے پاس سوچنے کو کچھ نہیں رہ جاتا تو وہ سوچنا شروع کر دیتے ہیں چنانچہ ان کی اکثر نظمیں ایک 'مجہول تلاش' بن کر رہجاتی ہیں۔ یہ اشعار دیکھئے کس نفسیاتی کیفیت کی غمازی کر رہے ہیں ؎

اجنبی سرد ہوا چھیڑتی جاتی ہے مجھے
جُھرجُھری لیتا ہوا دل مجھے گرماتا ہے
اور تنہائی یہ امید دلاتی ہے مجھے
کوئی آتا ہے ابھی، دیکھ کوئی آتا ہے
یوسف ظفر

خالی ذہن میں جب نظم کہنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے تو تاثرات یونہی برانگیختہ کئے جاتے ہیں۔ اسی[1] شاعر کی ایک اور نظم کے کچھ شعر سنئے :

خموش رات کی خاموش وادئ تاریک
خموش بزم فلک، دم بخود فلک، جیسے
خموش جھیل کی ہموار سطح نیلی فام

اس میں منظر کا تاثر تو بعد کی چیز ہے۔ مگر اس سے پہلے یہ مصرع جس دماغی کیفیت کا پتا دیتے ہیں اس کا احساس خود شاعر کو ہے۔ چنانچہ اس نظم کا عنوان اس نے 'جمود' رکھا ہے۔ جس چیز نے اُسے نظم لکھنے پر اُکسایا وہ جمود کی نفسیاتی کیفیت بیان کرنا نہیں تھی بلکہ بیکاری اور الفاظ آرائی کا ایک مشغلہ تھا جو ممکن ہے بعد میں ایک نظم کا روپ اختیار کر لے ـــــ یہ ضروری نہیں کہ ایسی نظمیں خراب ہی ہوں۔ یوسف ظفر کی نظم "توس" اور فیض کی "تہ نجوم" دونوں اسی مجہول جذبے کے ماتحت لکھی گئی ہیں ـــــ "توس" مہمل ہو گئی ہے اور "تہ نجوم" اسی لذت کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

ان میں سے بعض شعرا احساس اور مشاہدہ سے کم اور الفاظ سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ ان میں شاعرانہ تحریک کبھی کبھی صرف الفاظ سے پیدا ہوتی ہے ـــــ سایہ، آرٹسٹ، پستول، لاش۔

---

[1] یوسف ظفر کی نظموں سے زیادہ تر اقتباسات دینے کی وجہ صرف یہی ہے کہ نئے شاعروں میں سے انھیں کا مجموعہ دستیاب ہو سکا۔ دوسرے شعراء کی نظمیں عموماً رسالوں میں منتشر ہیں۔

علی جواد زیدی کا مصرع ہے :

یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں

کہا جاتا ہے کہ انھوں نے مہادیو دیسائی کی موت سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ مصرع بُرا نہیں مگر "لاش" کے لفظ سے جو سنسنی پیدا ہوتی، جو احساس بیدار ہوتا اور "جوانیوں کی راہ" کہکر انانیت کو جو خفیف سی تسکین ملتی ہے وہ شاعری میں ہمیشہ قابل اعتبار نہیں ہوتی۔ یوسف ظفر نے کہیں لکھا ہے :

"میں اپنی زندگی کی لاش سے لپٹ کے سوگیا" یہاں بھی وہی جذبہ کار فرما ہے۔ سلام کی کئی نظموں میں یہی چیز پائی جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ موجودہ اُردو شاعری میں کہیں سادیتی (Sadistic elements) عناصر کی بھرمار ہو جائے۔

الفاظ سے شاعرانہ جذبہ کی بیداری میں جو مدد ملتی ہے اس کی اہمیت مسلّم ہے۔ مگر یہ حضرات (Best words in best order) بہترین الفاظ سے تو واقف ہیں مگر ان کی مناسب ترتیب سے واقف نہیں۔ کہنے والوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ صرف الفاظ ہی شاعری پیدا کرتے ہیں مگر یہ لوگ اس کے بھی قایل نہیں اور نہ اس کے اہل ہی ہیں۔ کچھ الفاظ ہیں جن میں ان کا دماغ بار بار چکر لگایا کرتا ہے۔ مرمریں۔ صندلی۔ رنگین وغیرہ۔ جہاں مصرع پورا ہونے میں دقت نظر آئی ان میں سے کوئی لفظ رکھ دیا گیا۔ خود اُن کی نظروں میں رنگین کے معنی زیادہ سے زیادہ "دلکش" کے ہیں اور اس سے زیادہ وسعتوں کے ساتھ انھوں نے اس لفظ کو کبھی نہیں پیش کیا۔

یوسف ظفر کی ایک نظم ہے 'کھنڈر' اس کا ایک مصرع ملاحظہ ہو :

دیکھ یہ پھیلی ہوئی لیٹی ہو بربادی

یہ اچھے جذبات سے ایک کھیل نہیں تو اور کیا ہے۔ شاعر کھنڈر کے مبہم تصور میں کھویا ہوا ہے۔ "پھیلی ہوئی لیٹی ہوئی" یہ الفاظ اس کے احساس کی کمزوری کا نشان ہیں۔ اس قسم کی نظموں کے ماتحت جو جذبہ ملتا ہے وہ ساری نظم کو ایک ایسے دھندلکے میں لپیٹ کر پیش کرتا ہے جو ایک لامحدود، مابعد الطبیعاتی اور ماورائی احساس دلا سکے ــــ مگر مابعد الطبیعاتی اور ماورائی احساس دلانے کی جگہ ان لوگوں کی نظمیں ایک (Fantasy) اعجوبہ ہو کر رہجاتی ہیں۔ لامحدود کا احساس الفاظ کی سرحد کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ الفاظ صرف اشارے ہوتے ہیں ؎

بھیگتی رات کی بے نور سیہ تاریکی

اولاً تو 'سیہ تاریکی' کا ٹکڑا ابھی محل نظر ہے۔ دوسرے 'سیہ تاریکی' الفاظ سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ یہی خامی راشد کے اس مصرع میں بھی ہے ؎

بیکراں رات کے سناٹے میں

یہاں سناٹے نے تو ضرور ایک کیفیت دیدی ہے مگر 'رات کی بیکرانی' کا احساس نہ بڑھ سکا۔ اب ذرا فراق کے اس شعر کو سنئے ؎

ذرا بھی سنبل تر کی لٹیں نہیں ہلتیں
سکوت نیم شبی کی حدیں نہیں ملتیں

محسوس کیا آپنے احساس کے لئے کتنی گنجایش موجود ہے۔

نئے شاعروں میں بعض ایسے بھی ہیں جو خیالات کی جگہ موضوع تلاش کیا کرتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ موضوع بھی نہیں 'عنوان' کی تلاش میں رہتے ہیں۔ مثلاً دھواں۔ آگ۔ چراغ۔ اب ان 'عنوانات' سے انھوں نے خیالات نکالنے شروع کئے۔ یہ عمل بعینہ ایسا ہے جیسے غزلوں میں فقط قافیوں سے مضمون پیدا کیا جائے۔ اگر شاعر کی دوڑ بس اتنی ہی ہے تو نتیجہ ظاہر ہے، شاعری ایک طویل فہرست ہوکر رہ جائے گی جس میں صرف نام گنوائے گئے ہوں۔ یہ عیب سلام مچھلی شہری کے یہاں ایک حد تک پایا جاتا ہے۔

اس سے ہوتا یہ ہے کہ ایک خیال چولا بدل بدل کر بار بار ہمارے سامنے آتا ہے۔ آج سے چند سال قبل مزدور اور کسانوں سے براہ راست ہمدردی ظاہر کی جاتی تھی اور ان کی مصیبتوں پر رونا رویا جاتا تھا۔ (اس قبیل کی بعض نظموں میں ادبی اور مقصدی دونوں طرح کا خلوص پایا جاتا ہے۔ جوش کی کئی نظمیں اور کچھ احسان کی دونوں اعتبار سے کامیاب ہیں) اب اس ہمدردی کا پیرایۂ اظہار بدل گیا ہے۔ اب حقیقت پرستی نے ایک دوسرا رُخ دیکھ لیا ہے اور وہ گھنونے اشعار پیش کرنے لگی ہے ؎

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

یا ؎

جس سے بودار سڑے سانسوں میں دم لینا ہے

ان اشعار کو محض اس واسطے بُرا کہہ دینا کہ یہ گھنونے ہیں حق تلفی اور حق پوشی ہوگی۔ فیض کی نظم میں یہ شعر جس موقع پر اور جس طرح آیا ہے نظم کی جان بن جاتا ہے۔ مقصد کہنے کا صرف یہ ہے کہ اُس جذبۂ ہمدردی نے اب تلخی کی صورت میں ایک نئی شکل اختیار کرلی ہے۔ ورنہ اس کی حقیقت ہے وہی جو پہلے تھی۔

ایک اور عام جذبہ کم و بیش ان تمام نئے شاعروں میں پایا جاتا ہے۔ وہ اپنی شاعری سے صنف نازک کو زیادہ مخاطب کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی اکثر نظمیں " میری جان انقلاب زندہ باد" معلوم ہوتی ہیں۔ انھوں نے عشقیہ شاعری کو عشق بازی سمجھ رکھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس طرح نظمیں لکھ لکھ کر اس صنف کو اپنا پرستار بنانا چاہتے ہیں۔ غالبًا انھیں خیال ہے کہ ان کی نظمیں 'سخن شناس' عورتوں سے خراج تحسین تو لے ہی لیں گی۔ اس جذبے کی مختلف تاویلیں پیش کی جاسکتی ہیں ـــ "قدیم پابندیاں جو ادب اور سماج دونوں پر تھیں اس کا یہ ردّ عمل ہے۔ خود جنسی احساس کا تقاضہ یہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ" اس 'سامان تسکین' میں جو کچھ بھی ہو مگر دماغی توانائی اور تندرستی کی علامت نہیں ہے۔ عشقیہ نظمیں کہنا اور بات ہے اور 'ادبی عشق' کرنا اور چیز ہے ـــــ میری جان مرے غموں کو دیکھ ـ میرے افلاس کو دیکھ میں نادار تو ہوں مگر بہت خود دار بھی ہوں۔ میں شرابی ہوں۔ آوارہ ہوں۔ یہ سب جاننے پر بھی اگر تو میری محبت کر سکتی ہے تو کر نہیں تو ہٹ جا۔ میں تمام دنیا کو ٹھکرا چکا ہوں ـــ وغیرہ وغیرہ' جدت کے زعم میں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں اور کس سے کہہ رہے ہیں۔ زندگی کے جو تجربات ہم پیش کررہے ہیں آیا وہ 'محسوسات شعری' میں منتقل کئے گئے ہیں یا نہیں اور کس زاویہ سے کئے گئے اور ان تجربات کی کیا قدر و قیمت ہوسکتی ہے

ان تمام اُمور کو مدِ نظر رکھنا نہایت ضروری ہے ۔

یہ اُردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اسے آج اتنے نئے شاعر نصیب ہیں ۔ پچھلے شعرا اپنی زبان پر صرف نازاں تھے آج یہ شاعر نہ صرف نازاں ہیں بلکہ انھیں اُردو سے واقعی بڑی محبت ہے ۔ انھوں نے شاعری کو مجموعی طور پر کوئی نقصان نہیں پہونچایا ۔ ہاں اپنی شاعری کو انفرادی طور پر البتہ نقصان پہونچایا اور کمزور بنادیا ۔ ورنہ شاعرانہ احساس پہونچانے میں وہ پچھلے بہت سے شاعروں سے کہیں زیادہ کامیاب ہیں ۔ ان کی نظموں کے عنوانات ہی ہمیں ایک نظر میں بتادیں گے کسقدر مسایل اور جدید رجحانات ہماری شاعری میں آچکے ہیں ۔ اس میں سماجی ۔ سیاسی اور طبقاتی کشمکش ، مذہب اور لامذہبیت ۔ فلسفہ تاریخی قوتوں کا احساس اور سائنس کا شعور سب کچھ آگیا ہے یہ بڑی بات ہے ۔ نئے شاعر سب کچھ ہیں مگر "تنگ نظر" نہیں ہیں ۔ نئی شاعری میں صداقت کی آخری فتح کا احساس پہلی مرتبہ اتنی شدت اور عظمت سے آیا ہے ؎

یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

اور

اب خطا کیسی خطا کار نہیں ہے کوئی
اب مرے سامنے دیوار نہیں ہے کوئی (یوسف ظفر)

نئے شاعر کو اسی روشنی میں آگے بڑھنا ہے ۔ "اب مرے سامنے دیوار نہیں ہے کوئی" شاعر اس مقام پر پہونچکر ہر گھروندے سے نکل آتا ہے ۔ خواہ وہ رجعت پسندی ہو یا ترقی پسندی ۔ اشتراکیت ہو یا شہنشاہیت ۔ تمام دیواریں ٹوٹ جاتی ہیں اور زندگی اپنی تمام پہنائیوں اور نیرنگیوں کے ساتھ سامنے آجاتی ہے ۔ نئے شاعروں کو محض مصرع موزوں کرنے کے لئے یہ نہیں کہنا ہے بلکہ اپنے کلام سے اسکی صداقت بھی پیش کرنی ہے ۔

مجتبیٰ حسین

مکتوبات نیاز

نیاز نوازا ۔ خط پڑھکر آپ کی تصویر سامنے آگئی اور وہ زمانہ یاد آگیا جب آپ کبھی کبھی کرم فرماتے تھے اور مجھے اپنے جذبات خلوص کی فراوانی سے مرعوب کر دیا کرتے تھے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ میں ہمیشہ "کشتۂ دوست" رہا ہوں اور اس لئے ان تمام احباب سے بہت ڈرتا ہوں جو مجھ سے واقعی محبت کرتے ہیں ۔

جب آپ یہاں تھے، اس وقت بارہا جی چاہا کہ آپ کی "ادائے تسلیم" کے سامنے ایکبار سربجود ہوکر اس حجاب کو اُٹھا دوں جو مجھے کھل کر یہ بھی نہ کہنے دیتا تھا کہ "یہ آپ کیا کہ رہے ہیں" ۔ لیکن جب آپ یہاں سے مئو چلے گئے اور اتنے خفا ہوکر گئے کہ لکھنؤ کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے تو مجھے افسوس بھی ہوا اور خوشی بھی ۔ افسوس تو اس بات کا کہ وہ چیز "جو دل میں رکھنے کی تھی" اب کہاں ملے گی اور خوشی اس لئے کہ آپ کے خلوص کا بارکچھ تو ہلکا ہوگیا ۔ میں نے اکثر سوچا کہ معلوم نہیں آپ ان لوگوں کے لئے کیا ہوں گے جن سے آپ بے تکلف ہیں اور پھر اس خیال سے کہ یہ بڑے خطرہ کی بات ہے ہمیشہ ٹالتا رہا ۔ اور یہ میں اب کہہ رہا ہوں جبکہ آپ سے ملنے کی غالباً کوئی صورت اس زندگی میں نہیں، ورنہ شاید اتنا بھی نہ کہہ سکتا ۔

معاف کیجئے اتنا کچھ لکھنے کے بعد بھی آپ کی کسی بات کا جواب نہ دیسکا اور جواب دوں بھی تو کیا ۔

دوست بودی شکوہ سر کردم وسلے جُرم تو نیست
کاینہمہ بیداد برمن از دلِ تنگِ من ست

(۲) انجذاب و جذب میں کھنچنے اور کھینچنے کا فرق ہے ۔ اُردو زبان میں جذب و انجذاب دونوں کیفیات پائی جاتی ہیں ۔ وہ اس لئے کہ دوسری زبانوں سے متاثر ہوتی ہے اور یہ اس لئے کہ دوسروں کو متاثر بھی کرتی ہے ۔

(۳) آپ نے لکھنؤ آنے کا ذکر کرکے مجھے افسردہ کر دیا کیونکہ میں جانتا ہوں آپ آئیں گے نہیں اور آپ کے وعدے پر اعتماد نہ کروں تو کیا کروں ۔

خوش رہیئے

حضرت - آپ کی بندہ نوازی میں کلام نہیں، لیکن مجھے فکر یہ ہے کہ اگر کسی وقت آپ نے یہ جان لیا کہ میں واقعی آپ کے "بندگانِ فرمانبردار" میں سے نہیں ہوں، تو آپ کو کتنا افسوس ہوگا۔

میں نے کبھی آپ کی رائے سے اتفاق نہیں کیا اور آپ نے ہمیشہ مجھ پر لطف فرمایا، شاید اس لئے کہ میرا اختلاف آپ کے نزدیک محض تفنن ہے اور میں دل سے وہی ہوں جو آپ سمجھتے ہیں، لیکن آج میں نہایت صفائی کے ساتھ آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ یوں تو میں آپ کا نہایت ادنیٰ خادم ہوں، لیکن اگر آپ کی خدا دوستی کا مطالبہ یہ ہے کہ اپنا دل و دماغ بھی آپ کے اختیار میں دیدوں، تو یہ میرے امکان میں نہیں ـــــ یہ سب کچھ میری "سیہ بختی" سہی، لیکن ہے میری اپنی، اور اس لئے مجھے اس "نورِ باطن" سے زیادہ عزیز ہے، جو کسی اور سے مستعار لیا گیا ہو۔

آپ خدا کا ذکر میرے سامنے اس طرح کرتے ہیں گویا میں نے اس کا کبھی نام ہی نہیں سُنا، حالانکہ سننے سے زیادہ میں نے اُسکو سمجھا ہے اور اس لئے میرا خدا بھی سب سے الگ ہے اور میرا آئینِ بندگی بھی سب سے جُدا۔

عکس اُفتادہ در آئینۂ ہوشش
گُل تواں گفت وَلے چیدن نیست

میں اس باب میں جس منزل سے گزر رہا ہوں، وہ وہی ہے جو درویشوں میں صابر کلیری کی تھی اور شعرا میں بیدل کی۔ یعنی صرف "اظہارِ عجز و سکوتِ حیرت!" - جبکہ نیایش و بندگی، اور اطاعت و عبادت سب کا سوال اُٹھ جاتا ہے۔

زاہدی نمیدانم تقوئے نمی خواہم
سینۂ صافئ دارم نذرِ درد نوشیہا

آپ لوگ، خدا کا ذکر اس طرح کرتے ہیں، گویا اس کے حضور میں آپ کو روز شرفِ باریابی حاصل ہوتا رہتا ہے اور اُسکے کاروبار کا علم آپ کو پوری طرح حاصل ہے - اور میرے، ہاں خدا کا نام ہے صرف اپنے احساسِ نارسائی کا، محض اس علم و یقین کا کہ ہم کو اس کی حقیقت کا علم ہو ہی نہیں سکتا۔ رہا مذاہبِ عالم کا نظریہ اس باب میں، سو میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے جو تصورِ خدا کا پیش کیا ہے، وہ تصور خدا کا نہیں بلکہ اظہار ہے اُن ذہنیتوں کا جو اختلافِ قومیت و مرز و بوم کے لحاظ سے دنیا میں علٰحدہ علٰحدہ پائی جاتی ہیں۔

آپ مجھے اسلام سے بیگانہ بتاتے ہیں، شاید ایسا ہی ہوگا، لیکن اگر اسلام نام ہے تمام مادیات سے گزر جانے کا، تو پھر مجھے بھی ان محراب و منبر کے جھگڑوں سے گزر جانے پر ملامت نہ کیجئے۔ اور اگر یہ قید ضروری ہے تو پھر کبھی کبھی مندر میں بھی سر بسجود ہو جانے کی اجازت دیجئے کیونکہ اگر خدا کہیں نہیں ہے تو اس کی پرستش خواہ مندر میں ہو یا مسجد میں، بیکار سی بات ہے اور سر پھوڑنے کے لئے پتھر کی قید کیا - بُت و محراب دونوں ایک ہیں۔

مقامِ وصل نایاب ست و راہِ سعی ناپیدا
چہ می کردیم یارب گر نبودی نارسیدنہا

باب الاستفسار

ہندو مُسلم نزاع

(جناب حسنین کاظمی ۔ کانپور)

نگار، ماہ نومبر کے باب لاستفسار میں جناب کے خیالات جن کا تعلق مسلمانوں کی جداگانہ قومیت سے ہے، معلوم ہوئے آپ نے ہندو مسلم اختلافات کا بانی محض مسلمانوں کو گردانا ہے جن کو پڑھنے کے بعد غیر مسلم حضرات تو یقیناً جناب کی رواداری کے قائل ہو جائیں گے لیکن میں اور غالباً ہندوستان کے اکثر مسلمانوں جناب سے اس مسئلے میں اختلاف کریں گے اور وہ کیوں، اس کا جواب میں اسوقت دینا مناسب سمجھونگا جبکہ خود جناب ایسی مثالیں پیش کریں گے جن سے جناب کی دلیل کی صداقت کا اظہار ہوتا ہو کیونکہ محض کہہ دینے سے کوئی بات درست نہیں ہوسکتی ۔

اس کے علاوہ جناب نے "پاکستان" سے قبل مسلمانوں کی معاشرتی، اقتصادی اور تعلیمی حالت کو درست کرنے کا درس دیا ہے ۔ جناب کا فرمانا قطعاً درست، لیکن محترم! کیا جناب یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ بحالت موجودہ جبکہ ہندو مسلم اختلافات اپنی پوری بلندی پر پہونچ چکے ہیں اور جبکہ ہندو اور انگریز خود ان تمام راستوں پر قابض ہونے کی حیثیت سے کبھی بھی یہ نہیں گوارا کر سکتے کہ مسلمان معاشرتی، اقتصادی اور تعلیمی ترقی کر سکیں، مسلمان کے لئے وہ کون سے عملی طریقے ہیں جن پر عمل پیرا ہونے کے بعد وہ زندگی کے ان شعبوں میں ترقی کر سکتے ہیں ؟

(نگار) آپ نے غالباً میرے جواب کو (جو نومبر کے نگار میں شایع ہوا ہے) غور سے نہیں پڑھا ۔ میں نے کہیں نہیں لکھا کہ اختلاف کے بانی محض مسلمان ہیں ۔ لیکن یہ ضرور ظاہر کیا ہے کہ جس وقت ہندوؤں میں آزادی کا احساس پیدا ہوا، اس وقت مسلمانوں کی طرف سے انھیں بہت کم سمجھنے کا موقعہ دیا گیا کہ مسلمان بھی اس جدو جہد میں پورے خلوص کے ساتھ ان کے ہمنوا ہیں، اور اس طرح رفتہ رفتہ دونوں قوموں میں بیگانگی بڑھتی رہی یہاں تک کہ ہندوؤں نے مسلمانوں سے علحدہ ہو کر کام کرنے کا فیصلہ کر لیا ۔

میں نے اس کا سبب صرف مذہبی احساسات کی گمراہی قرار دیا ہے جس میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک ہیں، لیکن چونکہ مسلمان مذہباً زیادہ رواداری سے کام لے سکتے تھے اور انھوں نے ایسا نہیں کیا، اس لئے یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے اختلاف کو دور کرنے کی جگہ اس کو شدید بنا دیا ۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی طرف سے

ہندوؤں کی بیگانگی و مغایرت اب بغض و عناد کی حد تک پہونچ گئی ہے اور ان کی تنگ نظری کی اتنی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں کہ کسی قوم کی تاریخ میں ان کا وجود یقیناً بڑی شرمناک بات ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسکے جواب میں مسلمانوں کا دفتر شکایت لیکر بیٹھ جانا، خود اُن کی خودداری کے منافی نہیں ہے۔

جب یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ ہندو، مسلمانوں کے ساتھ ملکر کام نہیں کرنا چاہتے تو پھر یہ شکوہ و شکایت بیکار ہے، انھیں اپنے سنبھالنے کے لئے الگ راہ ڈھونڈھنا چاہئے، اور وہ راہ میری رائے میں "پاکستان" کو نہیں جاتی۔

افسوس ہے کہ آپ نے میری باتوں کا جواب دینا فی الحال مناسب نہیں سمجھا ورنہ شاید میں اور زیادہ وضاحت سے کام لیتا۔ بہرحال اب سہی، میں اپنی دلیلیں یا مثالیں تو ظاہر کر چکا ہوں، معلوم نہیں اب ان میں اور کیا اضافہ آپ چاہتے ہیں۔

اخیر میں آپ نے ایک عجیب بات لکھی ہے اور وہ یہ کہ مسلمان اپنی اقتصادی، معاشرتی، اور تعلیمی حالت کو کیونکر درست کر سکتے ہیں جبکہ ہندو اور انگریز کبھی اسے گوارا نہیں کر سکتے۔

بندہ نواز، اگر ہندو انگریز اسے گوارا کرتے تو جھگڑا ہی کیا تھا، ہمیں تو ان مخالفتوں ہی کی وجہ سے اپنی اصلاح کی طرف زیادہ توجہ کرنا ہے اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ ان کی یہ مخالفت کیونکر ہماری راہ میں حایل ہو سکتی ہے۔

کیا انگریز اور ہندو ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم فضول خرچی میں مبتلا ہوں، اور قرض لیں، کیا اگر ہم قومی مدارس قایم کر کے عام تعلیم کی طرف توجہ کریں تو حکومت یا ہندو قوم اس کی مخالفت کر سکتی ہے، کیا مسلمانوں کی کاہلی اور اُن کے اخلاق کی خرابیوں کے ذمہ دار بھی ہندو اور انگریز ہی ہیں۔

اگر سنیما، کھیل تماشوں، بیجا نمود و نمایش اور رسم پرستی میں مسلمانوں ہی کا روپیہ زیادہ صرف ہوتا ہے تو کیا اس کا الزام بھی ہندوؤں اور انگریزوں ہی پر قایم کیا جائے گا۔

جس وقت اسلام رونما ہوا تھا اور رسول اللہ نے اصلاح قوم کی طرف توجہ کی تھی، کیا اُسوقت کچھ کم مخالفت تھی، کیا اُس زمانہ میں مسلمانوں کے دشمن قوی نہ تھے، اللہ کیا رسول اللہ ان مخالفتوں کا خیال کر کے بیٹھ رہے تھے۔

حیرت ہے کہ آپ بھی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں لیکن جسوقت مخالفت کا خیال آتا ہے تو لرزہ براندام ہو جاتے ہیں۔

اگر حقیقت اسلام درجہاں ایں ست
ہزار خندہ ہا کفرست بر مسلمانی

انتقادیات کے دونوں حصے

[illegible] کا مجموعہ قیمت علاوہ محصول [illegible]

باب المراسلۃ والمناظرہ

جگر اور مالہ وما علیہ

(زبیدہ خاتون عندلیب (بی۔اے) ۔امرتسر)

سلام مسنون — معاف کیجئے گا ۔ برا ماننا تو درکنا آپ یہ بھی محسوس کرنے کی کوشش نہ کیجئے گا کہ آپ کی ذات پر کوئی جارحانہ حملہ کیا جا رہا ہے ۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آپ حضرت جگر (مرادآبادی) کے کلام میں اتنی غلطیاں کیوں نکالتے رہتے ہیں ۔ جب دیکھئے آپ اُن کے رنگین کلام کو جو کہ عشق وحسن کی واردات سے مالامال ہے ۔ ہمیشہ درگت بناتے رہتے ہیں اور غلطیاں نکال کر ایک مشہور ہستی کی شاعری کی بنیاد کو کھوکھلا کرنے کے لئے تلے ہوئے ہیں ۔ یا تو آپ سے اور حضرت جگر صاحب سے کوئی تنازعہ ہے جس کی وجہ سے آپ اُن کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں ۔ یا کوئی عداوت تو ضرور ہو گی ۔ عام لوگ اُن کی غلطیوں کو کیا سمجھیں گے جس کے پاس آپ جیسے دماغ اور ادب میں کمال رکھتا ہو وہی ان تمام غلطیوں کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے ۔ آپ نے ماہ ستمبر ۴۴ء کے نگار میں حضرت جگر کی غزل پر رائے زنی کی ہے کہ اُن کو اب شاعری کرنا چھوڑ دینا چاہئے آخر کیوں ؟ آپ جب تک یہ ثابت نہ کریں گے کہ حضرت جگر حقیقت میں شاعر نہیں ہیں تب تک میں اس کو ماننے کے لئے طیار نہیں ہوں کہ وہ اپنی شاعری ترک کر دیں لیکن اس بات کا بین ثبوت ہونا چاہئے ۔ زیادہ بہتر ہو گا کہ آپ مکمل جواب تحریر فرمائیے ۔ تاکہ دوبارہ آپ کو زحمت نہ دی جائے

(نگار) میں آپ کی اس تحریر کا جواب آپ کو نگار کی وساطت سے نہ دیتا ، اگر مجھے یقین ہوتا کہ جس غلطی میں آپ مبتلا ہیں وہ صرف آپ ہی تک محدود ہوتی ۔ آپ نے تو خیر بہت نرم الفاظ میں تنبیہ فرمائی ، ہمارے سیماب صاحب کے بعض شاگردوں نے تو ایسی فصیح وبلیغ گالیاں لکھ کر بھیجی ہیں کہ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایسے حضرات بھی ان کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہیں ۔

اس میں شک نہیں کہ جس کے کلام پر نکتہ چینی کی جاتی ہے ، اُس کو بُرا ضرور معلوم ہوتا ہے لیکن اس قسم کی گفتگو کو کسی ذاتی بغض وعناد پر محمول کرنا ظلم ہے اور غالباً اس سے زیادہ ظلم یہ ہے کہ ایک شخص اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھے کہ اس سے کوئی غلطی ہو ہی نہیں سکتی — ایک شاعر بھی غلطی کر سکتا ہے اور نقاد بھی ، لیکن اسکے یہ معنی تو نہیں کہ اگر شاعر کی کسی (واقعی) غلطی کو ظاہر کیا جائے تو وہ اسے تسلیم نہ کرے یا اگر نقاد سے کوئی غلطی ہو تو وہ اس پر اڑا رہے — میں جو کچھ لکھتا ہوں اپنی سمجھ کے لحاظ سے لکھتا ہوں اور یہ بغیر اس خیال کے لکھتا ہوں کہ شعر کس کا ہے ، پھر اگر میں غلط سمجھتا ہوں تو شاعر کا یہ فرض تو ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے متنبہ کرے ، لیکن اس کو ذاتی بغض وعناد قرار دیکر محض گالیوں سے جواب دینا کوئی معنی نہیں رکھتا نہیں ۔

نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ان ممالک میں جہاں آزادیِ رائے کی کوئی قیمت نہیں ہے، فن نقد ہمیشہ مطعون رہا ہے اور یہ ذہنیت اُسی دورِ ملوکیت کی یادگار ہے، جب انسان کی ترقی کا کمال یہی سمجھا جاتا تھا کہ وہ خدا یا دیوتا کہلائے۔

آپ کا یہ فرمانا کہ مجھے جگر صاحب ہی سے زیادہ خصومت ہے، درست نہیں۔ مالہٗ وما علیہ کا سلسلہ اپریل سنہ ء سے شروع ہوا ہے اور اشاعت حاضرہ تک جن شعراء کے کلام پر جتنی بار بحث کی گئی ہے اس کی تفصیل یہ ہے:

جگر مراد آبادی =	اپریل، جون، ستمبر کے نگار میں،	تین بار
جوش ملیح آبادی =	مئی، جولائی کے نگار میں،	دو بار
سیماب اکبرآبادی =	جولائی، نومبر کے نگار میں،	دو بار
ماہر القادری =	اگست، اکتوبر، دسمبر کے نگار میں،	تین بار
علی سردار جعفری =	اگست کے نگار میں،	ایک بار
اثر لکھنوی =	اکتوبر کے نگار میں،	ایک بار
نخشب جارچوی =	دسمبر کے نگار میں،	ایک بار

اس لئے آپ کا یہ فرمانا کہ صرف جگر ہی کو میں نے نشانہ بنایا ہے اور مجھے انھیں سے لاگ ہے۔ درست نہیں ـــ میرا مقصود اس سلسلہ سے یہ ہے کہ لوگ سنجیدگی سے ادبی گفتگو میں حصہ لیں اور نگار میں جو کچھ لکھا جاتا ہے اس کا جواب نگار ہی کے ذریعہ سے دیں۔

میں شاید آپ سے زیادہ اس حقیقت سے واقف ہوں کہ جگر واردات حُسن وعشق بیان کرنے والے شاعر ہیں اور میں نے انکے کلام میں بعض ایسے اشعار بھی پائے ہیں، جنکی لذت کبھی فراموش نہیں کر سکتا اور اسی کے ساتھ میں نے ہمیشہ اسکا اعتراف کیا ہے کہ جگر واقعی شاعر ہیں، لیکن پھر دہرا عرض کرونگا کہ جگر کی شاعری کی عمر اب ختم ہو چکی ہے (اور جذبات حُسن وعشق کی شدت وفراوانی کم ہونے کے بعد عاشقانہ شاعری کی عمر ہمیشہ ختم ہو جاتی ہے) اور انھیں اُسی پر اکتفا کرنا چاہیے جو وہ کہہ چکے ہیں اور اس کو پیش کرنے کی ہوس نہ کرنا چاہیے جو وہ اب یا آئندہ کہہ سکتے ہیں جگر کے کلام میں اُسی وقت تنزل کے آثار پیدا ہو گئے تھے جب خالص حُسن وعشق سے ہٹ کر انھوں نے تصوف کے رنگ کے اشعار کہنا شروع کئے اور اسکے بعد جب انھوں نے "فاقہ زدگان بنگال" کی نظم لکھی تو اس زوال کی تکمیل پر گویا انھوں نے مُہر توثیق ثبت کر دی۔

دُنیا میں ہر چیز کی ایک عمر ہوتی ہے، ہر بات کا ایک موسم ہوتا ہے، اسلئے ایک صاحب فن کو آزردہ نہ ہونا چاہیے اگر اسکے فن میں انحطاط پیدا ہو جائے (کیونکہ یہ بالکل فطری بات ہے) بلکہ اسکو دوسرے نوجوان ارباب فن کیلئے جگہ چھوڑ دینا چاہیے جو اپنے اسلاف اور پیشرو فنکاروں ہی سے سیکھکر آگے بڑھے ہیں۔

رہا، کسی کے کلام میں غلطیوں کا پایا جانا سو یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر برہمی کا اظہار کیا جائے، کیونکہ ایک شاعر غلط گو ہونیکے باوجود بھی شاعر رہ سکتا ہے (گو فنکار نہیں) اور نہایت صحیح کہنے کے بعد بھی شاعر نہیں ہو سکتا۔ (گو فنکار کتنا ہی بڑا ہو) ـــ اس میں شک نہیں کہ فن اور جذبات دونوں حیثیتوں سے مکمل ہونا بڑی بات ہے لیکن اتنی بڑی بات ہے کہ صدیوں میں جا کر کوئی شخص اس جامعیت کا پیدا ہوتا ہے اور اسلئے ہر شاعر یا صاحب فن کو اپنی جگہ یہ سمجھ لینا کہ وہ یہی "صدیوں" والی جامعیت اپنے اندر رکھتا ہے، بڑا فریبِ نفس ہے اور اگر آپ سمجھتی ہیں کہ جگر صاحب بھی اسی فریب میں مبتلا ہیں تو شاید یہ بیان تو ساتھ آپ انصاف نہیں کر رہی ہیں ـــ اور غالباً وہ بھی آپ کے اس حُسنِ ظن سے خوش نہ ہوں گے لیکن اگر اسکے بعد بھی آپ اس استفسار پر اصرار فرمائیں گی کہ جگر کے کلام میں کیوں اتنی غلطیاں نکالتا ہوں تو میں اسکے جواب میں عرض کروں گا کہ آپ انھیں سے کیوں نہیں پوچھتیں کہ "وہ کیوں اتنی غلطیاں کرتے ہیں"

مالہ وماعلیہ

ماہر القادری کی ایک نظم

۴ نومبر کے نظام ہفتہ وار بمبئی میں جناب ماہر القادری کی ایک نظم شایع ہوئی ہے جس کا عنوان برسات کی ایک رات ہے:

آیا تھا مرے گھر میں جو وہ جانِ گلستاں ۔۔۔ اب تک ہے مرے گھر میں بہارِ گل وریحاں
نکھرے ہوئے ماتھے پہ وہ پھیلا ہوا قشقہ ۔۔۔ اُبھرے ہوئے رخسار پہ گیسوے پریشاں
آنکھوں میں فسوں کوئی نہ مرتا ہو تو مرجائے ۔۔۔ ہونٹوں میں وہ اعجاز کہ ہر درد کا درماں
وہ سینۂ شفاف وہ پگھلی ہوئی چاندی ۔۔۔ اور اس پہ قیامت سحرِ چاک گریباں
یہ ظلم کہ بن بن کے بگڑ جانے کے انداز ۔۔۔ یہ لطف کہ دیر آشنا اور زود پشیماں
برسات کا موسم وہ ہوائیں، وہ ترشح ۔۔۔ وہ دور تلک سلسلۂ ابرِ بہاراں
بجلی کی چمک اور وہ اڑتے ہوئے جگنو ۔۔۔ دیکھا مری آنکھوں نے ہواؤں میں چراغاں
سہمے ہوئے انداز میں وہ شوخ یہ بولا ۔۔۔ برسات بھی دراصل ہے اک رحمتِ یزداں
ہونٹوں پہ نمایاں تھی مرے تشنگیٔ شوق ۔۔۔ آنکھوں میں سمٹ آیا تھا جذبات کا طوفاں

اے کاش! وہ گزرے ہوئے لمحات پھر آجائیں
ماضی کی طرف لوٹ کے گردشِ دوراں

پہلے شعر کے دونوں مصرعوں میں گھر کی تکرار بالکل غیر ضروری ہے۔ صرف دوسرے مصرعہ میں کافی تھا، اور اسی سے یہ مفہوم پیدا ہو جاتا تھا کہ "وہ جانِ گلستاں" ماہر صاحب کے گھر آیا تھا۔ علاوہ اس کے دوسرے مصرعہ میں "اب تک" کا لفظ یہ بھی چاہتا ہے کہ پہلے مصرعہ میں کوئی لفظ امتدادِ وقت ظاہر کرنے والا ایسا ہونا چاہیئے جو کسی طویل زمانہ کا پتہ دے، اس صورت میں لفظ "جو" حذف ہو جائے گا۔ اگر پہلے مصرعہ میں گھر کو بدستور رہنے دیا جائے تو دوسرے مصرعہ سے گھر کا لفظ نکال کر یوں کہہ سکتے ہیں:

اب تک ہے وہی رنگ بہارِ گل وریحاں

دوسرے شعر میں قشقہ کی صفت "پھیلا ہوا" درست نہیں اول تو جوان [illegible] عورتوں کی پیشانی پر [illegible]

نہیں ہوتا بلکہ بیندی ہوتی ہے یا مانگ میں سیندور ہوتا ہے۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ جس عورت کا شاعر نے ذکر کیا ہے اس کی پیشانی پر قشقہ ہی تھا یا یہ کہ بیندی کو بھی قشقہ کہہ سکتے ہیں تو اس کا پھیلا ہوا ہونا کیا معنی جس سے پھوہڑپن ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے مصرعہ میں رُخسار کا اُبھرا ہوا ہونا بھی کوئی حُسن نہیں، لیکن ہو سکتا ہے اثر صاحب کا ذوق پسندیدگی یہی ہو۔ علاوہ اس کے یا تو دوسرے مصرعہ میں بھی گیسوئے پریشاں سے پہلے وہ ہونا چاہئیے یا پہلے مصرعہ سے بھی وہ حذف کرنا چاہئیے اس لئے یا تو پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہئیے:

"نکھرے ہوئے ماتھے پہ دہکتی ہوئی بیندی" — اور اگر پہلے مصرعہ میں وہ باقی رکھا جائے تو دوسرا مصرعہ یوں ہونا چاہئیے: "اُبھرے ہوئے رخسار پہ وہ زلف پریشاں"

تیسرے شعر میں بھی یہی عیب ہے یعنی دونوں مصرعوں کے انداز بیان میں ہم آہنگی نہیں ہے۔ جس طرح دوسرے مصرعہ میں "ہونٹوں کا وہ اعجاز" کہا گیا ہے، اسی طرح پہلے مصرعہ میں "آنکھوں میں وہ افسوں" ہونا چاہئیے۔

چوتھے شعر میں بھی معنوی نقص ہے اور وہ یہ کہ جب "سینۂ شفاف کی پگھلی ہوئی چاندنی" دیکھی جا چکی تھی تو پھر اس کے بعد چاک گریباں کا قیامت ڈھانا کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ شاعر نے سینۂ شفاف کو اسی وقت دیکھا ہوگا جب گریباں کھُلا ہوا ہوگا۔ علاوہ اس کے لفظ سحر کے استعمال کا کوئی موقعہ نہ تھا، صرف وزن پورا کرنے کے لئے لایا گیا ہے۔

پانچویں شعر کے بھی دونوں مصرعے انداز بیان کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں۔ جس طرح دوسرے مصرعہ میں "زود آشنا و زود پشیماں" صفاتی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اسی طرح پہلے مصرعہ میں بھی اسی ترکیب کے اسمائے صفت لانا چاہئیے تھے۔

چھٹے شعر کے پہلے مصرعہ میں تین چیزوں کا ذکر ہے۔ برسات کا موسم۔ ہوائیں، اور ترشح۔ اس لئے وہ کا استعمال ہر جگہ ہونا چاہئیے تھا۔ یعنی اگر "وہ ہوائیں"۔ "وہ ترشح" کہا گیا تھا تو "وہ برسات کا موسم" بھی کہنا چاہئیے تھا اس لئے پہلا مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر تھا: "برسات کی وہ تند ہوائیں، وہ ترشح"

دوسرے مصرعہ میں تالک استعمال کیا گیا ہے جو بعض کے نزدیک متروک ہے، لیکن میں اس کو درست سمجھتا ہوں

آٹھویں شعر میں "رحمتِ یزداں" کا استعمال موضوع نظم کے لحاظ سے حد درجہ ناموزوں ہے، ایسے وقت میں یزداں کا کیا دخل۔ معلوم ہوتا ہے کہ اثر صاحب نے بربنائے تقدس محض کفارۂ گناہ کے خیال سے خدا کا بھی ذکر کر دیا۔

نویں شعر میں "ہونٹوں پہ" کی جگہ "ہونٹوں سے" ہوتا تو بہتر تھا۔

محوی صاحب کی ایک غزل

نظام کی اسی اشاعت میں جناب محوی لکھنوی کی بھی ایک غزل شائع ہوئی ہے ملاحظہ ہو:

مے کش نواز ساقی بہلا نہ گفتگو میں — بس آج تو پلا دے جو کچھ بچا ہو سبو میں

ناصح تری گلی سے جنت کو لے چلا تھا
اچھا ہوا نہ آئے ہم اس کی گفتگو میں

اندوہ بے کسی میں جینا نہ تھا مناسب
دنیا سے چل دئے ہم راحت کی جستجو میں

او صرصرِ حوادث، برباد کر نہ دینا
کچھ پھول ہم لئے ہیں دامانِ آرزو میں

رو رو کے چشمِ تر نے عاشق کی بات رکھ لی
آنسو رہے نمایاں موتی سی آبرو میں،

خاموشیوں نے خوگرِ غم کا بنا دیا ہے
کیا لطف آئے ہم کو اب شرحِ آرزو میں

حسرت نصیب آنکھیں کچھ اتنا خوں رو شن
ٹکڑے دل و جگر کے بہہ آئے ہیں لہو میں،

شوخی بھی ہے حیا بھی، تمکیں بھی ہے جفا بھی
اس شوخ تند خو میں اس یارِ خوبرو میں

فرقت کی شب کسی نے تسکین دی نہ دل کو
تڑپا کیا زمیں پر، لوٹا کیا لہو میں

کچھ آج خود بخود جی رونے کو چاہتا ہے
پہونچے نہ ہوں الٰہی وہ محفلِ عدو میں

غربت میں دل تپاں ہے یادِ وطن سے محوی
میں دردمند ہوتا اے کاش لکھنؤ میں

محوی صاحب بڑے پرانے غزل گو ہیں، لیکن ان کے کلام میں کبھی کوئی چونکا دینے والی بات نہیں پائی گئی۔ انھوں نے فرسودہ باتیں، فرسودہ انداز میں کہیں اور اسی پر فخر کیا۔ لیکن میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ اس زمانہ میں بھی اپنے کلام کی ...ت کی جرأت کر سکیں گے اور کلام بھی وہ جو قدیم رنگ اور فنِ شعری کے لحاظ سے بھی بے عیب نہیں۔

یوں تو پوری غزل ہی بجھی ہوئی ہے، لیکن بعض بعض اشعار تو ایسے کجلائے ہوئے ہیں کہ ان کو پڑھکر حیرت ہوتی ہے۔

دوسرے شعر کے دوسرے مصرعہ میں محوی صاحب نے محاورہ غلط نظم کیا ہے۔ محاورہ "باتوں میں آنا" ہے نہ کہ "...لو کرنا"۔ داغ کا شعر ہے:

پیامبر تری باتوں میں ہم کب آتے ہیں
وہاں ضرور گیا اور تو ضرور آیا

پانچویں شعر کا دوسرا مصرعہ بے معنی ہے۔ "موتی سی آبرو" کس کی اور "موتی سی آبرو" میں "آنسو کا رہنا" کیا معنی!

ساتویں شعر کے پہلے مصرعہ میں اگر کتابت کی غلطی نہیں تو اس کا اہمال ظاہر ہے۔

آٹھویں شعر کے پہلے مصرعہ میں تمکیں کا لفظ بالکل غلط استعمال ہوا ہے۔ جفا کے مقابلہ میں وفا یا لطف کا ذکر ہونا ...ے نہ کہ تمکیں کا۔

تمکیں کہتے ہیں "سنجیدگی و وقار" کو، اور اسی لئے اسے شوخی کے مقابلہ میں استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے پہلا ...یوں ہونا چاہئے:

شوخی بھی ہے حیا بھی، ہے لطف بھی جفا بھی

نخشب جارچوی کی ایک غزل

آجکل کی اشاعت یکم نومبر میں نخشب جارچوی کی یہ غزل شایع ہوئی ہے:-

اہلِ ظاہر تیرا جلوہ کس نظر سے دیکھتے
دیکھنا بھی تھا تو چشمِ معتبر سے دیکھتے

جو نظر جلووں کی زد میں آگئی خیرہ ہوئی
ہم تمھیں بچ کر تمھاری رہگذر سے دیکھتے

حُسن کی قیمت بغیر عشق کھلتی ہی نہیں
اپنا جلوہ آپ بھی میری نظر سے دیکھتے

اپنے مرکز ہی پہ ہوتی ہے ہر اک شے بے نقاب
گردشِ ایام کو ہم تیرے در سے دیکھتے

احترامِ حُسنِ خود بیں کا تقاضہ تھا یہی
باخبر ہوتے ہوئے بھی بے خبر سے دیکھتے

کب تک آخر شکوہ سنجِ بیرخی نخشب نہ ہوں
یہ رویہ آرہے ہیں عمر بھر سے دیکھتے

نخشب آجکل کے نوجوانوں میں غزل اچھی کہتے ہیں، لیکن اس غزل کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مشکل رد قافیہ میں ان کی فکر اچھا کام نہیں کرتی۔

پہلے شعر میں "چشم معتبر" کا استعمال میری سمجھ میں نہیں آیا، اعتبار کے معنے عربی میں اختبار و احترام کے ہیں اُردو میں بھروسہ کے آدمی کو "مردِ معتبر" کہتے ہیں۔

لیکن شاعر نے "چشم معتبر" کا استعمال "نگاہ نکتہ بیں" کے مفہوم میں کیا ہے، اس لئے بجائے مُعتبَر کے (اسم فاعل) معتبِر (بہ کسرۂ "با") ہونا چاہئے۔ یہ تو ہوئی لغوی غلطی، لیکن اسی کے ساتھ ایک غلطی اور بھی۔ کہ اہل ظاہر کے پاس چشم معتبر کہاں اس لئے اُن سے یہ کہنا کہ

دیکھنا بھی تھا تو چشم معتبر سے دیکھتے

کیونکر درست ہوسکتا ہے۔

دوسرے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ ہجوم جلوہ میں نگاہیں خیرہ ہوجاتی ہیں اس لئے تمھاری رہگزر سے بچکر تم چاہئے تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح جلوۂ محبوب کی زد ختم ہوجاتی اور کیا محبوب کی طرف دیکھنا خوا ہو یا چھپ کر بغیر جلوہ کے ممکن ہے۔

تیسرے شعر میں بغیر عشق کی ترکیب بہت ثقیل ہے دوسرے مصرعہ میں بجائے بھی کے تو ہونا چاہئے۔ لحاظ سے بھی یہ شعر کچھ نہیں۔ خیال و انداز بیان دونوں حد درجہ فرسودہ و پامال ہیں۔

چوتھے شعر کا پہلا مصرعہ ایک دعویٰ ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ ایک شے کا اپنے مرکز سے ہٹ کر بے ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن مرکز پر رہکر بے نقاب ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔

پانچویں شعر میں حُسن کی صفت خود بیں، مفہوم شعر کے لحاظ سے بالکل بے محل ہے - حیا، عفت یا شرم ظاہر کرنیوالی کوئی صفت ہونا چاہئے تھی - یہ مصرعہ یوں ہونا چاہئے تھا:

حُسن عفت کوش کا ہم سے تقاضہ تھا یہی

مقطع میں روتیہ کا استعمال دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی، میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ نخشب صاحب اس قسم کی غلطی کر سکتے ہیں -

رَوِیّہ (بر وزن صَبِیّہ) عربی لفظ ہے، جس کے معنے "غور و تفکر" کے ہیں - روش کے معنے میں اس کا استعمال فارسی والوں نے بھی نہیں کیا - اُردو میں البتہ صرف جہلا و عوام اس معنے میں بولتے ہیں - علاوہ اس کے یوں بھی غزل کی زبان اس کے استعمال کی اجازت نہیں دیتی - اس مصرعہ کو یوں ہونا چاہئے -

یہ روش، ہم، آرہے ہیں عمر بھر سے دیکھتے

مطبوعات موصولہ

تلخیاں جناب رشید اختر ندوی کا طویل افسانہ ہے (جسے وہ اپنا پانچواں ناول کہتے ہیں)۔ اسکا نام انھوں نے تلخیاں اسلئے رکھا ہے کہ انھوں نے (بقول خود) اس میں عشق کی جگہ ہوس کے مناظر کو زیادہ پیش کیا ہے اور بجائے شیرینی کے اس میں تلخی زیادہ ہے ۔ بعض کا خیال ہے کہ مختصر افسانہ نویسی ناول نگاری سے زیادہ مشکل ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ناول لکھنا بڑا سلیقہ چاہتا ہے اور ہندوستان میں یہ فن پختہ نہ ہو چکا تھا کہ لوگوں نے افسانہ نگاری شروع کر دی۔ اس لئے ہماری زبان میں فسانے تو اب اچھے اچھے نظر آتے ہیں، لیکن ناول بہت کم۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ رشید اختر صاحب نے اس سے قبل جتنے ناول لکھے ہیں وہ کیسے تھے، لیکن یہ ناول نہ بُرا ہے، نہ اچھا۔ بُرا تو اس لئے نہیں ہے کہ اس سے زیادہ خراب ناول بازار میں بک رہے ہیں اور اس کو میں اچھا اس لئے نہیں کہتا کہ یہ کوئی معیاری چیز نہیں اور نفسیاتی و واقعاتی حیثیت سے بہت سی باتیں اس میں ایسی نظر آتی ہیں جو ایک مشاق و کامیاب ناول نگار کے قلم سے نہیں نکل سکتیں۔ زبان بیشک صاف ہے اور پلاٹ بھی غنیمت ہے، لیکن کردار نگاری اور مکالمہ بہت معمولی ہے ۔ قیمت تین روپیہ ۔ ملنے کا پتہ : ادارۂ ہندوستانی پبلشرز۔ دہلی

بیل بوٹے جناب مظفر حسین شمیم کے ۲۵ (ادبی، تاریخی و انتقادی) مقالات کا مجموعہ ہے یہ مضامین مختلف اخبارات و رسایل میں شایع ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ چھوٹے سائز کے ۱۴۴ صفحات پر اتنے مقالات، کسی غایر تحقیق و تفتیش کا نتیجہ تو ہو نہیں سکتے، لیکن غالباً سرسری مطالعہ کے حد سے بھی ان مقالات کو کوئی خصوصیت حاصل نہیں۔

اس مجموعہ میں ایک مضمون نورتن کے عنوان کا بھی ہے۔ جس میں ٹگور، اقبال، کانڈھی وغیرہ کے ساتھ اعلٰحضرت موجودہ فرمانروائے دکن کا نام بھی شامل کیا گیا ہے، حالانکہ اعلٰحضرت کا ذکر اس سلسلہ میں کسی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ الغرض تمام مقالات نہایت ہی سستی قسم کی پیداوار ہیں اور کوئی خاص افادی حیثیت نہیں رکھتے۔ قیمت درج نہیں ہے ملنے کا پتہ مکتبۂ سلطانی بھنڈی بازار بمبئی ہے۔

اپاہج ناول ہے جناب قیسی رامپوری کا۔ قیسی پُرانے افسانہ نویس ہیں اور اسی صنعت ادب کی انھوں نے مشق کی ہے ناول زبان و پلاٹ کے لحاظ سے کافی دلچسپ ہے اور ادب لطیف کے اُن شایقین کے لئے جو کسی گہرے خیال کو مطلق پسند نہیں کرتے اس میں بہت کچھ موجود ہے۔ مکالموں کا انداز مغربی رنگ کا ہے جو کم از کم مجھے پسند نہیں آتا۔

مغرب کے کامیاب ناول نویسوں کے یہاں خاص چیز جزئیات کا مطالعہ ہے، جو آرٹ و فلسفہ دونوں حیثیت سے بڑا مکمل ہوتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہم لوگ مغرب کی تقلید میں مشکل باتوں کو چھوڑ دیتے ہیں اور صرف سطحی چیزوں کو لے لیتے ہیں۔

قیمت دو روپیہ، حجم ۱۷۰ صفحات ۔ ملنے کا پتہ ہندوستانی پبلشرز دہلی

دل کے آنسو جناب رئیس احمد جعفری کے پانچ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے - جناب جعفری ہمارے یو۔پی کے فرزند ہیں جو عرصہ سے بمبئی میں ایک کامیاب صحافی کی زندگی بسر کر رہے ہیں - اول اول یہ بات شاید کسی کے علم میں نہ تھی کہ وہ ایک اچھے فسانہ نگار بننے کی بھی اہلیت رکھتے ہیں، لیکن جب وہیں بمبئی کے اخباروں میں انکے فسانوں کا سلسلہ شروع ہوا تو یہ راز بھی کھلا اور اب وہ صنعت ادب میں اتنے کامیاب ہیں کہ مجھے اندیشہ ہے لوگ ان کی تحقیقی الجھنوں کو نہ بھول جائیں جن کا تعلق غالباً زیادہ وزنی قسم کے لٹریچر سے ہے -

جناب جعفری کے طرزِ نگارش کی یہ خصوصیت کہ تاثرات کے اظہار کے لئے الفاظ کے علاوہ ان کا لب ولہجہ بھی مخصوص ہوتا ہے، ان افسانوں میں بھی پائی جاتی ہے - کاش وہ "عشق ومحبت" کی دنیا سے ہٹ کر محض علمی افسانے لکھتے جنکی ہماری زبان کو سخت ضرورت ہے اور جس کے وہ اہل ہیں — حجم ۹۶ صفحات - قیمت عہ - ملنے کا پتہ: مکتبۂ سلطانی بھنڈی بازار بمبئی -

نغمے کی موت کرشن چندر کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ہے - جن کو بجائے افسانے کے ادبی مقالات کہنا زیادہ موزوں ہوگا - کرشن چندر صاحب طرز افسانہ نگاروں میں سے ہیں، اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جذبات کی گہرائی، الفاظ کی مناسبت اور لب ولہجہ کی ندرت کے لحاظ سے ان کے افسانے "قدر اول" کی چیز ہوتے ہیں - وہ افسانے پلاٹ کے لئے نہیں لکھتے بلکہ ان کا مقصود محض نفسیاتی تجزیہ اور انتقادی مطالعہ ہوتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس فرض کو نہایت خوبی سے ادا کرتے ہیں - اسکا حجم ۱۹۸ صفحات اور قیمت دو روپیہ چار آنہ - ملنے کا پتہ: ہندوستانی پبلشرز دہلی -

مشعل راہ جناب نخشب جارچوی کی نظموں، گیتوں اور غزلوں کا مجموعہ ہے - جناب نخشب کی شاعری کی عمر زیادہ نہیں لیکن ان کے کلام کی پختگی شعراء کہن سال کی سی ہے - وہ اسی دور کے شاعر ہیں اور انکا کلام اپنے لب ولہجہ اور جذبات وخیالات کے لحاظ سے دور حاضر کے داعیات کو پورا کرنے والا ہے - ابھی چند سال کی بات ہے جب ان کا کلام پبلک میں آیا لیکن اسی قلیل مدت میں انھوں نے اپنے لئے خاص جگہ حاصل کرلی اور شاید بقول کہا ہی زمانہ جانتا ہے کہ غالباً وہ صف اول کے شعراء میں شمار کئے جائیں گے - ان کے گیت تو خیر کوئی خاص کیفیت نہیں رکھتے لیکن نظمیں گیتوں سے اچھی ہیں اور غزلیں نظموں سے بہتر - بعض اشعار ملاحظہ ہوں :

نہ جانے آج کیوں دھڑکن مرے دل کی نہیں رکتی — یہ آہٹ آپ کی تھی، آپ گزرے تھے ابھی دل سے

مری خودداریوں پر شوق اے نخشب تصدق ہو — اٹھائے کیوں کوئی میں خود اٹھا جاتا ہوں محفل سے

بہت ممکن، تمھیں سے یہ دل مضطر بہل جائے — ذرا ٹھیرو کہ نخشب تم سے تھوڑی سی گفتگو کرلے

وعدہ کا اعتبار تو ہے واقعی مجھے — یہ اور بات ہے کہ ہنسی آگئی مجھے

ضخامت ۲۰۰ صفحات - قیمت سہ - ملنے کا پتہ ہندوستانی پبلشرز - دہلی

آبشار مجموعہ ہے جناب فیض جھنجھانوی کی نظموں کا - فیض صاحب چونکہ پیشہ ور شاعر نہیں ہیں - اس لئے وہ اتنے مشہور نہ ہوسکے جتنا انھیں ہونا چاہیے تھا - ان کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ندرت وخیال کی کمی نہیں اور جو کچھ وہ کہتے ہیں، بہت سوچ سمجھ کر کہتے ہیں شاعری میں وہ اقبال کے تبع معلوم ہوتے ہیں، لیکن چونکہ اقبال کے اتباع میں کوئی نمایاں خصوصیت حاصل کرنا بہت دشوار ہے، اس لئے انھوں نے بڑی

من راہ اختیار کی - تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ انھوں نے اس راہ میں بہت پھونک پھونک کر قدم رکھا ہے اور مت روی کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا - حجم ۲۰۰ صفحات - قیمت ہے - ملنے کا پتہ: اُردو مجلس پبلشرز، مٹیا محل دہلی -

مول تمدن

نواب علی قریشی ام-اے کی تالیف ہے جو انھوں نے انٹرمیڈیٹ کے طلبہ کے لئے لکھا ہے، آجکل مدنیات (Civics) کا مطالعہ بہت ضروری ہے اسی لئے کوشش کیجا رہی طلبہ میں یہ ذوق ابتدا ہی سے پیدا کیا جائے - انگریزی میں تو خیر، متعدد کتابیں اس موضوع پر پائی جاتی ہیں لیکن یں بہت کم ہیں - اس لئے قریشی صاحب کا یہ کارنامہ قابل قدر ہے، لیکن چونکہ کتاب حکومت اور محکمۂ تعلیم کی پالیسی منے رکھ کر لکھی گئی ہے، اس لئے کہیں کہیں زیادہ آزادی رائے سے کام نہیں لیا گیا - حجم ۲۰۶ صفحات - قیمت ۶/- ا پتہ: ہری ہر پبلشنگ ہاؤس - کیلاش مندر - کانپور -

دسرا

جناب باری کی تالیف ہے جس میں بارہ ایسی ہستیوں کے حالات پیش کئے گئے ہیں، جنھوں نے مذہب، سماج اور حکومت کے مقابلہ میں آزادی کے لئے اپنے آپ کو قربان کر دیا، ان میں سقراط، ابن رشد، ڈارک، گلیلیو وغیرہ کے علاوہ ایسے نام بھی نظر آتے ہیں، جو شاید اس سلسلہ کے لئے زیادہ موزوں نہ تھے - بہرحال کتاب مفید و دلچسپ ہے اور اس موضوع پر سرسری معلومات حاصل کرنے کے لئے بُری نہیں - ست ۱۸۱ صفحات - قیمت ۱۲/ - ملنے کا پتہ: اُردو اکاڈمی لاہور -

ت و حکایت

جناب عبدالرحیم شبلی اڈیٹر خیام و عالمگیر کے ان علمی، ادبی و تاریخی شذرات کا مجموعہ ہے جو خیام میں اس وقت تک شایع ہو چکے ہیں - جناب شبلی وسیع المطالعہ انسان ہیں، اسلئے عہ میں جسے علمی کشکول کہنا زیادہ موزوں ہے، بہت سی مفید و دلچسپ باتیں نظر آتی ہیں - عام معلومات بڑھانے ایسی کتابوں کی اشاعت بہت مفید ہے، امید ہے کہ ملک اس کی قدر کرے گا اور جناب شبلی کی محنت کی داد - حجم ۴۰۴ صفحات - قیمت تین روپیہ - ملنے کا پتہ: عالمگیر بک ڈپو لاہور -

میرزا ادیب کے ۱۶ افسانوں اور تین ڈراموں کا مجموعہ ہے - میرزا ادیب مشہور افسانہ نگار ہیں اور انکے افسانے ملک میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں - ان کا انداز بیان بہت اچھوتا ہوتا ہے اور تجزیۂ جذبات نگاری ان کا خاص فن ہے - ان کے افسانے زیادہ تر معاشرتی رنگ کے ہوتے ہیں اور ان میں ہم کو وہی عامۃ الورود یں جو باوجود بہت معمولی ہونے کے انسان کی سیرت پر پایدار نقش چھوڑ جاتی ہیں - حجم ۲۲۸ صفحات - قیمت ۲/۸ : عالمگیر بک ڈپو - لاہور -

شت / یشہ

مجموعے میں پنجاب کے مشہور طنز نگار کنھیا لال کپور کے ۴۳ مقالات کے - مزاحیہ نگاری اور طنز نگاری بظاہر دونوں علیٰحدہ علیٰحدہ چیزیں ہیں، لیکن ایک دوسرے سے اس قدر دست و گریباں ایک کو دوسرے سے جدا کر دیجئے تو وہ باقی رہتی ہے نہ یہ - کپور صاحب کی تحریر میں ان دونوں رنگوں کا امتزاج تدل ہے اور یہی ان کی کامیابی کا راز ہے - اسی میں شک نہیں، کہیں کہیں وہ حد سے متجاوز ہو گئے ہیں - لیکن لو بُرا کہنے کا بھی اچھا سلیقہ حاصل ہے اس لئے ناگواری کی صورت پیدا ہونے نہیں دیتے - ان میں سے

ہر ایک مجموعہ کی قیمت دو روپیہ ہے۔ اور ملنے کا پتہ: مکتبۂ جدید لاہور۔

شمع فروزاں ترجمہ ہے پرل بک کے ناول کا جس میں چین کی موجودہ انقلابی فضا کو پیش کیا گیا ہے۔ پرل بک امریکہ کی مشہور خاتون ہیں، جن کو ادبی خدمات کے صلہ میں نوبل پرائز بھی مل چکا ہے۔

یہ ترجمہ صادق الخیری ایم۔ اے نے کیا ہے۔ جو خود بھی نہایت اچھے افسانہ نگار ہیں، اس سے قبل علاوہ طبعزاد افسانوں کے خیری صاحب کے متعدد تراجم شایع ہو چکے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ترجمہ کرنے کا انھیں خاص سلیقہ حاصل ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ ملنے کا پتہ خاتون کتاب گھر اردو بازار - دہلی۔

سرگزشت حاتم شاہ ظہور الدین حاتم، متقدمین شعراء اردو میں خاص مرتبہ رکھتے تھے، یہ مقالہ در اصل مقدمہ ہے، حاتم کے دیوان زادہ کا جو حیدرآباد میں زیر طبع ہے - ڈاکٹر زور نے اس مقدمہ میں حاتم کے حالات اور ان کے کلام پر تبصرہ کرنے میں بڑی دقت نظر سے کام لیا ہے۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر حیدرآباد

طوبیٰ چوتھا کلیات ہے، جناب شفیق جونپوری کی غزلوں اور نظموں کا۔ شفیق صاحب یوپی کے مشہور کہنہ مشق شعراء میں سے ہیں اور غزل خوب کہتے ہیں، ہر چند یہ اس دور کے شاعر ہیں، جب جدید رجحانات معدوم تھے لیکن سنہ ء سے ان کا رنگ شاعری بدلا اور حالات سے متاثر ہو کر انھوں نے نظموں کی طرف بھی توجہ کی - اور اپنی کہنہ مشقی کی بدولت بہت کامیاب ہوئے - اس مجموعہ میں ادبی، اخلاقی، تاریخی سبھی قسم کی نظمیں پائی جاتی ہیں اور کافی دلچسپ ہیں۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ دفتر نظام ادب جونپور۔

قیدخانہ پروفیسر احمد علی کے چار افسانوں کا مجموعہ ہے - ان میں پہلا افسانہ قیدخانہ ہے اور اسی لئے اس مجموعہ کا نام قیدخانہ رکھا گیا۔

پروفیسر احمد علی خاص رنگ کے لکھنے والے ہیں اور ان کی انشاء عام روش سے بالکل علحدہ ہے ان کی تحریر کی فلسفیانہ پیچیدگی گو ہر شخص کے سمجھ کی نہیں، لیکن اگر سمجھ میں آجائے تو بہت لطف دیتی ہے - ترقی پسند ادب کا وہ حصہ جسکا تعلق نظم سے ہے، بہت کچھ سامنے آچکا ہے، لیکن نثر میں اس کی ابتدا غالباً احمد علی صاحب ہی کی تصانیف سے ہوتی ہے۔ زبان اور جملوں کی ترتیب میں جا بجا بہت الجھن پیدا ہو گئی ہے اور اگر یہ بات قصداً پیدا نہیں کی گئی تو اس کو دور ہونا چاہئے قیمت درج نہیں ہے - ملنے کا پتہ: انشا پریس - دہلی -

یورپ جنگ سے پہلے پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی نے جنگ سے پہلے یورپ کا سفر کیا تھا جسکے حالات رسالہ سب رس حیدرآباد میں شایع ہوتے رہتے تھے - اب انھیں حالات وتاثرات کو کتابی صورت میں اس نام سے شایع کیا گیا ہے۔ سفرنامے یوں بھی بہت دلچسپ چیز ہوتے ہیں چہ جائیکہ وہ کسی پڑھے لکھے انسان کے ہوں کہ اس صورت میں تو دلچسپی کے ساتھ ان کی افادیت بھی بہت بڑھ جاتی ہے — شروانی صاحب چونکہ تاریخ کے پروفیسر ہیں، اس لئے انھوں نے یہ سفر بھی ایک مورخ ہی کی حیثیت سے کیا اور سفرنامہ بھی اسی نقطۂ نظر سے مرتب کیا۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے - ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر - حیدرآباد دکن،

حیدر آباد
رضیہ سلطانہ کی تالیف ہے، جس میں انھوں نے حیدر آباد کی مختصر تاریخ اور یہاں کی دوسری جغرافی تاریخی و آثاری خصوصیات کو پیش کیا ہے۔ کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔
قیمت ۱۰ار۔ ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر۔ حیدر آباد دکن

شوک اعظم
سیدہ مہدی جعفری کی تالیف ہے جس میں اشوک کے عہد حکومت سے بحث کی گئی ہے قدیم ہند میں اشوک کا عہد بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس زمانہ کے آثار کو اب بھی بڑی دلچسپی سے دیکھا جاتا ۔ فاضل مصنفہ نے ان تمام باتوں کو بچوں کے لئے اس رسالہ میں یکجا کر دیا ہے۔ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر حیدر آباد

علیم بالغاں
فنی تعلیم کی کتاب ہے جسے سید زاہد حسین صاحب (عثمانیہ ٹریننگ کالج) نے تعلیم کے چند اہم اور ضروری اصول کو پیش کیا۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر، حیدر آباد دکن۔

سوشلزم
حافظ سکندر بخت صاحب نے جو فاضل دیوبند ہیں، قرآنی نقطۂ نظر سے سوشلزم پر گفتگو کی ہے۔ اور ابتدا ہی میں ظاہر کر دیا ہے کہ لینن اور کارل مارکس کے اقوال سے انھیں بحث نہیں۔ موجودہ ور اشتراکیت میں اکثر مسلمان اس بات کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں کہ وہ سوشلزم کو تعلیمات قرآنی سے منطبق کر دیں یال برا نہیں، لیکن بے نتیجہ ضرور ہے، کیونکہ جو سوشلزم موجودہ زمانہ میں مفید سمجھی جاسکتی ہے، اس کی تفصیلات قطعاً رآن میں نہیں مل سکتیں اور نہ اسلام ان کا ساتھ دیسکتا ہے۔

یہ درست ہے کہ اسلام ملوکیت کا مخالف ہے، لیکن شاید سرمایہ داری کا نہیں، اس لئے سوشلزم کی بحث میں جسکی یاد ہی سرمایہ داری کا اختتام ہے، اور اسلام کو زحمت دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ تاہم اس سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے ، ہمارے علماء کو بھی اب ایسے مسایل سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اور ہو سکتا ہے کہ کسی دن وہ قرآنی سوشلزم کے جائے مارکسی سوشلزم کے جواز کا بھی فتویٰ دیدیں۔

قیمت درج نہیں ہے۔ مصنف سے محلہ جدید نام چلی مکان نمبر ۵۸۶ لے کلاس حیدر آباد دکن کے پتہ پر خط و کتابت کیجئے

ن داستان گوئی
پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب نے رسالۂ معاصر میں ایک سلسلۂ مضامین اس عنوان سے شروع کیا تھا جو بہت پسند کیا گیا۔ اب انھیں اوراق کو کتابی شکل میں شایع کیا گیا ہے۔
اس میں بتایا گیا ہے کہ داستان کیا ہے اس کی ابتدا کب اور کیونکر ہوئی اور اسی سلسلہ میں طلسم ہوشربا، ستان خیال، آرایش محفل، فسانۂ عجائب اور منظوم داستانوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ہماری زبان کے انتقادی لٹریچر میں یہ کتاب قابل قدر اضافہ ہے۔ قیمت دو روپیہ چار آنے۔ ملنے کا پتہ: دائرۂ ادب۔ بانکی پور۔

تصویر
ناول ہے، اے، آر، خاتون دہلوی کا۔ جن کا ایک ناول "شمع" اس سے پہلے شایع ہو کر کافی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اس وقت مختصر افسانے لکھنے والی خاتونیں تو بہت ہیں، لیکن ناول نویسی م اور ان کم میں بھی اے، آر خاتون کو خاص امتیاز حاصل ہے۔
ضخامت ۳۲۰ صفحات، قیمت چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ: انشا پریس ۱۹۱۹۔ کوچہ پنڈت دہلی

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

جذبات بھاشا

نیاز نے ایک دلچسپ تمہید
سانہ بہترین ہندی شاعری کے
نے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح
ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے
و میں یہی سب سے پہلی کتاب
موضوع پر لکھی گئی ہے اور
دی کلام کے بہترین نمونے نظر
تے ہیں۔

قیمت بارہ آنے
علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے
تین علمی مضامین شامل ہیں:
۱ــــ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم
کی روحوں کے ساتھ۔
۲ــــ مادئیین کا مذہب
۳ــــ حرکت کے کرشمے
نہایت مفید و دلچسپ
کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ
علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا
لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام
نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ
میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ
اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر
بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر
نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت
صحیح و خوش خط سرورق رنگین۔

قیمت بارہ آنے
علاوہ محصول

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ
سے ایک شخص با آسانی ہاتھ کی
شناخت اور اس کی لکیروں کو
دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے
مستقبل سیرت عروج و زوال
موت و حیات، صحت و بیماری
شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح
پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ
علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات
عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ
- ایک بار اس کو شروع کردینا
گویا ختم کرلینا ہے۔ یہ بھی
یا اڈیشن ہے جس میں صحت
نفاست کاغذ و طباعت
خاص اہتمام کیا گیا
ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ
علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ
جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے
ہادیانِ طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی
کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت
و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ قاتل ہے
زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو
مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف
دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے
علاوہ محصول

انتقادیات دو حصے (زیر طبع)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی
مقالات جو دو حصوں میں تقسیم کئے گئے
ہیں۔ پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں
خاص خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہو
مثلاً مومن، ظفر، غالب، مصحفی، نظیر،
سیماب، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ۔
دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی
مباحث ہیں جنکا تعلق شعر و ادب کی تاریخ
سے ہے ہر ایک حصہ پانچ پانچ سو صفحات سے
کم نہ ہوگا اور ہر حصہ کی قیمت پانچ روپیہ ہوگی

مذہبیات (زیر طبع)

حضرت نیاز کے تمام وہ بہترین مقالات
جن میں انھوں نے مذہبی تعلقات مذہب پہ
اپنے خاص رنگ میں بحث کی ہے حضرت نیاز کے
یہ مضامین اس قدر دلچسپ اتنے مسکت
و مدلل ہیں کہ ان کا جواب پیش نہیں کیا
جاسکتا۔ اس مجموعہ میں تمام وہ مضامین
ہونگے جنھوں نے دنیائے مذہب میں ہلچل
ڈالدی تھی اور جنکے مطالعہ کو لوگوں نے ضروری
ہیں۔ یہ بھی دو حصوں میں شایع ہونگے ا
حصہ کا حجم ... صفحات اور قیمت پانچ روپیہ ہوگی

نگار کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۴۳ء	جنوری سنہ ۴۲ء	جنوری سنہ ۴۱ء	جنوری سنہ ۴۰ء	...۳۹ء
اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول	اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری سنہ ۴۱ء میں شایع ہوا تھا۔ قیمت دو روپے علاوہ محصول	یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزلگو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے۔ قیمت تین روپے علاوہ محصول	(نظیر نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں: نظیر کا مسلک — شاعری پر تبصرہ۔ نظیر اور عوام۔ انتخاب۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ قیمت دو روپے علاوہ محصول	... عنوانات ... غزلگوئی ... مثنویاں ... غیر مطبوعہ ... روپے علاوہ محصول

نگار کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر چھ روپیہ ششماہی ...

" بیرون ہند آٹھ روپیہ - " ...

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ تک ...

۲۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ...

...رخنامہ اُجرت اشتہار

	ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
صفحہ	۶۰۰ روپیہ	۳۰۰ روپیہ	۱۶۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
[illegible]	[illegible]	۱۸۰ روپیہ	۹۰ روپیہ	۳۰ روپیہ
[illegible]	[illegible]	۹۰ روپیہ	۴۵ روپیہ	۱۵ روپیہ

نگار کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۴۳ء	جنوری سنہ ۴۲ء	جنوری سنہ ۴۱ء	جنوری سنہ ۴۰ء	[...]سنہ ۴[...]ء
اس نمبر میں ریاضؔ خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاضؔ کی شاعری کیا تھی۔	اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری سنہ ۴۱ء میں شایع ہوا تھا۔	یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزلگو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے۔	(نظیر نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں: نظیرؔ کا مسلک — شاعری پر تبصرہ۔ نظیرؔ اور عوام۔ انتخاب۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ	[...]نمبر [...]عنوانات [...]دو غزلگوئی [...]رتبہ۔ [...]مثنویاں [...]و غیر مطبوعہ
قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول	قیمت دو روپے علاوہ محصول	قیمت تین روپے علاوہ محصول	قیمت دو روپے علاوہ محصول	[...]روپے علاوہ محصول

”نگار“ کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر پانچ روپیہ ششماہی ہندوستان [...]

" بیرون ہند آٹھ روپیہ " بیر[...]

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ تک [...] ۲۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا [...] ۸ رفی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی۔

حصول جواب کے لئے ٹکٹ [...]

خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری [...]

تو تعمیل دشوار ہے

[...]رخنامہ اُجرت اشتہار

	ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
[...]صفحہ	۴۰۰ روپیہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
[...]صفحہ	۲۴۰ روپیہ	۱۸۰ روپیہ	۹۰ روپیہ	۳۰ روپیہ
[...]ائی صفحہ	۱۲۰ روپیہ	۹۰ روپیہ	۴۵ روپیہ	۱۵ روپیہ

[...]اُجرت بہرحال پیشگی لی جائے گی۔ وی پی کے ذریعہ سے وصول منظور نہیں۔

[...]جتنی مدت کے لئے اشتہار دیا جاتا طے ہوا ہے اسکی رقم پیشگی یکمشت لی جائیگی

[...]اداؤں کی صورت میں نرخ وہی ماہانہ رہے گا۔

[...]اشتہار فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کمیشن ذریعہ خط و کتابت [...] سکتا[...]

ہے۔

مینجر